

PDFBOOKSFREE.PK

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَاِحْمدُ عِبَادُ اللَّهِ

بیل

پیدل

خواجہ عیسا دالہ اختر

ادارہ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور؛
محفوظ ہیں۔ اقتباسات، اختصارات وغیرہ
کے لئے ناشرین سے اجازت ضروری ہے

طبع اول - ۱۹۵۲
طبع دوم - ۱۹۶۱
تعداد ایک ہزار

محمد اشرف ڈار (سیکرٹری) نے دین محمدی پریس
سرکلر روڈ۔ لاہور سے چھپوا کر ادارہ ثقافت
اسلامیہ لاہور کے لئے شائع کیا ۛ ۛ

فہرست مضامین

۱۔ عرض حال	۵۰-۱
۲۔ چہار عنصر	۸۵-۶
شاہ کابلی	۷۹-۵۴
تصویر	۸۱-۷۹
مرقد	۸۵-۸۲
۳۔ تذکرہ	۱۰۷-۸۶
۴۔ نکات	۱۳۰-۱۰۸
۵۔ محیط اعظم	۱۶۰-۱۳۱
۶۔ عرفان	۱۹۰-۱۶۱
۷۔ طلسم حیرت	۱۹۸-۱۹۱
۸۔ طور معرفت	۲۱۵-۱۹۹
۹۔ رباعیات	۲۳۳-۲۱۶
۱۰۔ دیوان بیدل	۲۵۶-۲۳۴
امروز و فردا	۲۵۰-۲۴۸
تجدد امثال	۲۷۹-۲۵۰
انتباء	۲۸۹-۲۷۹
سیر دل	۲۹۸-۲۸۹

۳۲۷-۲۹۸

نودی

۳۲۹-۳۲۷

ریش

۳۳۱-۳۲۹

سبحہ و زنار

۳۳۲-۳۳۱

رسم و عادت

۳۵۶-۳۳۵

اخلاقیات

۳۶۵-۳۵۷

قطعات

۳۹۶-۳۶۶

مقام بیدل



بیدل

عالی صاحب دل است اما کسے بیدل نشد

از کتاب بیدلے گر نقطہ آید بدست
نسخہ آتش تو اں زد تخته ہا باید شکست

صد چمن باید بطوفان تغافل دادنت
تا بخون دل توانی ایں قدر ہارنگ بست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ جال

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل کا کلام میرے زیر مطالعہ گذشتہ زائداڑ چالیس سال رہا ہے۔ اگرچہ اس کے افکار کی بندی تک میری رسائی نہیں۔ لیکن جو کچھ اور جہاں تک میرے فہم میں آیا پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ بلند پایہ شخصیت ہے جسے مرزا اسد اللہ خاں غالب ایسے ”بھوبیکراں“ اور ”محیط بے ساحل“ اور ہمارے علامہ اقبال مرحوم ”مرشدِ کامل“ کہتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے بھی داؤد سخن دی ہے۔ اس کا نظیر متقدمین میں چند ہستیاں ہیں۔ متاخرین میں اس کا مثل ہمیشہ کل پیدا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ساتھ فنونِ لطیفہ بلند درجہ سے گرتے جاتے ہیں۔ یونان نے ”ہومر“ اور عرب نے ایامِ جاہلیت کے شعرا پھر پیدا نہیں کئے۔ تمدن کا ارتقاء پیٹ کے دھندوں سے فرصت لینے نہیں دیتا۔ فنونِ لطیفہ سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کی طرف توجہ تو ان حضرات کی ہوتی ہے جو گوشہٴ قناعت میں بیٹھ کر فقر و فاقہ قبول کرتے ہیں۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ علامہ اقبال کی ایک صحبت میں سنا کہ فرمایا ”بیدل اپنی طرز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی“ جو جہت اور ایجاد اس کے کلام میں ہے وہ اس کے ہم عصر شعرا میں نہیں۔ ان کے سامنے متقدمین کا کلام بھی ایک نمونہ تھا اور اسی کا اتباع

بیدل

ان کا نصب العین تھا۔ اس لئے بیدل کو ”خارج آہنگ“ کہتے۔ میر غلام علی آزاد لکھتا ہے کہ یہ ان حضرات کا صریح ظلم ہے۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے متقدمین کی چیرانی لکیر جو متاخرین عرصہ سے پیٹتے چلے آ رہے تھے تھوڑے کر ایک نئی روش اختیار کی۔ جس سے ہم عصر شعرا ناواقف تھے۔ اسے نئی نئی ترکیبیں بھی اختراع کرنا پڑیں۔ جس نے زبان میں اور وسعت پیدا کی۔ اس کے سوا چار اناہ تھا خیالات کے اظہار کا آلہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جب اس کا دامن تنگ ہو تو وسعت خیال کے لئے اسے پھیلا نا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ بیدل مشکل پسند سمجھا گیا۔ لیکن یہ تصور فہم کا ہے۔ اس لیے جب تک طبائع اس کے کلام سے مانوس نہ ہوں بیدل کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔

ایک دفعہ لاہور کے کالجوں کے طلباء نے ”یوم غالب“ منایا۔ علامہ اقبال زندہ تھے۔ ایک وفد باریاب ہوا اور شمولیت کی دعوت دی۔ فرمایا کہ مناسب تھا کہ تم یوم بیدل مناتے۔ اچھا اب سوال کو زیر بحث لاؤ کہ کیا وجہ ہے کہ غالب کا کلام غلام آباد ہندوستان میں مقبول ہے اور بیدل کو کوئی جانتا بھی نہیں لیکن بیدل کا کلام آزاد ممالک افغانستان میں تلاوت ہو رہا ہے اور غالب کو وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ پھر فرمایا کہ غالب کا تصوف افسردگی پیدا کرتا ہے اور بیدل کا تصوف حیات بخش تروتازگی کے ساتھ ابھارتا ہے۔

بیدل کے تعارف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال اس کے مداح ہیں۔ کلیات بیدل میں مطبوعہ کلام ہی ملتا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کا حوالہ تذکروں میں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے پاس کسی جزو کا مکمل نسخہ بھی ہو۔ بیدل کے مزار واقع دہلی میں سالانہ عرس کی تقریب پر شعرا جمع ہوتے ہیں یہاں مکمل نسخہ موجود تھا۔ اکثر شعراء نے نقل اسی سے بہم پہنچائی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتا ہے کہ بیدل نے ایک لاکھ سے زائد اشعار لکھے۔ مجھے کلیات وہ بھی کئی ہاتھوں سے گزرتی ہوئی ملی تھی اس وقت میں مدرسہ کا ایک طالب علم تھا۔ گذشتہ فسادات پنجاب میں میرے کتب خانہ

کے ساتھ یہ بھی نہ رہی۔ کابل میں امیر حبیب اللہ کی توجہ سے بیدل کا دیوان شائع ہوا۔ یہ بھی ردیف دال پر ختم ہو گیا۔ امیر شہید ہو گیا اور یہ بھی ناتمام رہا۔ خوش قسمتی سے کلیات ایک کرم فرمانے دور وز کے لیے عاریتاً دی۔ ان دونوں میں میں نے کچھ اشعار نقل کیے۔ اور حسب وعدہ کلیات واپس کر دی۔ جسے مرے عنایت فرما بجا اپنا ”سرمایہ حیات“ سمجھتے ہیں۔ چار سال سے ”ریسرچ“ میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کی سعی مشکور فرمائے۔ اور میں تو شکر گزار ہوں۔ اگر وہ صرف دور وز کے لیے بھی کلیات نہ دیتے تو بہت باتیں رہ جاتیں۔

میں تو پہلے ہی قصور فہم کا اعتراف کر چکا ہوں۔ میں تو میں علامہ اقبال سی بلند پایہ شخصیت بھی یہ اعتراف فرخ دلی سے کرتی رہی کہ میں بیدل کی سطح کی بلندی تک نہ پہنچ سکا۔ اس لئے ان اوراق میں اگر کہیں غلطی نظر آئے اور ضرور ہے کہ غلطی ہو تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ غرض تو اتنی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔

بیدل محض باتونی نہیں۔ وہ نفس و آفاق کا مشاہدہ غائر نظر سے کرتا ہے۔ اس کلام میں صرف شاعرانہ تخیل حسین الفاظ کے زیور سے آراستہ نہیں حکیمانہ تفکر بلند پایہ بھی ہے۔ یہ صرف دعوے نہیں، دلیل اس کا کلام ہے۔ اگرچہ اس کے کلام کا موضوع وہ سب کچھ ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں مشاہدہ ہوتا ہے مگر ہم نے ایک خاص موضوع کو نمایاں کیا ہے اور یہ فلسفہ خودی اور بخودی ہے۔ اسے ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال نے واضح کیا۔ علامہ مرحوم ایک ایسے زمانہ میں تھے جبکہ مسلمان من حیث القوم سرعت سے پستی کی طرف گزر رہے تھے، اور ان کی غلامانہ ذہنیت جس پر مغربی امپیریلزم پورے طور پر مسلط تھی اتنی پست ہو چکی تھی کہ ابھرنے کی توقع جاتی رہی تھی۔ سرسید غفرلہ سے لے کر علامہ مرحوم تک قائدین ملت ان کو بھنجوڑ رہے تھے۔ اور یہ لٹس سے مس تک نہ ہوتے۔ علامہ نے فلسفہ خودی کو سیاسیات پر اطلاق کرتے ہوئے پیش کیا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ بیدل ہستی کی گتھی بلیکھانا چاہتا ہے۔

وہ سیاسیات و معاشیات میں اس لئے بھی نہ اُبھا کہ وہ عہد مسلمانان ہندوستان کے انتہائی عروج کا تھا۔ وہ ان سے الگ ہو کر خود شناس بننا چاہتا تھا، اس نے راز ہستی ممکن حد تک معلوم کر لیا اور جس خوش اسلوبی سے وہ بیان کر رہا ہے بلا مبالغہ اسی کا حصہ ہے۔

بیدل کا کلام نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ نظم کو وہ کلی اور نثر کو پھول سے تشبیہ دیتا

ہے

آنجا کہ تمیز محرم جزو کل است بیشتی و کمی لازم انگور و مل است
در گلشن اعتبار قدرت بنجاں آرائش نظم غنچہ و نثر گل است
یہ تشبیہ اس کی نظم و نثر پر بالکل منطبق ہوتی ہے۔ اس رباعی کا مفہوم تو یہ ہے کہ غنچہ میں حسن و خوبی کی رنگینی جمع ہوتی ہے۔ اور جامع الفاظ نظم میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ رنگ و بو سب کچھ اس میں ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی جب یہ غنچہ کھلتا ہے تو گل بن جاتا ہے۔ اس کی پنکھڑیاں اگرچہ پیوستہ ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی طرح نظم کی شرح نثر ہے۔ بیدل کے کلام نظم و نثر میں رنگینی ایک جیسی پائی جاتی ہے۔ ہم نے ان اوراق میں اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ یہ مشکل موضوع ہے۔ چند اشعار کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق زیر بحث سے ہے۔ اگر بیدل کی شاعری پر لکھتے، تو متقدمین اور معاصرین کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا۔ خود بیدل اسے مذموم قرار دیتا ہے۔ ہم نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ذکر ضرورتاً اس لئے کیا ہے کہ ایک اہل الرائے نے غالب کے کلام کو سراہتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ بیدل نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا تھا جس کی اصلاح غالب نے کی۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس دعوئے کا جائزہ لینا پڑا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب سے فارسی کلام کی قدر و منزلت کم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی سخن گسترانہ بات اس ضمن میں آگئی ہے تو اس کو ان معنوں میں محمول نہ کیا جائے۔

چہار عنصر

۵

کلیات میں مثنوی عرفان، طلسم حیرت، طور معرفت، دیوان، رباعیات، قصائد، قطعات نظم میں، میں۔ نشر میں چہار عنصر (نکات کی تشریح نظم میں) اور رقعات میں۔ تسلسل قائم رکھنے کے لئے جو ہمارے پیش نظر موضوع ہے ہم نے اگرچہ علاحدہ علاحدہ ہر ایک جزو کلیات کو ان اوراق میں جگہ دی ہے۔ مگر جیسا کہ خود بیتل نے نشر کو غزل و رباعی و قطعہ سے مرزین کیا ہے ہم نے بھی اس کا اتباع کیا ہے۔ بیتل نے ایک یا دو رسالے اور بھی لکھے ایک کا نام وہ کلیات کے دیباچہ میں بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔

آخر میں یہ انتباہ بھی۔ بے محل نہ ہوگا جسے مولانا روم ان لفظوں میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل

ہست محسوس حواس اہل دل

ایک عالم حکیم کے احساسات کا فہم عوام کو نہیں ہوتا۔ اور بعض "ذہن" کی ساخت ہی عام اذہان سے کچھ علاحدہ ہوتی ہے جو کچھ وہ مشاہدہ کرتے ہیں وہ ماو شما نہیں کرتے۔ بیتل نے چہار عنصر میں بعض واقعات قلم بند کئے ہیں، جس کا وہ خود شاہد ہے۔ ان کی توجیہ کسی علم کی شاخ سے ہم نہ کر سکیں تو نقص ہمارے علم میں ہے۔ واقعات واقعات ہی ہیں ان کا انکار تو نہیں ہو سکتا۔ عدم علم، علم عدم نہیں ہے۔ اور یہ ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان کی بھی توجیہ عقلاً ہو سکے گی۔

فیض معنی درخور تعلیم ہر بے مغز نیست

نشہ را چوں بادہ نتوان در دل پیمانہ ریخت

ہم نے ان اوراق میں علامہ اقبال کی ایک نظم درج کی ہے جو بیتل کے ایک شعر پر تفسیر ہے۔ وہ کافی انتباہ ہے۔

چہار عنصر

بیدل کا کلام اس کے سوانح حیات ہی ہیں۔ اس کے مشاہدات و احساسات و افکار کا مجموعہ ہے۔ چہار عنصر میں اس نے وہ واقعات، شخصیات عرف عام میں سوانح زندگی کہتے ہیں خود قلم بند کئے ہیں۔ تذکروں میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ نے بیدل کے حالات لکھے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اصل چغتائی برلاس ہے۔ ۱۰۵۴ ہجری میں بلدہ عظیم آباد پٹنہ میں ولادت واقع ہوئی۔ تاریخ ولادت بیدل خود لکھتا ہے ۷

بسائے کہ بیدل ملک ظہور ز فیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبردار از مولدش کہ ہم فیض قدس است و ہم انتخاب
بیدل کی پیدائش شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی۔ مغلیہ شہنشاہیت انتہائی عروج پر اور نگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں تھی۔ اس دور سے گزر کر جانشین شاہان مغلیہ کا عہد بھی محمد شاہ رنگیلے تک پایا۔ یعنی یہ ایام بھی دیکھے، جب مغلیہ سلطنت پستی کی طرف جا رہی تھی۔ یہ چراغ سحری ٹٹمار ہا تھا اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر پر گل ہو گیا۔

بیدل مؤرخ نہیں۔ اگر وہ اپنے زمانہ کی تاریخ قلم بند کرتا، تو نہایت معتبر

ہوتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کا صحیح مشاہدہ ہے۔ اس کے رقعات اور چہار عنصر اور بعض رباعیات میں ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس کے اپنے زمانہ میں رونما ہوئے۔

”چہار عنصر“ بیدل نے اکتالیس برس کی عمر میں لکھی۔ یہ کتاب نشر میں ہے۔ اس میں چند اللہ والوں کا تذکرہ ہے جن کی صحبت اکسیر اثر نے مرزا کو کیمیا بنا دیا۔ وہ انہی کی مدح میں رطب اللسان ہے۔ اور ان شعراء کی در یوزہ گری کی مذمت کرتا ہے کہ فطرت نے ان کو ذہن روشن عطا کیا، لیکن امراء و وزراء کی مدح سرائی میں صرف کیا ہے

ای بسا معنی روشن کہ ز حرص شعرا . خاک جولا نگاہ اسپ و خراب جاہ است
وی بسا نسخہ کہ در مکتب تشویش طبع . رویاہ ابدانہ مدح و وزیر شاہ است
صلہ مشتاق گدا طبع ز مضمون بلند . گرہمہ پائے برا فلاک تہذ ویر جاہ است
مرجع معنی این سست خیالان دریاہ . تا بدانی چہ قدر فطرت شاہ کوتاہ است
ماوح اہل صفا باش کہ در علم یقین
وصف این طایفہ تفسیر کلام اللہ است

وہ ان گدا طبع در یوزہ گر شعرا کو شیطان پرست اور ان کی شاعری کو محض شیطنت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے ممدوح شاہ دوزرا و امرا کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے :-

ایک تعریف سلاطین کردہ
مشق تعلیم شیاطین کردہ
چیت تعلیم شیاطین حب جاہ
ای شیاطین مرشدت رویت سیاہ
فخر طبع مدح شامی بیش نیست
کا نہمہ تحت و کلاہی بیش نیست
تو بادشاہوں کی مدح گوئی کرتا ہے تو
سمجھ لے کہ شیطان تیرا معلم ہے جو کچھ
تجھے سکھاتا ہے وہی کچھ تو کہتا ہے،
یہ شیطانی علم کیا ہے؟ حب جاہ ہے
تیرا استاد اور پیشوا شیطان ہے،
ابدی رویا ہی کے سوا تجھے اور کیا

بیدل

امتیاز تابانی شاہ کیست
 این نفس پروردہ وہم جاہ کیست
 بر سرش افتادہ آن زردیں رخام
 آمدہ پایش بسنگے تخت نام
 تخت سیم و افسر زردیں دوسنگ
 او چو آتش دریاں این دوسنگ
 فی الحقیقت آتش است این شاہ نیست
 بیک بر آتش پرست آگاہ نیست
 قرب این آتش بنائی جان تست
 برق دین و خسر من ایمان تست
 گر بہ بزم شاہ قرب اندیشہ
 بیگماں زردشت کافر پیشہ
 رفتہ گیر آئینہ زینت ز دست
 نیست ہرگز حق پرست آتش پرست

* * *

لیگا تو اتنی بات پر فخر کرتا ہے کہ بادشاہ کا
 درباری شاعریوں یہ تو سمجھ کہ بادشاہ
 خود کیا بلا ہے۔ ایک تخت و تاج ہی تو
 ہے، اور دونوں پتھر۔ ایک سر پر پڑا
 دوسرا پاؤں کے نیچے تخت بن گیا چامری
 کا تخت اور سونے کا تاج جمادات ہی تو
 ہیں۔ ان دو پتھروں کی رگڑ سے آگ
 پیدا ہوتی ہے، اس کا نام ہے بادشاہ
 لیکن ہر ایک انہی کا پو جا رہی اس حقیقت
 سے آگاہ نہیں، یہ آگ تیرے دین پر
 بجلی بن کر گر رہی ہے اور تیرے خرمین ایمان
 کو جلا کر رکھ کر رہی ہے، اگر تو بادشاہ کا
 مقرب ہے تو بلاشبہ تو آتش پرست کافر
 ہے، تیرا دین ایمان گیا، آتش پرست کبھی
 حق پرست نہیں ہو سکتا۔

کافر دین اور ایمان تو سنئے آئے تھے لیکن بیدل نے فتوے کفر شعری شاعری
 ان شعرا کے حق میں بھی صادر کیا جو سلاطین اور وزراء کی شان میں مدحیہ
 قصائد لکھتے رہے۔ ان اشار کا مفہوم یہ ہے کہ شعرا حرص کی وجہ سے اپنے معنی
 روشن کو اُمر کے گھوڑوں کے پاؤں کی خاک میں ملا تے ہیں۔ اکثر شعراء نے
 بادشاہوں کے گھوڑوں کی تعریف میں قصائد لکھے۔ انسان اشرف المخلوقات اگر
 اس پر و خیر کی مدح کرے تو ان سے بھی کیا گزرا۔ اور وہ بھی خرد ماغ ہی تھے جو
 اپنے گھوڑے کی تعریف سن کر انعام و اکرام سے شعرا کو مالا مال کر دیتے ماسی
 ضمن میں لکھتا ہے کہ حمد و ثنا تو خاص حق تعالیٰ کے لیے ہے۔ مگر ذات باری

کا کمال ہماری حمد و ثنا سے بے نیاز ہے۔ البتہ ”اگر با نخن مدح خاصا نش بار توفیق توانی یافت، حصول دولت عظمیٰ پندار، و اگر بحفل و صف مقربا نش را ہی توانی شگفت و حصول مقصد رقصی شمار، اگر خاصاں و مقرباں بارگاہ آہی کی مدح کی توفیق حاصل ہو تو یہ سمجھ کہ تجھے سعادت دارین ملی۔ اور وہ اعلیٰ مقصد تجھے حاصل ہو گیا جو دنیا داروں کو نصیب نہیں۔

بیدل ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ ”ناصر برائے دیگران“ ہوتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی امیر و زیر کی مدح میں کچھ نہیں لکھا۔ اوائل عمر میں شہزادہ محمد اعظم پسر عالمگیر کی ملازمت اختیار کی۔ شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے بیدل کی تعریف میں کہہ دیا کہ بلند فکر کا مالک ہے۔ شہزادہ نے کہا کہ اسے کہو کہ میری مدح میں قصیدہ کہے۔ تاکہ اس کی شاعری کی مدح بھی معلوم ہو جائے۔ بیدل نے سنا تو بخشی سرکار کو استعفا حوالہ کیا۔ بیدل کی تصانیف میں ”رغعات“ بھی ہیں۔ یہ سب اس کے عقیدت مند دوست تھے۔ جن سے خط و کتابت تھی۔ ان کی تعریف میں نثر و نظم میں چند فقرات لکھ دیتا ہے۔ ان میں سے شکر اللہ خان اور شاکر خان دو بھائی شاہ عالمگیر کی فوج میں افسر تھے۔ شکر اللہ خان ولایات دہلی وغیرہ کا صوبہ دار بھی رہا۔ عموماً اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کرتا۔ اس خاندان سے بیدل کے تعلقات مدت العمر رہے۔ مغلیہ دور دورہ میں عموماً وزراء و امرا سخن گو تھے۔ اور اہل سخن کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ شکر اللہ کے منصب میں جب کبھی اضافہ ہوتا، بیدل رقعہ میں مبارک باد کے ساتھ قطعہ تاریخ بھی لکھ دیتا۔ چنانچہ ایک رقعہ میں کہتا ہے کہ ہ

شکر خدا کہ صاحب ماراز فضل حق جمعیت اضافہ اقبال سرمدیست
تا شکر این عطیہ بروں آید از حساب تاریخ او مراتب تائید ایزدیست
میوانی سخت شوره پشت قوم تھی۔ گلے گلے شاہی فوج ان کی سرکوبی کرتی رہتی۔ مگر یہ پہاڑوں میں بیٹھ کر حکومت کو اکثر پریشان کرتے۔ ان کا

بیدل

سردار بجے رام“ تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ ایک دفعہ تو وہ ہڑبونگ پچائی کہ رعایا ان کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آگئی۔ بادشاہ نے شکر اللہ خاں کو مامور کیا۔ اس نے تھوڑے عرصہ میں امن قائم کر دیا۔ میوات کی صوبہ داری اسی صلہ میں عالمگیر نے شکر اللہ خاں کو تفویض کی۔ اس فتح کی مبارک باد اور تاریخ فتح بھی بیدل نے ایک رقعہ میں لکھ کر ارسال کی ہے

سرخیل نرو کہ با بجے رام	از باد و بروت پشم در دست
باہفت پسر کہ ہر کدا مش	چوں کوہ سرے بہ تیغ می بست
عمرے در کو ہسار میوات	می بود چون خرس از خودی مست
با شکر خان آسمان جاہ	گردید طرف ز فطرت پست
یعنی بہ پناہ قلعہ کوہ	بر جنگ مبار زان کمر بست
آتش زندہ بہادران خورد	چند انکہ ز سنگ چوں شریبست
بگریخت بصد ہزار تشولیش	تا از دم تیغ بی اماں رست
در تاریخش مہندس فکر	فرمود دل نرو کہ بشکست

۱۱۰۷ھ

۱۱۰۶ھ میں بھی کسی مہم پر شکر اللہ خاں کا میاب رہا۔ بارہ فقروں کا ایک رقعہ لکھا۔ ہر ایک فقرہ تاریخ فتوحات ہے۔ ۱۱۱۴ھ میں جب شکر اللہ خاں کو منصب صوبہ داری میوات تفویض ہوا تو نو فقروں کا ایک رقعہ لکھا ہر ایک فقرہ تاریخ مبارک باد ہے۔ آخری فقرہ ”خان صاحب مبارک باد ہے۔“

شاہ عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں بیجا پور اور دوسرے سال گول کنڈہ فتح کیا، بیدل نے ایک رقعہ میں نواب شکر اللہ خاں کو قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا۔ اور یہ فقرہ بھی لکھ کر دیا کہ ”اللہ الحمد اندیشہ دعا گو بہانہ جوئی تقریبی است کہ بآں وسیلہ تحفہ فقرا پیش گزار دیا مصرعی در آنجناب معروض دارد و گرنہ چہ نواب و کدام مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کدام بدر منیر بطریق شوق بے پروا لگا ستنی دارد، و آہنگ ساز

بے نیازی سراز پر دہ برمی آرد، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کو شاہ عالمگیر سے کچھ عقیدت ضرور تھی۔ اس لئے شوقیہ قطعہ تاریخ کہہ دیا اور ساتھ ہی اپنے استغنا کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ قطعہ کسی صبلہ کی اُمید پر نہیں لکھا گیا۔ قطعہ حسب ذیل ہے:-

شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب
عزمش از اقلیم دہلی کرد آہنگ خروج
اولیں سالے کہ فتح ملک بیجا پور بود
ساخت برگلکنڈہ رایات ظفر سال دوم
گشت از روئی جمل در دیدہ اہل حساب

آنکہ دار و تکیہ بر شمشیر اوفتخ و ظفر
تا کند بنیاد شاہاں دکن زیر و زبر
درغل و زنجیر رفت اسکندر از طوق و کمر
ہچناں در قلب قطب الملک طوفاں دادر
سال فتح اولیں "جمشید نصرت" جلوہ گر

۱۰۹۷ھ

خواستم روشن شود آئینہ فتح دوم
ہست یک معنی کہ تعبیر از دو تار بخش کند

دار شوخیہائی اور اکم دریں مصرع خبر
اعظم مطلوب "فتح" بادشاہ نامور

۱۰۹۸ھ

۱۰۹۸ھ

چھ سال چھ ماہ کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ دُرِ یتیم والدہ کی آغوش تربیت میں تعلیم پاتا رہا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد صرف نحو عربی پڑھی۔ چچا مرزا قلندر کفیل رہا۔ بیدل طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ جب "احاد" یعنی نو سال سے گزرا تو "عشر" یعنی دہائی میں داخل ہوا۔ ایک ہم درس ہمیشہ منہ میں قرنفل (لونگ) رکھتا، جب بولتا تو اس کے منہ کی خوشبو سے مخاطب کا دماغ معطر ہو جاتا۔ میں نے ایک رباعی کہی ہے

یادم ہر گاہ در سخن می آید بوئے عجبش از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا نگہب گل یار اخیہ مشکب ختن می آید

یہ رباعی مشہور ہوئی تو بعض تو حیران ہوئے کہ اس نو عمری میں یہ کلام اور اکثر نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک طفل مکتب ایسی برجستہ رباعی کہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ جو کچھ کہوں گا کسی کو نہ سناؤں گا۔ مشق تو

بیدل

جاری رہی مگر کسی کو علم نہ تھا۔

بیدل کے خاندانی شیخ طریقت مولانا شیخ کمال قادری قصبہ رانی ساگر میں جو ملک ”بہار“ میں واقع ہے اقامت پذیر تھے۔ بنارس سے ایک فرسخ کا فاصلہ ہے۔ بیدل کا چچا مرزا قلندر بھی حلقہ ارادت میں داخل تھا۔ بیدل کو بھی اپنے ساتھ زیارت شیخ کیلئے لایا۔ بیدل چہار عنصر میں مولانا کے زہد و تقویٰ اور تشرع کی بہت تعریف کرتا ہے۔ کہ آپ کا شہرہ باہر اور گرد و نواح میں اس حد تک تھا کہ لوگ بصد عقیدت و ارادت حاضر ہوتے۔ اور آپ کا یہ اثر تھا کہ جو بھی ایک دفعہ آپ کے پاس آتا کم از کم منہیات شرعیہ سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو جاتا۔ اور بعض ایسے بد قسمت ازلی بھی تھے کہ آپ کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔ کہ مبادا آپ کی صحبت کے اثر سے اور جذبہ توجہ سے فسق و فجور سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مولانا لوگوں کو وظائف بتاتے۔ اور جو کچھ مرزا قلندر کو تلقین فرماتے بیدل خاموشی سے اخذ کرتا رہتا۔ اور تنہائی میں لکھ لیا کرتا۔ مولانا کے پاس اکثر بیمار بھی آتے، اور آپ جو کچھ پڑھ کر دم کرتے بیدل یاد رکھتا۔ بعض اوقات تعویذ بھی لکھ کر دیتے۔ بیدل کہتا ہے کہ میں بھی بیماروں پر اس کا تجربہ کرتا رہا۔ ”اگرچہ اس قسم کی حرکات کی وضع کھیل تماشا ہی تھا مگر رحمتِ ایزدی بہانہ جو ہے بیمار صحت یاب ہو جاتے“ مرزا قلندر کو بھی اس کا علم تھا۔ مولانا کی خدمت میں حالات بیان کرتے تو آپ خوش ہوتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا کہ اس گھر کے صاحب خانہ کی زوجہ آسیب جن میں مبتلا ہے۔ گذشتہ دو شبانہ روز سے غلبہ اس حد تک ہے کہ بے ہوش پڑ چکی اور شاید کوئی دم کی مہمان ہے۔ کئی عزام خواں آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میرے دل میں شوق بے پرواہ نے چٹکی لی۔ ایک محرم خانہ کو بلوایا اور اس کی انگلی پر اسیم اعظم دم کیا۔ اور حسب تلقین مولانا شیخ کمال ہدایت کی کہ مریضہ کے کان میں انگلی ڈال دو۔ اُس نے تعمیل کی۔ مجھ و عمل گویا نیزہ دیور جیم کے سینہ میں لگا۔ دو دسپند کی طرح چلا یا۔ اور فوراً مریضہ سے جدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ

شہرت نہ ہوتی۔ مولانا نے بھی سنا۔ مجھے بلوایا اور کمال التفات سے پوچھا کہ تو نے کونسا عمل کیا ہے۔ یہ بات محض حرف و صوت و ظائف اور تعویذوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کی کہ حضور ہی کی عنایت ہے اور آپ ہی کا فیض ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ ایک کتاب جس میں اعمال غریبہ و غیرہ مذکور تھے مجھے عنایت کی۔ اور فرمایا کہ میں نے اس عرصہ تک فوائد علمی جو کچھ جمع کئے اس میں درج ہیں: ”با خبر باش کہ تیرا طالع سلیمانی نظر ہے اور تیرا دم صلیوی اثر ہے۔ ان اشغال میں سے جو اس میں مندرج ہیں تو جس میں مشغول ہو گا مبارک ہو“

بیدل لکھتا ہے کہ اس دن کے بعد میں نے جو بھی عمل کیا اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ حالانکہ لوگ ایک عمر کوشش کرتے ہیں پھر بھی گل مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے فطری قابلیت اور اس کے بعد مناسب اسباب جمع ہوں تو نتیجہ خاطر خواہ ہوتا ہے۔

فانوس شمعہا اثر قابلیت است۔ بیرنگ پیچ جلوہ مصور نمی شود
 شمع میں قابلیت موجود ہے۔ اور اسی قابلیت کا اثر ہے کہ جلانے سے جلتی ہے
 ورنہ جس جلوہ میں کوئی رنگ نہ ہو اس کی تو کوئی صورت ہی محسوس نہ ہوگی۔

از شعلہ کسب نور چراغ فسرده را

بے روغن و فقیہ میسر نمی شود

چراغ بجھا ہوا ہوا ہزار شعلہ دکھاؤ کبھی روشن نہ ہوگا جب تک اس میں تیل
 اور بتی نہ ہو۔ جب یہ مناسب اسباب جمع ہونگے تو چراغ فسرده شعلہ سے کسب نور
 بھی کرے گا۔

ساحل کہ اصل طینش از جوش تشنگی است

دریا ست در کنار و لبش تر نمی شود

ساحل کی طینت میں وہ فطری قابلیت نہیں کہ اس کی خشکی دور ہو۔ اگرچہ
 دریا اس کی کنار میں ہے مگر اس کے لب تر نہیں ہوتے۔

بیدل

آئینہ آب دارد و نم آتشکار نیست
در سنگ آتش است و منور نمی شود

آئینہ میں آب تو ہے مگر بے نم ہے۔ اسی طرح پتھر میں آگ موجود ہے وہ خود روشن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ تاریک ہی رہے گا۔

صدیق وار فیض ازل را نتیجہ ہاست
بوجہل را زہ دار پیمبر نمی شود

ہر ایک شخص کی فطرت میں خاص خاص قابلیت فیض ازل ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے آن حضرتؐ کے دعوائے رسالت کی فوراً تصدیق کی۔ لیکن عمر بن ہشام جو ابو جہل کے نام سے مشہور ہوئے، آخر دم تک منکر ہی رہا۔ اس میں نہ قبولیت کی صلاحیت تھی اور نہ اس نے قبول کیا۔ خواجہ حافظ کہتا ہے کہ

حسن زبیرہ بلال از حیش صہیب از شام
ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہرہ بوالعجبیت

خواجہ حسن بصریؒ تابعین میں سے ہیں اور حضرت بلالؓ مؤذن حبشی اور حضرت صہیبؓ دونوں اصحاب رسول کریمؐ ہیں، تینوں سے آن حضرتؐ کا کوئی تعلق قرابت نہ تھا۔ ابو جہل قریشی اور اس سے قرابت بھی تھی اور مکئی بھی تھا۔ اول الذکر تین تو آسمان اسلام کے درخشندہ ستارے ہیں، اور ابو جہل محروم ہی رہا۔

بیدل جو واقعہ بیان کرتا ہے اس سے ایک نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، اور اس پر

حکمانہ بحث بھی کرتا ہے، ہمارے زمانہ میں وظائف اور اورداد اور تعویذ اور اس قبیل کے عملیات پر تعلیم یافتہ طبقہ کا ایمان نہیں۔ عموماً جہلا ہی ان کی تاثیر پر یقین کرتے ہیں۔ بیدل نے اشعار مذکورہ میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ”سخن“ کا اثر ضرور ہوتا ہے مگر ”سخن گو“ کی فطری قابلیت اس میں کار فرما ہوتی ہے۔ یہ موضوع نفسیات کا ہے۔ انسان کو حیوان ناطق اسی لئے کہتے ہیں کہ دیگر طغات پر اس کو ”سخن“ کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ لیکن انسانوں میں بھی تاثیر سخن کے مختلف

مدائح ہیں خواجہ حافظ بھی فرما گئے ہیں ۷

چہ رشک می برمی بے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

ایک موزونی نفس دگر است آن نفس نیست مطلع سحر است
بحر صد رنگ موج و قطر و شکست آنچہ موزوں فساد گوہر است
ہر کہ موزوں نباشد انسان نیست فہم نیز نگ معنی آسان نیست
طبع موزوں نہ کسی و عملی است از عطیات فیض لم یزلی است
آدمی فطر تست و قطرہ نام نیست روشن مگر ز لطف کلام
حسن این شاہد سراپا ناز جلوہ گر نیست جز بخلوت راز
بے تکلف حنا بچنگ نہ بست تادے خوں نکر و رنگ نہ بست

باتیں تو سب بناتے ہیں لیکن لطف کلام موزونی طبع میں ہے۔ اور یہ موزونیت کسی نہیں بلکہ فطری ہے، عطیہ فیض رحمانی ہے، قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است، بعض اشخاص کی تقریر میں وہ اثر ہوتا ہے کہ ہزاروں آدمی ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اور چند تقریروں سے انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات ہر ایک شخص کو نصیب نہیں۔

خامش نفسی کہ طبع موزوں دارد صد غنچہ بہار از دل پر خوں دارد
تسخیر پر یزاد سخن آسان نیست این جانفس سوختہ افسوں دارد
بیدل نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا تعلق علم نفسیات و ارتقاء وغیرہم سے ہے۔ یہ بحث دقیق ہے اور بیدل نے جن لفظوں میں بحث کی ہے وہ اذق ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ بیدل کے نظریہ حکمت کو عام فہم عبارت میں واضح کریں۔

بیدل لکھتا ہے کہ کل کائنات ”کلمات“ ہیں: قل لو کان البحر ملاً

الکلمات ربی لایۃ “دکھف ع ۱۲

بیتل

بہر رنگ آیات حرف است و بس نفس در عبارات حرف است و بس
 حقیقت کہ آن سوئے ماد من ست چو بے پردہ شد حرف پیراہن ست
 چہ مقدار بے تاب اظہار شد کہ آخر در انساں نمود ارشد
 تمام کائنات ایک کتاب ہے۔ اور کائنات حروف ہیں یا کلمات ہیں،
 ”ہر نقشہ کہ می بینی حرفیست کہ می شنوی“ اشیاء کائنات یا ان کے تصورات جو
 ہمارے قلب میں ہیں جن کو خیالات سے موسوم کرتے ہیں، فی الحقیقت حروف
 ہیں جن کے ذریعہ اشیاء کائنات ہم سے ہم کلام ہو کر اپنا مافی الضمیر واضح کرتی
 ہیں۔ کتاب کائنات مصور ہے اور یہ تصویریں حروف یعنی اشیاء کی صورتیں ہم
 دیکھتے اور سنتے ہیں، اس حقیقت پر تو کل حکماء کا اتفاق ہے کہ کوئی خیال
 بلا حروف قلب انسانی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت ”کلمہ مجردہ“ ہے،
 اور حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے۔ جب تک کہ وہ کسی صورت میں ہمیں
 محسوس نہ ہو، اور یہ صورتیں حروف ہیں، اس لئے بیتل کہتا ہے کہ وجود حقیقی مادہ
 سمع و لطف ہے۔ ”تحقیق جو ہر نطق بی آئینہ سمع صورت وقوع نہ بندد، و یقین کیفیت
 سمع بے ظہور نطق بہ تحقیق نہ پیوندد“ یعنی نطق اور سمع لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی
 تصدیق دوسرے کے تصور کے بغیر ممکن نہیں۔

گر حرف یقین و گرگماں می شنوی از عالم بے نطق و بیاں می شنوی
 خاموش شو و بے بی کہ بے گفت و شنود چیزی می گوئی و ہماں می شنوی
 حقیقت مجردہ کلمہ بے حرف و صوت ہے، ما کان بشران یکلمہ اللہ الا
 وحیاً او من وراء حجاب (چند)

کلام الہی حقیقت مجردہ ہے اور کسی انسان میں یہ تاب و طاقت نہیں کہ اس
 حقیقت پر مطلع ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا وحیاً یا ”من وراء حجاب“ ”وحی“
 کلام ہ حروف کی صورت میں قلب انسانی سناتا ہے۔ بیتل ”نکات“ میں لکھتا ہے
 کہ ”اگر نبوت ایمان داری، باخضرات دلی جو بہ تعظیم پیش میا، و اگر بر تجلی یقین داری

بیچ جانب چشم بے ادب کشا، ”خطراتِ دل“ تحریکاتِ فطری ہیں۔ اسی کو وحی اور الہام اور القا سے موسوم کرتے ہیں۔ عام فہم لفظوں میں خیالات ہیں۔ لیکن یہ کہاں سے آتے ہیں؟ کتاب کائنات سے، ”اتل ما اوحی الیک من الکتاب“ اور ”لذین ینطق بالحق“ (۱۱۱) وحی بلنطہ ہوتی ہے اور اس کے فہم میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ حیوانات وحی کے تحت عمل کرتے ہیں اور کبھی غلطی نہیں کرتے، ”من وراء حجاب“ تصورات میں جو بیداری اور خواب میں رونما ہوتے ہیں، غلطی ان میں بھی نہیں، لیکن ان کی تعبیر کرتے ہوئے انسان غلطی بھی کرتا ہے۔ ان کا فہم تذکرہ و تذہر و تفکر سے عقلاً حاصل ہوتا ہے، یعنی اس نسبت کا دریافت کرنا جو صورتوں کو اپنے حقائق سے ہے لیکن

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام
کاندہاں بے حرف مے روید کلام

(ثنوی معنوی)

رباعی مذکورہ کا یہ مفہوم ہے کہ جو بھی دل میں خیال پیدا ہوتا ہے خواہ یہ یقینی ہو یا ظنی انسان کا پیدا کردہ نہیں وہ الہام کہ بے حرف و صوت سے نازل ہوتا ہے۔ ذرا خاموشی اختیار کرو تو معلوم ہو گا کہ تم خود ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہو اور آپ ہی سنتے ہو۔ اس لئے ”بیچ صورتے در ذہن نقش نتوان بست کہ بخارج جلوہ نماید، و بیچ کیفیت در خیال خارج جلوہ نتوان داد کہ بظاہر جام عبارتے نہ پماید“

”اں رمز کہ سمع و نطق دریافتہ است نتوان گفتن با صرہ نشگافہ است“
”شمعے کہ مقیم خلوت فانوس است چوں دانگری جملہ بروں تافہ است“

دل میں کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا جس کا مشاہدہ جزواً یا کلاً خارج میں نہ کیا ہو۔ اور دل میں کوئی کیفیت یا مافی الضمیر کا اظہار نہیں ہو سکتا جب تک عبارت تحریر یا تقریر میں نہ ہو۔ اس لئے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں سنتے ہیں وہ ایک ہی حقیقت

بیتل

ہے شمع گو فانوس میں مقیم ہے مگر اس کی روشنی فانوس اور شمع دونوں سے باہر جلوہ نما ہے۔ اقبال کے ماں بھی اس کے مماثل یہ مضمون ملتا ہے۔ کسوت مینا میں ہے، مستور بھی عریاں بھی ہے۔ "ایں جا متحقق گردیدہ سخن روح کائنات است و اصل حقیقت موجودات ہر گاہ با خفائی معنی کو شد جہانے را نفس در دیدن است، و چوں افشائے عبارت جو شد عالمے را بر خود بالیدن" اس سے ثابت ہوا کہ سخن روح کائنات اور اصل حقیقت موجودات ہے، جب اپنے معنی کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ کائنات دم بخود ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ اور جب عبارت میں ظاہر ہوتی ہے تو ایک عالم کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔

بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز	با خفا حقیقت، با فشا مجاز
"ازل" را ہماں از سہ حرفش سند	سہ حرف از کتاب کمالش "ابد"
بحیواں صدا و در انساں لغات	تا مل بدن، نفس در نبات
چہ عقبی؟ بمعنی نظر کردنش	چہ دنیا؟ رہ نلفظ سر کردنش
چو در جلوہ آید سخن نام اوست	زا سما اگر جملہ اسرار اوست
جہاں زندہ اوست افزوں میرس	زا عجازاں عیسیٰ افسوں میرس
عدم نیز ممتاز نام است ازو	نہ ہستی ظہور انتظام است ازو
چہ مردن؟ تہی گشتہ جائی سخن	کدام است جاں، آشنائی سخن
نیاورد غیر از سخن جبرئیل	اُمم را رسول از سخن شد دلیل
بغیر از سخن چلیست آنجا رقم	بفہمی اگر مرز لوح و قلم،
کہ غیر از سخن در جہان مست یح	بسرشتہ و ہم دیگر پیچ

یہ کائنات عالم غیب و شہادت ہے۔ عالم غیب میں یہی سخن حقیقت ہے۔

اور شہادت میں مجاز سے موسوم ہے، غیب تنزیہ ہے اور یہ سخن تنزیہ میں راز ہے اور شہادت تشبیہ ہے اور ہم عالم اسی کو کہتے ہیں، کائنات کے دو کنارے "ازل" اور "ابد" ہیں۔ یہ فی الحقیقت اسی سخن کا کمال ہے۔ یہی حقیقت جمادات

میں خاموش ہے، اور نباتات میں نفس، اور حیوانات میں آواز، اور انسان میں لغات کی صورت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ دُنیا کیا ہے؟ اسی سخن کے الفاظ کی سموت عقبیٰ کیا ہے؟ اسی کے معنی کا مشاہدہ اُسی سے جہان زندہ ہے یہی روح کائنات ہے بہستی کا نظم و نظام اسی سے قائم ہے، بلکہ عدم بھی اسی کی وجہ سے نام سے ممتاز ہوا، جان کیا ہے؟ جو سخن سے آشنا ہو۔ موت کیا ہے؟ سخن کی جگہ خالی ہونا، زندے ہی باتیں کرتے ہیں مُردے خاموش ہیں۔ یہ سخن (وحی) ہی ہے جس سے رسول اُمت کی رہنمائی کرتے رہے اور جبرئیل نے سخن کے سوا کچھ اور نازل نہیں کیا۔ اگر لوح و قلم کی رمز سمجھ لے تو معلوم ہوگا کہ لوح پر سخن ہی رقم ہے اور قلم سخن ہی لکھتا ہے، زیادہ وہم میں نہ آجھ اتنا سمجھ لے کہ جہاں میں سخن کے سوا اور کچھ نہیں۔ مختصر یہ کہ محسوسات عالم صورت حروف کی مثل ہیں عقبیٰ عالم حقیقت معنی کی مانند ہے۔

بیدل نے طویل بحث اس موضوع پر کی ہے اور اسی سے استدلال ”وحدت وجود“ پر بھی کرتا ہے اس پر بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ سر دست تحقیق بیدل یہ ہے کہ حقیقت سخن ”ارادہ محض“ اور ”امر الہی“ ہے۔

کہا میں صدا نغمہ ساز کن ہماں و شنگاہ ظہور سخن
”بدیع السموات والارض آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا جب
واذا قضیٰ امرًا فانما یقول له کن کوئی امر مقرر فرماتا ہے تو اتنے کہنے پر کہ ہو جا
فیکون“ (۱/۱۱۱) وہ ہو جاتا ہے۔

”انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یہ تو صرف اس کا امر ہے جب کسی شے کا
یقول له کن فیکون، فسبحن الذی ارادہ فرماتا ہے تو اتنے ہی کہنے پر کہ ہو جاوہ
بیدہ ملکوت کل شیء والیہ امر ظہور میں آتا ہے، پس وہ ذات پاک ہے
ترجعون“ جس کے دستِ قدرت میں ہر ایک شے کی
بادشاہی ہے اور تمام امور کا رجوع بھی
اسی کی طرف ہے۔

بیدل

خاصان بارگاہ الہی اسی امر اسی ارادہ الہی کے تحت ہوتے ہیں۔ انہیں معیت حق حاصل ہوتی ہے۔ ”گفتہ را و گفتہ شد بود، گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود“ ”مقربان بارگاہ الہی کا کیا مذکور ہے، عوام الناس بھی جب کسی امر کا ارادہ کرتے ہیں تو مناسب اسباب کے ساتھ ظہور میں آجاتا ہے۔

قصبہ رانی ساگر سے ایک کوس کے فاصلہ پر سرائے بنارس میں ایک مجذوب ”شاہ ملوک“ نامی کی رہائش تھی، ”مدتے چوں سایہ بہ پائی درخت در کشیدہ بود“ ایک عرصہ سے ایک درخت کے نیچے سایہ کی طرح مقام تھا۔ برہنہ سایہ کی طرح گرم و سرد سے بے خبر تھا۔ دور و نزدیک سے ارادت مند آتے۔ بیدل بھی گاہے گاہے اوہرا مکتا۔ شاہ صاحب عموماً بڑے ہانکتے رہتے۔ مگر اس ضمن میں باتیں پتہ کی کہتے۔ ایک روز حضرت شیخ کمال مریدان با صفا کو منازل سلوک تلقین فرما رہے تھے، فرمایا کہ ایسے لوگوں کی مجلس سے احتراز کرنا چاہئے جو ”جنون کسوت“ اور ”وحشی مزاج“ ہیں اور لوگ ان کو مجذوب خدا رسیدہ سمجھتے ہیں، ”اگر در بزم صحبت برہنگی از شرائط معقول ہست خرس و بوز نہ افضل ادب کسوتان خواہد بود، و اگر ہنگام تکلم کف بدہان آوردن از قواعد فصاحت باشد شتر را افصح معنی بیاناں تصور باید نمود۔“ یعنی اگر کسی ننگے کی صحبت میں بیٹھنا کوئی معقول بات ہوتی تو ریچھ اور بندر سے بڑھ کر آداب سے واقف اور کون ہوتا اور برہ ہانکتے وقت منہ سے کف جاری ہونا قواعد فصاحت میں داخل ہوتا تو اونٹ سے بڑھ کر فصیح کلام کس کا ہوتا۔ انسان صاحب ”احسن تقویم“ ہے۔ اس کو اس رسوائی میں مشاہدہ کرنا بصرو بصیرت کی توہین ہے۔

انبیاء صاحب دعوت بودند صورت و معنی اُلفت بودند

عمر با اثر سعی وفاق عرضہ دادند طریق اخلاق

تا تو زان شوہ مکرم گشتی غویت محو شد آدم گشتی

اگر ایں وضع بقانون می بود۔ ہمہ کس اُمت، مجنوں می بود

انبیاء لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور انہی کے ”اُسوۂ حسنہ“ اور تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ انسان جو پہلے غول بیابانی کی طرح رہتا تھا آدم بنا۔ اگر یہ وضع جو ان برہنہ مادر زاد لوگوں نے اختیار کر رکھی ہے انسانیت ہوتی تو پھر تمام لوگ اُمتِ مجنوں ہی کیوں نہ ہوتے۔

ادھر تو مولانا شیخ کمال یہ پند و نصائح ارشاد فرماتے، اُدھر شاہ ملوک اپنی بڑے ہانکتے کہ :-

آفتاب کو برہنہ تصور کرنا اور آنکھیں چنڈھیائیں اور چشمِ انصاف پر پردہ ڈالیں تو اثرِ خفاشی ہے نہ بینائی ”پس مرگاں نمی توان بست تا غفلت درمی نکشاید“ چشمِ نتوان پوشید تا خواب غلبہ نماید ”یہاں برہنہ کون ہے کہ جسے تکلف سے چھپایا جائے اور مستور کون ہے کہ اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ تقوٰی یہ ہے کہ ماسوائے کے وسوسوں کی طرف توجہ نہ ہو نہ کہ اشیاء کے حسن و قبح کی تفتیش کی جائے۔

مخور از پاکی داماں زاہد فریب نور بے ایمان زاہد
صفا در جیبہ و عمامہ اش صرف طلسم قیر زو اندودہ برف
چو آتش ظاہر و باطن تباہی بسر خاکسترو در دل سیاہی
لیکن اکثر دیکھا گیا کہ کبھی مولانا کمال کا گذر اس طرف ہوتا حضرت مجذوب ”بے اختیار خود را برقع چھپدے و بصد دل تنگی غنیچہ مقیم پردہ کسوت گردیدے“ مجذوب اپنی برہنگی چھپاتا اور شاہ صاحب بھی بلا توقف گزر جاتے۔

مولانا یہ بھی فرمایا کرتے کہ اکثر لوگ صاحبِ عقل و ہوش ہیں اور تمیز خیر و شر بھی کرتے ہیں، مگر بظاہر دیوانہ بن جاتے ہیں تاکہ تکالیف شرعیہ سے منعذور سمجھے جائیں اور باوجود قوتِ عمل بیکاری اور کاہلی و سیاحتِ آسانی اختیار کرتے ہیں۔ اور بعض ”جنون سیرت“ اربابِ سلوک کی نسبت طنزاً عبارتِ عقلی کے ساتھ فقرے چست کرتے ہیں جب علمِ معقولات سے ان کو اتنا بہرہ ہے تو حفظِ مراتب میں مجہول کیوں

بیتدل

بنتے ہیں۔

جمعی از پیش خویش آگاہ اند بر فلک رفته اند و در چاہ اند
ہمچو فرزیں بکج خرامی جہل ہمعنان غریت شاہ اند
بسہانار ساندہ ظرف فروغ طشت خورشید و ساغر ماہ اند
بحر پیمائی رشعہ شبہم کوہ پرواز و پرہ کاد اند
تا نگر دند خاک جادہ شرع
گر ہمہ منزل اند گمراہ اند

بعض لوگ غلط فہمی سے فریب نفس میں الجھے ہوئے ہیں کہ ہمان تکلفات اور تصنع سے آزاد ہیں۔ بیتدل نے پتہ کی بات کہی کہ تمام کائنات میں تکلف و تصنع محسوس و مشہور ہو رہا ہے۔ ”در عالم ظہور انسانی کہ انجام مراتب حقیقت است۔ بے تکلف بودن خجلت تحصیل کمال است، و بے تصنع زیستن باعث تشویر و انفعال“

در رسومہ باید بتواضع بودن در مصطبہ سرخوش تجرع بودن
یعنی نقص حقیقت یکرنگی است در عالم صنع بے تصنع بودن
ارباب تحقیق دریا کے دل میں رہتے ہوئے تو ہم ساحل میں مقیم ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ ”خاک بر سر و انش کردن است“ اور اہل یقین تماشہ گاہ میں خیال شب میں آنکھیں موندھ لیں تو بصرو بصیرت کی مٹی خراب کرنا ہے۔
ایک دن قلندر روں کی ایک جماعت شاہ صاحب کے پاس آنکلی۔ اور اس ”شیر بیشہ جلال“ سے بے ادبی کے ساتھ پیش آئے۔ یہاں تک کہ زبان سے ہاتھوں پر اتر گئے۔ ناگاہ برق غیرت شاہ صاحب کی زبان پر شعلہ بار ہوئی اور رعد کی طرح گرج کر کہا کہ ”کتواس خرقہ میں کچھ نہیں اپنا پوست پہاڑو“ یہ سننا تھا کہ سب ایک دوسرے پر چوب زخشت سے حمد آور ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ”خرقہائی ہستی در ید ندو بہاں غبار فتنہ خاک گور بر سر ہم پاشیدند“

الحذر ای غافل از چشم بخود پیچیدگاں
ای بسا کشتی کہ در طوفاں یں گرد آب رفت
ہر کجا بینی مراقب طینتی تسلیم شو
ہم بیایہ سجدہ باید برد در مخراب رفت
کیمائی دانشی گر کردہ کسب ادب
مست جزا کیر چوں بیتیابی از سیمارفت
جان از راز ادب الفت پرت پیکر است
آبروئے زندگی ہم رفت چوں آب رفت
بیدل یہ جاننے کے لئے مضطرب تھا کہ ”آں خمدہ عالم اسرار از چہ کیفیت

مترنم غلغلہ جوش است“ کیا بات ہے کہ شاہ صاحب اس حالت میں ہیں اور وہ کیا
شے محرک سلسلہ خروش ہے، اس لئے بوقت فرصت شاہ صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب بھی مہربانی فرمانے لگے۔ ایک روز فرمایا کہ جو میں کہوں
لکھتے جاؤ۔ بیدل تین شبانہ روز لکھتا رہا۔ قریب چالیس بیت لکھے۔ شاہ صاحب
ایک شعر پڑھتے اور اس کی تشریح کرتے۔ اور اس تشریح میں وہ معارف اور
نکات بیان کرتے کہ ”مدرکہ در فہم مراتب آں سر اسیمہ می گردید“ شاہ صاحب نے
جو تقریر فرمائی وہ ایک کتاب معنی تھی۔ لیکن چونکہ زبان ہندی تھی اس لئے
بیدل نے اسے ”چہار عنصر“ میں نقل نہیں کیا۔

ای بسا معنی کہ از نا محرمی ہائی زبان
باہمہ شوخی مقیم نسخہ ہائی راز ماند
نغمہ ہا بسیار بود اما ز جہل مستمع
ہر قدر بے پردہ شد و پردہ ہائی ساز ماند
حسن در اظہار شوخی رنگ تقصیری نہاشت
چشم ہا غفلت نگہ شد جلوہ محو ناز ماند
جذبہ شوق بیدل کو ایک اور یگانہ روزگار ”شاہ یکہ آزاد“ کی خدمت میں لے
گیا۔ عم بزرگوار میرزا قلندر نے شاہ صاحب کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے شاہ
صاحب خود ہی میرزا قلندر کے ہاں تشریف لائے۔ گرمی کا موسم زور پر تھا۔ بیدل
پنکھا سے ہوا داری کی خدمت بجالایا۔ شاہ صاحب مسکرائے اور بیدل کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا کہ عنقریب تیرے ریشہ فطرت سے نہال قامت آرائی کرے گا۔
اور تیرے ہیولائی استعداد سے ایسی صورت ظہور میں آئے گی کہ اس کی کیفیت
کے فہم سے بلند آگاہ بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

بیدل

ای نوائی در ددل نو میدا نسدن مباش آخر از ضبط نفس شور قیامت می شوی
 دی سہ شک تاوان چپے دگر یا صبر باش مایہ ات چوں جمع شد طواف علامت می شوی
 اسن حوصلہ افزائی کے بعد نئی معنوی کے چند ابیات پڑھے۔ یہ رموز خودی
 تھے۔

ایں توئی ظاہر کہ پنداری توئی ہست اندر توئی توازیے توئی
 او تو است امانہ این تو کہ منیست آں توئی کاں بر تر از ما و منیست
 توئی تو در دیگرے آید و فیں من غلام مرد خود بین چنیں
 اس موضوع پر بیدل نے جو کچھ لکھا ہے مناسب مقام پر زیر بحث لایا
 جائے گا۔

بیدل شاہ صاحب کی کرامت کا ذکر کرتا ہے کہ ایک دفعہ دریا گنگا سے
 عبور کرنے کے لئے کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی میں اور لوگ بھی سوار تھے۔ جب منبہار
 میں کشتی پہنچی، ملاحوں نے کشتی سوال ہر ایک شخص کے سامنے پیش کی جسب توفیق
 سب نے جو کچھ دینا تھا دیا۔ شاہ صاحب کی باری آئی، یہاں کیا رکھا تھا۔ ہر چند
 خذ کیا کہ بابا میں فقیر بے نوا ہوں۔ مستحق خدمت خیرات ہوں۔ مگر کون سنتا ہے۔
 ملاح درپے آزار ہوئے۔ شاہ صاحب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ کھڑے ہو گئے اور
 دریا میں کود پڑے، اور ”چوں شکن در طرہ موج نشست“ کشتی میں لوگوں نے
 شور مچایا، شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ اے بے خبر و ناتوانی کی وجہ سے اتنا
 ٹوٹا ہوا نہیں ہوں کہ دویش موج میرا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اور سبکداری کے فیض
 سے اتنا آپے سے باہر نہیں ہوا کہ جناب کی پشت خم پل کا کام نہ دے۔ اس کے
 بعد ہوا کے جھونکے کی طرح دریا عبور کر گئے۔ اور آنکھ کی جھپک میں نظروں سے
 غائب ہو گئے۔ سچ ہے ”ترا کشتی آؤ و مارا خدا“

بیدل نے اس موقع پر جو اشعار لکھے ہیں وہ انگلستان کے مشہور شاعر
 گرے کی ”ایلیچی“ کے ہم معنی ہیں۔

ای بسا روشن دے کر بے نیاز یہائی شوق
چوں فروغ مہر بر خاک سیاہ افتادہ است
ای بسا آئینہ کز کسوت ز نگار ریش
یو فستائے بخل و نگاہ جاہ افتادہ است
معنی اقبال فقر از غافلان پوشیدہ اند
ور نہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است
ہر کجا گردشکتے سرمہ آرا ید بحیث
بے تامل نگذری آنجا کلاہ افتادہ است
ذرہ تا خورشید عرفاں جلوہ است اما چہ سود
دیدہ ہائے خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است
عالی محل بدوش و ہم جولاں می کند
کیست تا نہد کہ منزل ہم براہ افتادہ است
ایک اور مقام پر اسی کے ہم معنی ارشاد ہے کہ :

ای بسا آئینہ کز در و تغافل ہائی حسن
ریشہ داری از زمین یاس سر بالا نکرد
وی بسا تخمے کہ از بے التفاتی ہلے ابر
خاک شد در زبر رنگ جو ہری پیدا نکرد
شیشہ ہا در محفل افسوس امکاں چوں تباب
خود بخود در ہم شکست و بائے سودا نکرد
گر ہمہ رنگیست موقوف بہار جلوہ ایست
ور ہمہ بویست بے گل بال شوخی و انکرد

ہیچناں کز حسرت دیدار می بالہ نگاہ
نالہ را ہم جز ہوائی قامت رعنا نکرد
قید کلفت بزندان دشمن مہر آشنا
کیست منظور تو شد کز علم استغنا نکرد
ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ استعداد خواہ موجود ہو جب تک مناسب اسباب
مدد نہ دیں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔

آئینہ میں استعداد موجود ہے لیکن اگر حسن ہی تغافل برتے تو کوئی صورت
نہیں کہ اس کی استعداد ظاہر ہو۔ ریشہ کو حسرت ہی ہے کہ زمیں سے ذرا سرا و نچا
کرے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے لیکن اگر ابر ہی آبیاری نہ کرے تو اس کا نشوونما
نہیں ہوتا اور وہیں گل سرگردہ جاتا ہے۔ اسی طرح شیشے جناب کی طرح ٹوٹ
پھوٹ جلتے ہیں اور شراب سے لین دین کی نوبت ہی نہیں آتی، خواہ کوئی
شے سہ تیاپا رنگ ہو اس کا جلوہ بہار پر موقوف ہے اور اگر بو ہے تو گل کے بغیر
اس کی شوخی کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض جب تک مناسب اسباب استعداد کے

بیتدل

ساتھ نہ ملیں ظہور کمال نہیں ہوتا۔ بیتدل میں بھی فطری قابلیت موجود تھی۔ اگر ایسے صاحبان علم و فضل کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو آج یہ بھی ایک گمنام شخصیت ہوتی۔ تاریخ کے صفحات پر کتنے نامور اشخاص کا تذکرہ ہے جن کی تعریف میں لوگوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مناسب اسباب اور حالات کی سازگاری نے انھیں نامور بنا دیا ورنہ ممکن ہے کہ بلحاظ استعداد اور بھی ہوں بلکہ بڑھ چڑھ کر ہوں۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔

بیتدل نے ”چہار عنصر“ انہی حضرات کی تعریف و توصیف میں نذر کر دیئے ہیں۔ خوش قسمتی سے عم بزرگوار مرزا قلندر کی تربیت نصیب ہوئی۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ”تربیت فقیر بیتدل بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک نشاء بلوغ بعدہ التفات خود داشت، و با اشتقاق ربوبیت و تعلیم مراتب آداب و تدریس معانی اخلاق توجہ کمال می گماشت“ ان فوائد کے علاوہ کہ ”لمعہ نظمی کہ امروز رونق افزائی کا نوں تخیل است“ اسی آفتاب کا پر تو ہے جس کے زیر سایہ میری تربیت ہوئی۔ لطف یہ ہے کہ خود اُمی تھا مگر

حقائق ہماں بے بیانش وصول	کمالات بے سعی کبش حصول
بمعنی چو معنی بحرف آشنا	نگر دیدہ بر حرفے انگشت سا
دلے امی از کسب فضل عوام	بفیض ازل محرم ہر کلام
زہے اُمت خاتم المرسلین	فضائل ز اوراک او خوشہ چیں

آخری شعر میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ آن حضرتؐ بھی اُمی تھے۔

”نگار من کہ بہ مکتب زلفت و خط نوشت

(حافظ)

بغیرہ مسئلہ آموز صد مدرس شد“

ہزاروں رازی اور غزالی اسی ”اُمی“ کے فیض یافتہ ہیں، ارشاد قرآن

ہے۔ کہ :

”وما کنت تتلوا من قبلہ“ تو اس سے پیشتر نہ تو لکھا ہوا پڑھ سکتا تھا
 من کتب ولا تحطہ بمینک اذاً اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھنا ہی جانتا تھا
 لا رتاب المبطون بل هو اگر ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے شک ریب میں پڑتے
 ایت بدنت فی صدور الذین حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن آیات ان لوگوں کے
 او تو العلم“ (۲۱) ذہن میں ہیں جن کو علم عطا کیا گیا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ :

”الذی علم بالقلم علم الانسان“ اللہ ہی نے قلم سے سکھایا اور وہ کچھ سکھایا
 ما لم یعلم“ (۲۲) جس کا علم انسان کو نہ تھا۔

لیکن نوکِ قلم پر آنے اور صفحہ قرطاس پر رقم سے پیشتر انسانی ذہن میں آیات
 بینات تھیں۔ یعنی اہلِ علم کے قلبِ سلیم میں جو کچھ تھا، وہی کچھ قلم نے لکھا۔
 چشمے داری و عالمے در نظر است دیگر چہ معلم و کتابت باید

مدرسہ کی بک بک کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو کہ بیدل لکھتا ہے کہ ایک روز
 مدرسہ علماء میں ایک مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی ”دانش مند بے انصاف“ نے لاف و گراف
 سے مجلس گرم رکھی اور آوازہ ضرب یضرب سے ”علم خفت عقل“ بلند کر رکھا تھا۔
 قیل و قال کی خاک سے وہ دھواں ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈالی کہ علم کو رسوا
 کر کے چھوڑا۔ مرزا قلندر بھی اس مجلس میں موجود تھا، اسی دن سے بیدل کو منع کیا کہ
 علم مدرسہ بے فائدہ ہے، فرمایا کہ اگر یہی آثار علم ہیں تو بہتر ہے کہ تو جاہل ہی رہے اور
 اگر تحصیل کا فائدہ بھی کچھ ہے تو مناسب ہے کہ تو بے حاصل ہی رہے۔ کیونکہ اس کا
 نتیجہ سوائے پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ نہیں۔ جب کبھی کسی مسئلہ کی حاجت
 ہو ”قاضی در محکمہ نمرود است“ اور جب کبھی نصیحت منظور ہو ”واعظ را از منبر گرگ
 نمرود“

”غره دانش نگر دی از فسوں لفظ چند“ ای ”یعنی بے خبر علم حقائق دیگر است“
 ”ایں سخن ہائی کہ یاران ام عرفاں چیدہ اند“ جز خموشی آنچه فطرت راست لائق دیگر است“

بیدل

آفتاب کو آفتاب کی روشنی میں دیکھنا بدیہی علم ہے، اور کسی کو ر مادر زاد کو استدلال عقلیہ سے سمجھانا اور شے ہے۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید راستی رفت کہ ممنون عصایم کردند
اگران علماء کی قیل وقال اور بحث و مجادلہ کو دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ
بیدل نے سچ کہا ہے:

از تعصب جاہلاں دین ہدی را دشمن اند عاقبت در جنگاں کوراں عصا خواہد شکست
”دین ہدی“ تو ان اندھوں کی صراط مستقیم پر رہنمائی کر رہا ہے، اور بمنزلہ
”عصا“ ہے لیکن یہ اس عصا سے ایک دوسرے کے سروں کی تواضع کر رہے
ہیں اگر یہ بے مغز نہ ہوں تو اسے توڑ کر نہ رکھیں۔

آں کیست کہ گرد و طرف مولوی امروز یک تیغ زباں دارد و صد نوک شاں بخش
اکبر مغلیہ شہنشاہِ ابتدا میں بہت دیندار آدمی تھا۔ اور علماء کی قدر و منزلت
بھی دل میں بہت تھی، علمِ حدیث صدر الصدور شیخ عبدالبنی سے سیکھا جو امام
ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے۔ بدایونی اپنی تاریخ ”منتخب التواریخ“ میں لکھتا ہے کہ
اکبر کے دل میں اس کا یہ احترام تھا کہ اس کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سیدھی کرتا۔ اسے یہ
اختلاف جو مختلف فرقوں میں تھا پسند نہ تھا۔ اس لئے ایک مجلس علمیہ منعقد کی۔
غرض یہ تھی کہ اختلافی مسائل پر علماء باہمی بحث کے بعد ایسے امور پر متفق ہوں کہ
اختلاف رفع ہو جائے۔ اس مجلس میں چوٹی کے علماء موجود تھے۔ لیکن حالت یہ
تھی کہ اپنا تفوق جمانے کے لئے اگر ایک کسی شے کو حلال یا مباح کہتا تو دوسرا حرام
اور مکروہ قرار دیتا۔ اور دونوں فریق روایات اور ائمہ دین کے اقوال تائید میں
پیش کرتے۔ بحث کی گرمی میں بادشاہ کی موجودگی کا بھی پاس نہ کرتے۔ لام و کاف
تک نوبت پہنچ جاتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک روز اکبر نے اس طوفان بے
تمیزی سے تنگ آکر کہا کہ آئندہ جو حضرات آدابِ مجلس کا پاس نہ کریں گے بکھلا
دئے جائیں گے۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا دینی زبان سے کہا کہ پھر تو یہ سب نالائق

اسی لائق ہیں۔ اکبر نے یہ فقرہ سن تو لیا، لیکن تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ کیا کہتا ہے، عرض کی حضور کچھ نہیں آپ نے سچ فرمایا علماء کو اخلاق سے کام لینا چاہئے۔ ان مذاکرات علمیہ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کرام عوام کی نظروں سے گر گئے۔ اکبر مذہب سے بدظن ہو گیا۔ اور ان علماء کی وہ گت بنائی کہ پھر نہ ابھرے۔ اس وقت تک دینی حکومت کے ساتھ دنیوی حکومت بھی ان کے ہاتھ میں تھی، اکبر نے چھین لی۔ عبدالنبی اور عبداللہ مخدوم الملک وغیرہ کو ملکہ کا راستہ بتایا اور خود اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ خانقاہوں کے پیروں کو بھی نہ چھوڑا۔ خواجہ اجمیری کا یہ احترام تھا کہ جب کبھی زیارت کے لئے جاتا دس کوس ادھر ہی پایادہ چلتا۔ اس کے بوڑھے متولی کو قلعہ گوانیار میں قید کیا۔ حرم نے بہت سفارش کی، کہا کہ یہ گمراہ جب بھی قید سے باہر آئے گا لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ وہ قید و بند میں مر گیا۔ اکبر کا پوتا شہنشاہ دین پناہ اکبر کو ”جدا کفر“ کہتا ہے۔ صحیح، لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری علماء کرام ہی پر عاید ہوتی ہے۔ دین کی غرض تو ہدایت ہے اس کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا آلہ کار بنانا کوری نہیں تو اور کیا ہے۔ اکبری عہد کے علماء کی دنیا طلبی کا یہ حال تھا کہ عبداللہ مخدوم الملک مر گیا تو اس کے ترکہ کا جائزہ لیا گیا۔ کسی مخبر نے جڑدی کہ صحن خانہ میں چند قبریں ہیں ذرا ان کے ”رازدروں پردہ“ کی خبر لینی چاہئے۔ اکھڑوائی گئیں تو سونے اور چاندی کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔ یہ علماء دین کی اوقات ہے

”حافظامی خور و رندی گن و خوش باش ولے

دام تر و دیر یکن چوں دگراں و تر آن را“

یہ بے روزگار بیکار جماعت ہے اگر پیٹ پالنے کے لئے دین فروش نہ کریں تو کیا کریں۔ عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے بھی ان کو اکثر مل جاتے ہیں۔ بتیل ان کے جتہ و دستار اور ریش کی خوب خبر لیتا ہے۔ اسی ٹٹی کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، بتیل ہی نہیں شیخ سعدی بھی کہتا ہے کہ ۔

بیدل

”زہارِ ازاں قوم نباشی کہ فریبند

حق را بسجودے و نبی را بددے“

اللہ اور رسول کو کیا دھوکا دیں گے سادہ لوح لوگوں کو دامِ تزویر میں پھانس ہی لیتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں جمیعۃ علماء ہند نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ پاکستان نہ بنے اور ابھی تک ہندو کانگریس کے گُن گاتے ہیں۔ جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد

وائی گراں پس امروز بود فردائی

ہم نے یہ چند کلمات اس لئے لکھے ہیں کہ بیدل کے کلام کا ایک موضوع یہ بھی ہے۔ جس پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

بیدل شاہ فاضل قدس سرہ کا بھی ذکر کرتا ہے کہ میرزاقلندر ان کی صحبت

میں بھی لے گیا۔ جو کچھ میں نے ان کے بیان کی شگفتگی سے رنگینی مشاہدہ کی ہزار جوش بہار میں اس کی گل چینی میسر نہ ہوتی۔ اور جوشِ آپ کی کیفیتِ تکلم سے اخذ کیا ہزار دور سا غر فکرسے بھی حاصل نہ ہوتا۔ جب کبھی آپ کچھ ارشاد فرماتے میں ہمہ تن گوش ہو کر سُنتا اور کامل توجہ کی وجہ سے حافظہ میں محفوظ بھی ہو جاتا۔ شاہ صاحب میرے حال سے بے خبر نہ تھے، کبھی کبھی میری رسائی ذہن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے کہ کاش تجھ جیسا سامع میری باتیں سُنے اور سمجھے کے لائق ہوتا کہ میں بھی قیدِ خاموشی سے آزاد ہوتا۔ اور تیرے جیسا طالب ہوتا کہ میں اپنے عقدہ دل کو کھول کر رکھ دیتا، اب تو یہ کیفیت ہے کہ جو کچھ دل سے لب پر آنا چاہتا ہے۔ پھر دل کو بی کرتا ہے۔ سچ ہے کہ

محل قابل و دانگہ نصیحت قابل

چو گوشِ ہوش نباشد چہ سود حسنِ مقال (سعدی)

اندھے کے آگے رونا بھینس کے سامنے بین بجانا ہے۔ اگر لوگوں کے

فہم میں کج روی نہ ہوتی خاموشی کو سخن پر ترجیح بھی نہ ہوتی۔

عندلیبے بہم نوائی دگر شکوہ سرکرد کائی نوا پرور
شور ز انغم دریں چمن باراست گفت خاموش ز باغ بسیاراست
عالم از جنس این خروش پرست از نوا ہائے ہرزہ گوش پرست
ایک عندلیب نے اپنی ہم نوا عندلیب سے شکایت کی، ہم تو اس باغ میں
چھپاتی اور نغمہ سرائی کر رہی ہیں۔ مگر یہ کوؤں کی کائیں کائیں ایسی سمع تراش ہے
کہ دل پر گراں گزر رہی ہے۔ اس نے کہا کہ چپکے رہو اکثریت کوؤں ہی کی ہے۔
ایک دنیا اس جنس کے شور و غوغا سے پُر ہے۔ ان کی یا وہ گوئی سنتے سنتے کان
بہرے ہو گئے۔

ان اہل علم و فضل اور اہل باب و صدق و صفا کی صحبت میں جو کچھ ان کے
ارشادات تھے تبدیل انھیں بھی اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً شاہ فاضل کی
مجلس میں فقراء کی ایک جماعت ”چوں مڑگاں بہم پیوستہ خلوت آرائی انجمن یکتائی
یو دند“ ان سے ایک نے سوال کیا کہ منصور نے بھی؟ نا الحق کہا اور فرعون نے بھی
”انا ربکم الاعلیٰ“ کہا۔ دونوں ایک ”مقام“ کی راگنی الاپ رہے تھے، منصور میں
کو نسا کمال تھا کہ قابل تحسین ہے، اور فرعون کا نغمہ کہاں سے بے سُراور بے تال
ہوا کہ قانون آفریں سے خارج ہو گیا۔ فرمایا کہ منصور بے تعینی فقر کی وجہ محرم اسرار
یقین تھا۔ یعنی جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس پر اسے کامل یقین تھا اور کسی حالت میں اس کے
پائے استقلال نہ لڑ کھڑائے۔ یہاں تک کہ اس کے ایمان پر خون شہادت نے مہر
تصدیق ثبت کر دی۔ منصور نغمہ وحدت الاپ رہا تھا، فرعون غرور اسباب
شوکت میں گمراہ تھا، جب امتحان کا وقت آیا رنگ استقلال اڑ گیا۔ جب اس کا
دفتر گیر و دار آب نیل میں ڈالا گیا۔ تمام نقوش و عوئے باطل حرف غلط کی طرح
مٹ گئے۔ ایک ہی موج کے تھپڑے نے حواسِ خمسہ درست کر دیے، بے اختیار
چلا اٹھا ”آمنت برب موسیٰ و ہارون“ میں موسیٰ اور ہارون کے پروردگار

بیدل

پر ایمان لایا، ثابت ہوا کہ ”کذب لازم کثرت نمائی ست و صدق دلیل وحدت
آشنائی“

سلطنت سرمائے تو حیدر نتوان ساغتن
اعتبار غیر بسیار است در اسباب جاہ
یعنی اس جارشتہ اظہار وحدت در ہم است
بافقیری ساز کاینجا سوائے حق کم است
رنگ ہائی اس چمن یکسر شکست آمادہ اند
اسی اسیر رنگ بیرنگی بنائی محکم است
عبرتے حاصل کن امی غافل ز نخل میو دار
چوں تعلق بار دل شد استغنا خم است
ایک دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں ایک دوست نے یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

میتوان در کلبہ باہم شبی را روز کرد
بوریا اگر نیست نقش بوریا افتادہ است

اسی ایک شعر میں حرف مد عاکلی واضح کیا۔ شاہ صاحب نے بیدل کو کہا،
مجھے اس عبارت آرائی کی زحمت سے نجات دو اور بے تکلفانہ جواب لکھ دو کہ
نقش بوریا کا وہم راحت پسندوں کو ہوتا ہے اور کلبہ و کاشانہ عمارت اندیشوں
کی عشرت کا تنہیل ہے یہاں جو کچھ ہے نقش سادہ کے سوا کیا رکھا ہے۔ بیدل نے
بے تامل جواب میں چند اشعار لکھ دئے۔

خود بیا و حال ما بنگر کہ در ملک فنا

روزگار ما ز روز و شب جدا افتادہ است

کلبہ و سواس است نقش بوریا ز نگار طبع

کار ما با شیوہ صدق و صفا افتادہ است

بوریا و کلبہ را در عالم ما بار نیست

ہر کجا ما ٹیم نقش مدعا افتادہ است

کلبہ آتش زن، نقوش بوریا را محو کن

در بساط فقر ما بینی چہا افتادہ است

تا نخواہد سوخت از ما بر نخواہد داشت و ست

نیستی مارا چو آتش در قفا افتادہ است
حاضرین نے یہ برجستہ جواب بہت پسند کیا، شاہ صاحب بھی محظوظ ہوئے
اور تحسین کے بعد دُعا خیر بیدل کے حق میں کی۔

بیدل کا خال مرزا ظریف فقہ و احادیث میں خوب ماہر تھا، ۱۰۷۱ھ میں جبکہ
بیدل کی عمر سترہ سال تھی اپنے ہمراہ اوڈیسہ میں لے گیا۔ بیدل کو عم بزرگوار مرزا
قلندر سے جدا ہونا پڑا۔ انہی ایام میں شاہ ابوالقاسم ترمذی بھی اوڈیسہ میں
وارد ہوئے۔ مرزا ظریف آپ کا بہت معتقد تھا۔ تین سال مسلسل بیدل کو شاہ
صاحب کی صحبت نصیب ہوئی۔ بیدل لکھتا ہے کہ میں اکثر اہل اللہ کی خدمت میں
گیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک یگانہ روزگار تھا، اور
ان کے فیض صحبت سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا مگر دل میں ایک تڑپ تھی۔

تمام شوقم یک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد
جگر بداغ کہ می نشیند نفس باہ کہ می خیرامد

شاہ صاحب کی صحبت میں آخر مقصد حاصل ہوا "بودیم آنچه بودیم او
وانمود مارا"

شاہ صاحب سے پہلی ملاقات کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ
سمجھنا چاہئے کہ زمین مُردہ پانی کو ترستی ہے ابرِ کرم آتا ہے اور برستا ہے، نئی
زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیدل لکھتا ہے کہ شہر گنگ دریا کے کنارہ پر صدر مقام
صوبہ اوڈیسہ کا ہے۔ یہاں میں مرزا ظریف کے ساتھ چند روز ہوئے کہ ٹھہرا ہوا
تھا۔ مرزا حسب معمول درس دے رہے تھے اور ہر ایک آیت کی تفسیر بھی بیان کر
رہے تھے، اتنے میں ایک درویش جو شاہ صاحب سے منسوب تھا آیا اور کہا کہ
شاہ صاحب آپ کی ملاقات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ اس طائفہ سے
اعتقاد وراثت میں ملا ہوا تھا۔ مرزا ظریف اور میں استقبال کے لئے بڑھے، اور
تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ شاہ صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ الحمد للہ کہ آپ

بیتدل

اور میں ایک ہی دن اس شہر میں وارد ہوئے ہیں، ”فرصت یا مفت شوق است وصحت یا غنیمت ذوق“ اس کے بعد وہی آیات قرآن حکیم جو ہم تلاوت کر رہے تھے آپ نے پڑھیں اور وہ معافی اور نکات بیان فرمائے کہ کسی مفسر نے نہیں لکھے تھے، مجھ پر تو ایک بخود طاری ہو گئی اور مرزا ظریف باہمہ دعویٰ بحر علمی حیرت میں آگیا۔ اس محیط قدرت کے سامنے اعتراف عند قطرہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ چالیس سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں نے مدرسہ ثقات کا اتباع کیا اور تفسیروں سے اتنی سند تحقیق بھی حاصل کی، اگر علم یہ ہے جس پر مجھے ناز تھا افسوس میں نے ایک عمر بے تمیزی ہی کسب کی اور ان اوقات کے ضائع ہونے کا افسوس ہے جو مشقت غفلت پر صرف ہوئے۔

”دریں غفلت سرا عرفان ما، ہم ناز کی وارد

سرا پا مغز دانش گشتن و چیزے نفہمیدن“

شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر اس مدرسہ عالم کا علم ایک ہی جنس اصطلاح پر منحصر ہوتا تو لوگ اس کے مطالب مختلف عبارت میں ادا نہ کرتے۔ سب بھانت بہانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ہر ایک سازا پتے اپنے رنگ میں شوخی آہنگ کا اظہار کر رہا ہے بالخصوص قرآن عظیم ساز حقیقت قدرت ہے اور قانون سرار عزت، تصنع عبارت سے منزہ ہے کہ باہنگ نقصان نش سرابند اور اشارات کے تکلف سے پاک ہے کہ ”بمضرب کمالش واستانید“ اس کے نعمات کی بے پردگی سازندہ کی استعداد کا پتہ دیتی ہے اور اس کے مقامات کی بے نقابی نوازندہ کی فطرت کی شوخی بتاتی ہے ”ہر کس ایں جا از مقام و مال خود گوید خبر“ اہل علم و فضل نے جو کچھ اس کے مطالب بیان کئے یہ سمجھنا چاہئے کہ اپنی تحقیق کی حد کا نشان دیا۔ ان کا نغمہ بے سراور بے تال نہیں۔ اس بحر تحقیق میں من و تو زبانیں ہیں جو موج کی طرح سرگرم گفتگو ہیں، ہر ایک موج سے ایک شور پیدا ہو رہا ہے لیکن سب اپنے شور سے بے خبر ہیں، اگر ذرا تاہاموشی طاری ہو جائے تو منکشف ہوتا کہ دریا کے

چہار عنصر

منہ میں کتنی زبانیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مراتب کلام تحریر و تقریر بقدر فہم و عقل سامع ہیں۔ آفتاب جب تک خاکِ زمین پر جُبہ سائی نہ کرے سایہ کی طبیعت سے رنگ دور نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحب علم و فضل کو باہمہ بلندی درجات عوام کی دستگیری کے لئے تنزل کرنا پڑتا ہے تاکہ عوام کی طبیعت سے جہل مطلق رفع ہو۔ اگر حسن تحقیق اپنے ذاتی کمال سے جلوہ نما ہو تو ان آنکھوں پر ظلم ہو گا جو ضعیف نگاہ ہیں۔ اس لئے بقدر طاقت برداشت ہی بات کرنی پڑتی ہے اور اس طرح بات بھی بنتی ہے، اور اسی لحاظ سے نظریوں میں اختلاف اور تفاوت بھی ہے۔

سلسلہ تقریر ختم ہوا تو شاہ صاحب اٹھے، مرزا طریف نے چند قدم مشایعت کی، مگر میں سایہ کی طرح ساتھ ہو گیا۔ چلتے چلتے شاہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میں تو تمہارے ہی درد کی دوا بن کر آیا ہوں، مجھے اپنا شریک حال و اشغال سمجھو، اس بزم کے ساتی مستوں کے حوصلہ کے مطابق ہی پلاتے ہیں اور اس محفل کے شادشتاقوں کی تاب و طاقت کے مناسب، نقاب کے بند کھولتے ہیں۔ اس کے بعد دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تیرے مشرب استعداد کو کمال تک پہنچائے۔ شاہ صاحب کی مجلس میں عموماً اہل علم و فضل کا مجمع رہتا۔ کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو شاہ صاحب میری طرف بھی توجہ فرماتے کہ ہاں تم بھی کچھ کہو میں جو کچھ خیال میں آتا نظم و نثر میں گذارش کرتا۔ شاہ صاحب تحسین کے ساتھ حوصلہ افزائی اور کبھی کبھی اصلاح بھی فرماتے، ایک دن شاہ صاحب کے بھائی میر عبد السلام مجلس میں موجود تھے، شاہ صاحب سے کہا کہ ایسا قابل نو عمر اس لائق ہے کہ آپ کی توجہ سے کسی وقت اوج کمال پر پہنچے اور تھوڑے عرصہ میں مشہور ہو جائے۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں سے ہے جن کو فضل حقیقی نے ازل سے جوش عطا فرمایا ہے اور ابداً ان کا احوال خزانہ غیب میں پوشیدہ ہے۔

ایک روز مرزا طریف نے ازراہ تفقہ جو بزرگوں کو بیٹوں کی تربیت کے لئے

بیدل

لازم ہے جب مجھے دیکھا کہ میں پیشوایانِ عالم اور فقر خا کسارانِ طرِ قیٰ فیلسے عموماً
 اختلاط رکھتا ہوں شاہ صاحب کی خدمت میں شکایت کی ”یہ زیاں کا نقد آگہی“
 بے معرفت لوگوں سے جواہلِ تقلید میں رہتا ہے نامکن ہے کہ تحقیق سے اسے کبھی کچھ
 بہرہ ہو۔ اور جس فائدہ کا لالچ ہے وہ آخر نقصان کی صورت میں ملے گا۔ یہ اپنا
 وقت ضائع کر رہا ہے، اگر یہی وقت جناب کی صحبت میں صرف کرے تو مفت
 دولتِ عظمیٰ ہاتھ آئے۔ بیدل آنکھیں نیچی کئے خاموشی سے منتا رہا۔ شاہ صاحب
 نے فرمایا کہ ہر صفت اور ہر استعداد کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے
 کہ اس کی بنائے فطرت کمالِ متانت سے مضبوط ہے اور بساطِ طینت نہایت صاف
 اور ہموار ہے۔ لیکن جوانی کا بھی کچھ تقاضا ہے، اور یہ بے پروائی اس لائق ہے کہ نظر
 انداز کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی طرح اس کے اوقات میں خلل واقع نہ ہوگا۔
 خواہ یہ کسی طرف مشغول ہو تہمتِ غفلت اس پر عاید نہ ہوگی۔ آپ مطمئن رہیں،
 بیدل حیران تھا کہ

خفا فلاں سرگرم طعن و محرماں هست ثنا من ہماں آئینہ حیرت پرستہائی خویش
 خلقے ازشت غبارم آسمانہا در نظر من بچشم نقش پا حیراں ز پستہائی خویش
 یہ خوب رہی، شاہ صاحب تو میری تعریف فرماتے رہے اور خالو صاحب
 زجر و توبیخ، جب آپ اٹھ کر چلے گئے تو میں ویسے ہی سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاہ صاحب
 نے فرمایا کہ بزرگوں کے کہا کا بُرا نہ ماننا چاہئے۔ ناصح اپنے اعتقاد میں جو کچھ پسند و
 نصیحت کرتا ہے تو غرض ترغیب ہے اور معلم کو بھی تہذیبِ اخلاق ہوتی ہے۔

بیدل شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا بھی ذکر کرتا ہے، کہتا ہے کہ ان ایام
 سعادت انجام میں سید محمود جو مولانا یعقوب چرخ کی اولاد سے تھا اڑیسہ میں صوبہ دار
 تھا۔ شکنجہ مرض میں متعدد یان امور تقدیر نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ مسندِ صحت پر
 ایک ساعت بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں زہرِ سرائیت
 کر چکا تھا۔ اس مرض کو داء الثعلب کہتے۔ ہر چند اطباء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا

براہت مُردہ ام، اما زیارت خانہ خاکم

تومی آئی و من آسوده در آتش مزار من

شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے تجھے اس بیماری سے نجات بخشی۔ حاضرین میں سے ایک رافضی اسد نامی بھی موجود تھا داہم النحر، یہ فقرہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ جس طرح شیطان لاحول سے بھاگتا ہے اسی طرح بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ کہ یہ ہیں آج کل کے فقراء کہ امراء کے دروازہ پر آتے ہیں اور دفتر خوارق و کراوات کھولتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ خان دوراں کو کہتا ہے کہ میں نے تجھے نجات بخشی، اگر یہ ایسا ہی صاحب کرامت ہے تو گوشہ خلوت میں کیوں نہیں بیٹھتا، اغنیاء کے دروازہ پر ایسے ریاکار آتے ہیں اور غرض دنیا طلبی ہوتی ہے، غرض اسی قسم کے کلمات کہتا اور مغالطات بکتا ہوا جو اس قماش کے لوگوں کا شیوہ ہے پالکی میں سوار ہو گیا۔ جب دروازہ شہر کے قریب پہنچا ”صاعقہ از پردہ غیب نرؤشید و زلزله از بنیاد زمین جوشید“ پالکی جس میں یہ سوار تھا اٹ گئی۔ حمال اور ہمراہی تو اتنے بدحواس ہوئے کہ سمجھے دروازہ ان کے سروں پر آپڑا۔ ہوش بٹھکانے نہ رہے..... کچھ دیر بعد جب حواس ٹھکلنے ہوئے تو اس یا وہ گو کی تلاش ہوئی۔ پالکی میں موجود نہ تھا۔ حیران تھے کہ کہاں گم ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اس گم شدہ خر کا کہیں نشان نہ ملا۔ آخر دیکھا کہ پل کے ایک طاق کے نیچے جہاں شہر کی گندگی جمع ہوتی تھی فلاطت میں لت پت ہاتھ پاؤں مار رہا

ہے۔ آخر بمشکل اسے باہر نکالا۔ نشہ تو سب ہرن ہو چکا تھا۔ پانی سے منہ دھویا مگر چہرہ پر عیا ہی ایسی جمی کہ دھوئی نہ گئی۔ گویا ابدی رو سیاہی کا داغ تھا جو مٹائے سے نہ مٹا، کہا آٹھا کر اسی حالت میں گھر تک لے گئے۔

”منکر انسان کامل ہر کجا آید بحشم“

بے تامل شذیقین سگ بود یا خبر بود است“

انسان کامل کا منکر جہاں دیکھو یہ سمجھ لو کہ یا کتا ہے یا گدھا۔

”زانکہ در ہم جنس نتوان یافتن بوئے حسد“

طبعہائی مختلف از ہم مکرر بودہ است“

ہم جنس تو ایک دوسرے پر حسد نہیں کرتا کتے ہی ایسا کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک جنس دوسری جنس سے نفرت ہی کرتی ہے۔ ”روح را صحبت با جنس عذابیت الیم“

”جنس یکسر ہیئت معنی است بے ترکیب“

”گر ز باطن بر نخیزد اختلاف خاصیت“

ہر ایک جنس کی حقیقت ایک ہے۔ اور اس کے خواص بھی اسی حقیقت کے

مناسب ظاہر ہوتے ہیں، بظاہر اولہ اور موتی کی ایک صورت ہے اور اسی طرح

آگ سے دھکتا ہوا کوئلہ اور ہیرا بھی چمک دمک میں ایک جیسا ہے، اگرچہ ژالہ

اور گوہر کی اصل پانی اور کوئلے اور ہیرے کی اصل بھی ایک ہی ہے مگر ان کی

معنوی صورت جس شکل میں ظاہر ہوئی ہے وہ مختلف ہے خواہ محسوس صورتیں

ملتی جلتی ہیں۔

”چوں بصورت واری گل نیز ساغر بودہ است“

از ہما تا چغد یکسر مٹشتے از پر بودہ است

ورنہ خرس اندر بزرگی از کہ کمتر بودہ است

زین سبب با بولہب خصم پمیر بودہ است

”مگر دوش رنگ از جہان نشہ پیائے جداست“

غیر معنی گز بہ نقش محض باشد اشتراک

پس یقین شد آدمی معنی بود بیدست دپا

علت اشتداد خلق اوج و حسیض فطرت است

در ثبوت ایں حقیقت شاہدے در کار نیست ہر کہ خصم انبیاء بود است کافر بودہ است“
 بیدل ایسی ایسی نئی ترکیبیں ”جہان نشہ پیا“ آپ ہی اختراع کرتا ہے، ایسا
 معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شاعرانہ تخیل زبان میں زیادہ وسعت کا مطالبہ کرتا ہے، اور
 حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کا حکیمانہ تفکر اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ زبان پر پوری
 قدرت حاصل تھی، یہ اسی کا حصہ ہے، اُردو میں کوئی ترجمانی کیا کرے۔

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صرف صورتوں میں مشابہت پر نظر کی جائے اور
 معنی یا حقائق کو جو فطری ہیں نظر انداز کیا جائے تو ہما اور اُٹو دونوں مشتبہ ہیں
 تو ہیں۔ اس لحاظ سے تو ان میں کچھ فرق نہیں۔ پھول بھی تو پیالہ کی صورت میں۔
 لیکن پھول میں وہ نشہ بادہ کہاں جو ساغر میں ہوتا ہے۔ اس عالم صورت میں اہل
 نظر ان حقائق کو دیکھتے ہیں جو ان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، صورتوں میں
 تو اتنا اختلاف نہیں اور ایک ہی جنس کی صورتوں میں بہت کم ہوتا ہے لیکن جب
 ان کا مقابلہ دوسری جنس سے کیا جائے خواہ ان کی نوع ایک ہی ہو تو ان کے
 جوہر واضح ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ آدمی ان ہاتھ اور پاؤں کا
 نام نہیں، آدمیت ایک حقیقت ہے، ریمچھ ہاتھ پاؤں کے لحاظ سے بزرگی میں
 آدمی سے کمتر نہیں۔

”خلق“ اور ”خلق“ دونوں کی اصل ہی ہے ”خلق“ کا اطلاق ظاہر پیدا نشی
 صورت پر ہوتا ہے اور ”خلق“ معنوی یا ذہنی ساخت ہے۔ اور ”عادت“ کے
 معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نوع انسان میں ہر ایک شخص کی فطرت کی بلندی و پستی
 سے ہی ان کے اخلاق میں اختلاف کی حقیقت مضمون ہے، یہی وجہ ہے کہ ابی لہب
 آن حضرت کا دشمن تھا، کہ دونوں کے اخلاق ایک دوسرے کی ضد تھے۔
 اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مسلم ہے کہ نبیوں کا جو بھی منکر ہے
 کافر ہے۔

یہ واقعہ تو ادھر رونما ہوا۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ اسی بے ادبی کا خمیازہ

بیدل

تھا جو اس مردود اذلی کو بھگتنا پڑا۔ حضرت شاہ اپنے دولت خانہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، بیدل اور مرزا ظریف بھی ہمراہ تھے۔ ابھی رخصت نہ ہوئے تھے کہ اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اور خان دوران سید محمود کا آدمی بھی آیا اور عرض کی خان کی گزارش ہے کہ جناب اپنے الطاف کریمانہ سے اس بے ادب کا جرم گستاخی معاف فرمائیں۔ ایک عمر میری مصاحبت میں رہا ہے۔

”دریاد لان کہ سینہ بگو ہر جلا دہند

خاشاک را چو گل بسر خویش جا دہند“

بحر کے شکم میں آبدار موتی ہوتے ہیں اور سطح پر خس و خاشاک بھی۔

مفہوم یہ ہے کہ جو دریادل ہیں اہل صفا ہیں ان کے سینہ بے کینہ میں وہی موتی کی آب اور روشنی کا نور باطن ہے جس سے وہ منور ہے پھول کی طرح پست فطرت لوگوں کو بھی سر پر اٹھاتے ہیں۔

”رنگینی وفاست کہ از سرگذشتگاں

چوں شمع گل تقابل تیغ آزما دہند“

شمع کا روشن حصہ جو سر ہوتا ہے اصطلاح میں ”گل“ کہلاتا ہے، اور اسی رعایت سے بتی کو ”خار شمع“ کہتے ہیں۔ شمع نے بھی سر ہتھیلی پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے جانباڑوں کی رنگینی وفا کا تقاضا ہے کہ شمع کی طرح ”تیغ آزما“ یعنی قاتل کے سامنے اپنا سر پیش کریں۔ شمع کا گل مقراض سے کاٹتے ہیں، تو اس گل کی رنگینی یعنی روشنی اور شوخ ہوتی ہے۔

”بد طینت اگر سپرد راہ غفلتے

خوباں ز کف عنان تحمل چرا دہند“

اگر کسی بد طینت نے غفلت کی روش اختیار کرتے ہوئے کوئی ناشائستہ

کلمہ کہہ بھی دیا تو نیک سیرت اور خوب سرشت عنان تحمل ہاتھ سے کیوں دیں۔

خان دوراں کے فرستادہ کی زبانی عرض سن کر شاہ صاحب چپیں بھییں ہوئے

اور فرمایا کہ میں مدح و ذم کے تاثرات سے بالاتر ہوں۔ اگر کسی ہرزہ گو نے مجھے برا کہا تو کیا لیکن فقرا کی غیرت کا تقاضا کچھ اور ہے فی الحال بارگاہِ قضا سے یہ حکم صادر ہو چکا ہے کہ اس بے ایمان کی جان اسی بد مستی میں قبض کی جائے۔

شاہ صاحب یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ خبر آئی کہ اس بے ادب کی زبان بند تھی طبیعوں نے ایک قدر مے اس کے منہ میں انڈیلا کہ شاید اس کی حرارت سے لقوہ کے شکنجہ سے گلو خلاصی ہو۔ لیکن یہ عمل بھی مؤثر ثابت نہ ہوا۔ اس کا گلا بند ہو گیا اور غرغر کرتا ہوا ہلاک ہوا۔

شاہ صاحب نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جب کوئی حاکم کسی مملکت پر مامور ہوتا ہے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اہل فساد کا قلع قمع کرے تاکہ امن قائم ہو۔ آج ان ممالک کا اختیار میرے قبضہ تصرف میں دیا گیا ہے اگر اس طرح تادیب نہ کی جائے تو نسق آداب حق شناسی کا نظم و نظام بھی درہم برہم ہو جائے۔

اس واقعہ عبرت نما کے ظہور کے بعد شاہ صاحب کی محفل قدس میں حکیم طاہر گیلانی بھی باریاب ہوا۔ بات کرتے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ موزوں طبیعت کلمات سنجیدہ میزان و قار میں گوہر فروشی کرتی تھی۔ شاہ صاحب کی اس کے حال پر زیادہ توجہ ہوئی۔ ایک دن فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ تیرا باطن بھی تیرے ظاہر کی رنگینی سے متصف اور تیرا اعتقاد بھی تیرے صفائی کلام کے ہم رتبہ ہو۔ اگرچہ تا حال اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا لیکن جو امر ہوتا ہے وہ مقررہ وقت پر ہی ظہور میں آتا ہے۔

ما و تو جملہ منتظر فضل و رحمتیم تا شاہد قبول نصیب کنار کیست

در ہر بساط آئینہ با دام چیدہ است تا جلوه مائل چمن انتظار کیست

از سبزہ تا نہال جگر تشنہ اندیک بر شجر و سحاب کرم اختیار کیست

تیسرے روز حسب معمول مجلس گرم تھی کہ کسی نے کہا کہ حکیم طاہر بجران سودا میں مبتلا ہو گیا۔ اور آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے، اور آپ کی قدم بوسی کے لئے بے قرار ہے۔

بیتل

اگر اجازت ہو تو یہاں لائیں۔ شاہ صاحب نے مرزا ظریف اور مجھے بیمار پرسی کیلئے بھیجا، لیکن ساتھ ہی تاکید فرمایا کہ اگر یہاں آنا چاہے تو ہرگز ساتھ نہ لانا اور کہہ دینا کہ دور روز اور صبر کرے ارادہ الہی کے مطابق میں ہدایت اسی طریق سے کروں گا۔ اور آپ ہی یہاں لاؤں گا۔ قصہ جب ہم بیمار کے سرے پہنچے تو اس کی گریہ و زاری سو قدم پیشتر استقبال کے لئے آئی۔ ہم نے خیر و عافیت دریافت کی، تو کہا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ بات کہنے کی نہیں مگر آپ آں جناب کے محرموں میں سے ہیں۔ آپ سے کیا چھپاؤں۔ بات یہ ہے کہ عرصہ ہوا میرا والد حکیم نور الدین فوت ہو گیا۔ اور اسی کلفت خانہ کے پائیں باغ کے صحن میں مدفون ہے۔ حقوق پدری کا تقاضہ ہے کہ میں فاتحہ خوانی کے بہانہ زیارت کے لئے جایا کرتا ہوں، جس روز شاہ صاحب سے رخصت ہو کر گھر آیا، حسب معمول شام کے وقت فاتحہ کے لئے گیا۔ معابد بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ قبر سے ایک عفریت کی صورت نے سر نکالا، جب غور سے دیکھا یہ بچہ نظر آیا۔ رات کا وقت تھا، میں وحشت زدہ ہو گیا۔

در دل شب چارہ از وحشت نثار دیچ کس لوح سود ایک قلم منقوش اوہام است و بس
سایہ خود ہم سیاہی گر کند بی وہم نیست خاصہ ہر گہ سایہ آفاق گیرد پیش و پس
میں نے چاہا کہ لوٹ جاؤں ناگاہ غرس نے فریاد شروع کی کہ ”اے طاہر میں نور الدین تیرا باپ ہوں مجھ سے کیوں ڈرتا ہے، میری مثالی صورت سے تو عبرت حاصل کر۔ یہ سب کچھ ان گناہوں کا نتیجہ بھگت رہا ہوں کہ اپنا باطل مذہب عبادت سمجھتا رہا، یہ عذاب جس میں تو مجھے مبتلا دیکھتا ہے یوم قیامت کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ جس کا انتظار کر رہا ہوں، جو مجھ پر گزر رہی ہے کسی دشمن کے نصیب نہ ہو اور جو میں دیکھ رہا ہوں کوئی کافر بھی نہ دیکھے، میں جسے ایمان سمجھتا رہا کفر تھا۔

کرد خرسے کہ دین رفض ایجاد مرکز صد ہزار نفریں باد
حالات دیکھ سن کر میرے حواس بجا نہ رہے۔ بے ہوش ہو کر گرا، مجھے یہاں اٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جس طرف نظر کرتا ہوں وہی نقشہ روبرو

ہے، آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان اسرار کا کشف جو مجھ پر ہوا محض حضرت شاہ صاحب کی توجہ کا اثر ہے۔ اگر اسی حالت کش مکش میں مرجاؤں تو کیا ہو گا۔ خدا را شاہ صاحب کی خدمت میں میرا حال زار بیان کریں۔ میری ہزار بار توبہ، افسوس صد افسوس۔

فرصت از کف رفت دل کارے نکر دافسوس عمر

کارواں بگزشت و من در خواب غفلت و امی من

میں نے کہا کہ شاہ صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ دور روز اور صبر کرو، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ تمہاری عاقبت محمود ہے، غرض ہر طرح تسلی آمیز باتیں کہیں اور رخصت ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور تمام حالات عرض کئے۔ تیسرے روز صبح کا وقت تھا، دوست و ظائف سے فارغ ہو چکے تھے کہ حکیم ظاہر کی آمد کا شور ہوا۔ جو نہی شاہ صاحب پر نظر پڑی، نعرہ مار کر قدموں پر گر ا۔ شاہ صاحب نے اٹھایا اور بغل گیر ہوئے۔ اور کمال لطف سے اپنے سامنے بٹھایا۔ اور: مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ابیات زبان مبارک سے فرمائے۔

ما جام جہاں نمائے ذاتیم ما دئی عالم صفاتیم
کو مردہ بیا کہ روح بخشیم کو تشنہ در آ کہ فراتیم

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیض عام ہے۔ بندہ خواہ کتنا ہی گنہ گار ہو ایک آہِ ندامت سے غفلت کی گرہ کھل جاتی ہے، جہاں اس کا فضل کار فرما ہے وہاں گناہوں کی حقیقت ہی کیا ہے خوش ہو کہ تیری ندامت اشک نے تمام سیاہ کاری کے نقش مٹا دیے اور تیری توبہ ”مردہ ساز محفل رستگاری“ ہے۔ اس کے بعد اپنی دستار حکیم کے سر پر رکھی، ہر طرف سے نوائے مبارک باد و مرجبا بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد حکیم نے شاہ صاحب کے قدم چومے اور کہا کہ اس عطیہ کا شکریہ ہزار گانہ سے کم نہیں، ایک دو سانس جو میری زندگی کے باقی ہیں اجازت دیں کہ اپنی منزل گاہ پر جا کر دو گانہ اخلاص ادا کروں۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا

بیدل

کہ ایسے کارِ خیر میں تاخیر نہ چاہئے۔ یارانِ محفل میں سے بعض حکیم کو گھر تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ ابھی چند قدم واپس لوٹے تھے کہ چپ و زاس سے شور اٹھا اور معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد حکیم کا "نقشِ جبیں بسجدۂ ابدی پیوست" تمام اجاب شاہ صاحب کی معیت میں نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے اور شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے سپردِ خاک کیا۔

ہم چوانخوان عمر ہا در بند غفلت کرد صرف یوسفی در جلوہ آمد تا بروں از چاہ شد
در دپیداکن کہ ایں دریا سراسر مرہم است نیست محروم اجابت گر خموشی آہ شد
شوخی نظارہ بود افسوں طراز ما و من چوں مژہ آمد بہم افسانہ ہا کوتاہ شد
بیدل اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رافضیوں کے عقائد پر تنقید کرتا ہے کہ

”ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن
زبانے را کز و کار درود آید بہ سب مکشا“

”دوستی رفعتہ برائے معصومین ظلمے ست صریح، ولاف حب ایں طایفہ
با آن تقدس نسبتاں تہمتے مست قبیح، کہ ہر گاہ دم از حب می زند نفس ہا
تو ام یہ بغض می بالہ، و تا صرف ہر بر زبان می آرند، معنی مترادف
حسد می نالد، فحش در چہ مذہب از شعبہ ہائی عصمت ست و نا سزاوار
کدام ملت سزاوار ستایش غفلت، می گویند ٹولائی عمرو بی تبرائی زید
صورت نمی بندد، اما نفہیدہ اند کہ اتفاق ایں دو تخیل در یک محل جہل
فطرت می خندد، ترا از غیر محبوب فراموشی می خواہد نہ بر خیال اضداد
سرگوشی، پس محبت با عداوت جمع کردن، برق در مزرع آگاہی
کاشتن اشت، و زنگار در آئینہ پروردن ستم بر حقیقت صفا جائز
داشتن“

مفہوم اس عبارت کا یہ ہے کہ اجتماع ضدین محال ہے۔ حب و بغض اضداد ہیں
اور بیک وقت ایک ہی محل میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ ائمہ معصومین کے بارہ میں

لاف حب بھی ہو اور اصحاب رسول کریم سے بغض بھی ہو ایک دل میں کیسے جمع ہوں مناسب تو یہ ہے کہ ماسویٰ محبوب جو کچھ بھی ہو بھول جائے نہ کہ غیر محبوب سے سرگوشی جاری رہے اور محبوب سے بھی دعوائے محبت ہو۔ اس محبت اور عداوت کو جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے برق کو خرمن میں پرورش کرنا یا آئینہ کو رنگار آلودہ کرنا اور پھر اس کی صفائی پر فخر کرنا۔ علاوہ ازیں کس ملت اور کیش میں کسی کو ایسے الفاظ ناشائستہ سے یاد کرنا جائز ہے، بدی بدی ہے اور نیکی نیکی نہ بدی نیکی اور نہ نیکی بدی ہو سکتی ہے، اگر ایک شخص بد کلام ہے تو اس کو خوش کلام نہیں کہیں گے جس کے دل میں بغض، حسد اور کینہ کے جذبات ہیں اور وہی زبان پر بھی آتے ہیں۔ ایسا دل اور زبان گندی ہے۔ ایک رباعی میں بتیل کہتا ہے کہ وہ وقت جو سب و شتم میں صرف ہوتا ہے کاش درود حسنین پر صرف ہوتا جس کا کچھ اجر بھی ملتا۔

ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن
زبانے را کز و کار درود آید بہ سب مکشا

سعدی کہتا ہے :-

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمنان ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام کہ بادوستانت خلاف ست جنگ

بہر حال اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ سنی اور شیعہ کے جھگڑوں نے مسلمانوں کو اس حد تک نقصان پہنچایا کہ یہ تنزل میں آ رہے اور نامسلمان ان پر مسلط ہو گئے۔ مدح اور سب صحابہ سے تو صحابہ بے خبر ہیں اور نہ ایسی باتوں سے تلافی یافت ہو سکتی ہے، بتیل نے ایک رباعی میں شیعہ اور سنی کے عقائد سے الگ ہو کر ایک بات ایسی کہی ہے کہ اس لائق ہے کہ آپ زر سے لکھی جائے۔

ہر سانحہ کہ شد بافسانہ دلیل بیکاری خلق اور است کفیل

موسیٰ تارنوز می شکافد دریا فرعون تا حال غوطہ خورد بہ نیل 305/40

جس واقعہ یا حادثہ میں افسانوی پہلو نکلتا ہو یا پیدا کیا جاسکے بیکار لوگ اس کو

بیدل

اپنا لیتے ہیں۔ نہ صرف اس میں رنگ آمیزی اور مبالغہ کرتے ہیں بلکہ گرمی محفل اور اور مجلس آرامی اسی میں سمجھتے ہیں کہ انھیں بار بار ڈھرایا جائے۔ موسیقی اور فرعون کا واقعہ تاریخی ہے جو ایک دفعہ رونما ہوا اور گزر گیا اولی الابصار کے لئے درس عبرت چھوڑ گیا۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ اس کا تکرار ہر ایک زمانہ میں کیا جائے۔ سوائے اس کے واعظان شہر کو اور کچھ مطلوب نہیں کہ اسے افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہوئے اپنی محفل گرم کریں۔

”علمے راسرگزشت رفتگاں از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست“

کسی زمانہ میں بے فکرے امیر جو تمام دن بیکاری کی وجہ سے رات آرام سے سو بھی نہ سکتے تھے ان کا محبوب مشغلہ تفریح ہی تھا۔ رات پنگ پر لیٹے اور قصہ خوان حسب معمول حاضر ہو گیا، اس نے داستان امیر حمزہ شروع کر دی اور نواب صاحب کو سلا دیا۔ اس لئے علم ادب میں قصہ اور خواب نے ایک تلمیح کی حیثیت اختیار کر لی، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بیدل کہتا ہے کہ جو حضرات گزر گئے اپنے اپنے وقت اچھایا بڑا جو کچھ بھی کام کیا کریں گئے۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہم اپنے زمانہ کے حالات سے نپٹیں، یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ :-

”یکے نیمہ از عمر خود کم کنم ؟ جہانے پُر از نام رستم کنم“ فردوسی

اپنا وقت عزیز ”سرگزشت رفتگاں“ کو دہراتے دہراتے ضائع کریں جس کا

فائدہ ان کو بھی نہیں جن کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ حافظ نے کیا اچھا کہا ہے کہ

عیب رنداں مکن اے راہد پاکیزہ سرشت کہ گناہ و گریے بر تو نخواہند نوشت

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت

کسی کے عیب بیان کرنا اخلاقاً مایوب ہے، اگر کسی نے کوئی گناہ کیا تو اسی کے

نامہ اعمال میں درج ہو گا یہ تو نہ ہو گا کہ اس کا عیب تیرے نامہ اعمال میں لکھا جائے۔

اگر کوئی نیک ہے تو نیکی کا فائدہ اسے ملتا ہے اور اگر کوئی بدی کا مرتکب ہوتا ہے

تو اس کا وبال اس کے اپنے نفس پر جو جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا۔ تو کسی کو بڑا کہہ کر خود بڑا کیوں بنتا ہے؟ "تلك اُمة قد خلت لہا ما کسبت و لکم ما کسبتُم ولا تسئلون عما کانوا یعملون" (۱۶)

بیدل اپنا ایک واقعہ خواب بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی مجلس میں اہل علم و فضل بیٹھے ہوئے تھے اور مسئلہ "حیا" پر گفتگو ہو رہی تھی۔

برنگے سخن در حیا می گذشت کہ شبنم ز روئے ہوامی گذشت
دل از سینہ تالاب عرق گشتہ بود گداز نفس در طبق کردہ بود
بیاں بسکہ تعلیم آداب داشت نگہ پرزدن در رگ خواب داشت

شاہ صاحب کا معمول تھا کہ جب کوئی ایسا موضوع زیر بحث ہوتا تو میری طرف اشارہ فرماتے کہ ہاں تم بھی کہو تمہارے خیال میں کیا آتا ہے۔ میں کوئی شعریانکتہ موزوں مناسب مقام عرض کرتا جس سے حضار مجلس بھی مغلوط ہوتے۔ حسب معمول شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیرے خیال میں کیا آتا ہے، میں نے عرض کیا

”حیا خواندم نگہ در گرد خط ماند
ادب کردم رقم خط در نقط ماند“

یہ تو خواب کا معاملہ تھا۔ چند روز گزر گئے۔ ایک روز شاہ صاحب کی مجلس میں ”تذکرۃ الاولیاء“ پڑھا جا رہا تھا کہ ایک شخص بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آیا۔ اور باتوں باتوں میں مسئلہ ”حیا“ کی بابت استفسار کیا، پیر بسطام نے جو کچھ جواب دیا پڑھ کر مجھے تامل ہوا کہ یہ جواب کس عنوان سے رنگ عبارت اختیار کرتا ہے، شاہ صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح تو وہی ہے جو تو نے اس رات نظم میں کہا تھا لیکن طریق بیان میں اشارات بہت ہیں اور بے حرف و صوت عبارات بے شمار۔

دانا نہ ہمیں صوتِ صدامی گوید اکثر بہ اشارات و ادا می گوید
بے کام و زباں ہزار حرف ستایجا کہ نینہ بڑے تو چہا می گوید

بیتدل

ملائی دل کو دل سے ہے براہِ راست خاموشی
جو محرم ہیں زباں کے وہ نگہ سے کام لیتے ہیں (مؤلف)

بیتدل نے اس واقعہ کے تحت ”کشف“ پر لطیف بحث کی ہے، ہمارے زمانہ میں اب تو نفسیات کے عالم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ”دل را بدل رہیت دریں گنبد سپہر“ کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور اسے ”ٹیلی پیتھی“ وغیرہ اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسے واقعات جن کا تذکرہ بیدل کرتا ہے،

۱۸۸۵ء میں انگلستان میں چند نامور حکماء نے ایک انجمن کی طرح ڈالی۔ اس کا نام ”سوسائٹی فار سائیکیکل ریسرچ“ (تھا۔

ان مشاہیر میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ سر ولیم بیرٹ

۲۔ پروفیسر سجویک

۳۔ ایف۔ ڈبلیو۔ ایچ، مارٹس

۴۔ ایڈمنڈ گری

۵۔ سر ولیم کروکس

۶۔ مراد لیور لاج

۷۔ جے۔ آر تھرہل

ان حکماء کی غرض یہ تھی کہ یہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ردحوں سے باتیں کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک حکیم مستند عالم کسی نہ کسی علم کا ہے، اور صاحب تصنیف بھی بڑے سوسائٹی نے کچھ سوالات مرتب کئے اور یورپ اور امریکہ میں شائع کئے۔ ان سوالات میں ہر ایک شخص کو دعوت دی گئی تھی کہ ردحوں کے بارہ میں اپنا مشاہدہ بیان کرے۔ جو جوابات موصول ہوئے ان کو ترتیب دے کر کئی جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ان پر تبصرہ ”مسٹر ہل“ نے لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”میرا مذہب نہ تو روحانیات ہے اور نہ مادیات اور نہ مجھے علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے

حکماء یورپ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ تا حال کسی علم سے جو آج تک معلوم ہو چکے ہیں ان کی توجیہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یا تو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ روحانیات کی دنیا مادیات سے الگ ہے اور اس کے قوانین بھی علاحدہ ہیں جن کا علم ہمیں نہیں۔ یا یہ بھی مادہ ہی کے خواص اور آثار ہیں، بہر حال جو کچھ بھی ہے ہم اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔ اور محض عدم واقفیت کوئی دلیل انکار کی نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) بھی کہ نہیں۔ لیکن سوسائٹی کی روئداد سے یہ ناقابل انکار حقیقت اتنی ضرور واضح ہوتی ہے کہ کچھ تو ہے اور واقعات بینہ کی توجیہ اس وقت تک کسی علم کی شاخ سے نہیں ہوتی مگر بعض واقعات ایسے ثقہ لوگوں نے بیان کئے جن کی نسبت یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دیدہ دانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ شاید ذہنی ارتقاء کے ساتھ کسی آئندہ زمانہ میں اس کی توجیہ تسلی بخش ہو جائے۔ ان میں سے دو باتیں ایسی ہیں جن کو حکماء نے تسلیم کر لیا ہے۔ ایک ”ٹیلی مپتھی“ (اور دوسری ”سب لینل سلف“)

(آخر الذکر دو لفظوں سے مرکب ہے ”سب“ بمعنی ”تحت“ اور ”لینل“ بمعنی ”دہلیز یا آستانہ“ اس کو تحت الشعور کہہ سکتے ہیں، اول الذکر کی مثال یہ ہے کہ آپ کا کوئی عزیز یا دوست آپ سے ہزاروں میل فاصلہ پر رہتا ہے کسی خاص تاریخ اور وقت پر آپ اس کو ایک خاص پوشش اور وضع میں خواب میں دیکھتے ہیں ایک خاص حادثہ آپ اس پر سے گذرتا ہوا دیکھتے ہیں یا وہ یہ حادثہ آپ سے بیان کر رہا ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور اسی وقت اور اسی مشاہدہ شدہ پوشش وغیرہ میں یہ حادثہ من وعن اس پر واقع ہوا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور آپ کے وہم و گمان میں بھی عزیز یا دوست کا خیال نہیں، لیکن عین بیداری میں یہ آپ کے کردہ میں داخل ہوتا ہے۔ آپ خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور وہ صورت فائز ہو جاتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور وقت پر آپ کا عزیز یا دوست رحلت کر گیا۔

تحت الشعور کے ضمن میں جو کچھ مسٹر بل نے لکھا ہے وہ ہمارے زمانہ میں علم نفسیات کا موضوع ہے، تجزیہ نفسیات پر ”فریڈے“ نے بہت بحث کی ہے مگر یہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰ کے نیچے)

بیتل

بیتل لکھتا ہے کہ :-

”وہ گاہی صاحب دلال از احوال بنا بر آنست کہ اجزائی آب بے غبار
موانع پیوستہ در یک دیگر می جوشند، و غفلت مقیدان بعنت این کہ
عنصر سنگ جز بحباب و افسردگی نمی کوشد، اگر یکسر آب حرکت دہند
بسر اسر و سئے دریا میدود، و اگر ہزار سنگ بر ہم کو بند پہلو با متاثر
جنبشہ نمی شود، آئینہ داران معنی صفا اگر از باطن کدورت طینتاں
نیز اسرار و اکشند بعید نیست، زیرا کہ جو ہر آب بقوت لطافت ہم سیاح
ساحت ہواست، و ہم غواص طبیعت نمار، در خانہ کہ آئینہ نصب
کرده باشند، ہر چہ در آن خانہ جلوہ نماید این جامرٹیت، و آنچه در
آنجا بعرض آید دریں مقام متجلی“

”اسمائی ظہور بانگ ناقوس دل است اشیا ہمہ اعتبار محسوس دل است“

”ہر ذرہ دریں دشت چراغی دارد یعنی این جمیع چشمہ جاسوس دل است“

”ہر چند آئینہ کمال ایل طائفہ بحکم وارستگی مثال گداز است، و آب ایل

چشمہ ہائی استغنا از بلند و پست امواج بے نیاز، اما جو ہر صفائی

آں یا لطیف در امتناع احوال خلایق ناچار است، و در افشائی،

رموز مستتر بے اختیار“

”آئینہ آہن ہم و گر نور صفاست عکس صورا است آنچه کہ در سہ پیدا است“

”سبیل تو ہمیں بصیقل دل پرداز کایں آئینہ چوں صاف شد اندیشہ نما است“

”تجلیہ عاقلانہ“ ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے وہ لکھتا ہے کہ تحت الشعور ہماری قوت ارادی بھی کام کرتی

ہے اور ہم عاقلانہ بھی بن جاتے ہیں۔ تحت الشعور ہم پر ایسے اہم انکشافات ہوتے ہیں جو بیداری میں

ہم نہ دیکھ سکتے ہیں۔ بیداری میں خواہ کتنی ”آمد“ ہو ”آورد“ سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن تحت

الشعور آمد ہی آمد ہے۔ ایک شاعر تحت الشعور اسی طرح شعر موزوں کرتا چلا جائیگا جس طرح بیداری

میں بے تکلف گفتگو کرتا ہے۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل دل کا تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب اس درجہ تک ہوتا ہے کہ جو کچھ آئینہ کے سامنے آئے اس کی صورت بعینہ اس میں رونما ہوتی ہے، اگرچہ ان حضرات کی وارستگی اور استغنا اس سے بالاتر ہے کہ لوگوں کے دلوں کے پوشیدہ حالات دریافت کریں لیکن ان کے آئینہ دل کی صفائی بالطبع بلا ارادہ ان حالات سے آگاہ ہوتی ہے جیسے آئینہ میں ہر ایک صورت جو بھی رو برو ہونظر آتی ہے۔ اسی طرح آئینہ قلب جب صاف ہو ”اندیشہ نما“ ہوتا ہے یعنی دوسروں کے خیالات کا عکس اس پر پڑتا ہے، اس ضمن میں بیکل نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صاحب دل کی مجلس میں چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے، حاضرین میں سے ایک کے دل میں یہ آیا کہ اگر یہ بزرگ صاحب کشف ہے تو میری خواہش انگور ہے ضرور عطا فرمائے گا۔ صاحب دل نے انگور منگوائے اور پیش کئے حاضرین کے دل میں یہ خیال آیا کہ مجمع میں اور آدمی بھی تو تھے صرف اسی ایک کے حال پر اتنی توجہ کیوں ہے، یہ دوسوہ بھی صاحب دل پر منکشف ہوا۔ فرمایا کہ اس شخص کے دل میں رغبت انگور تھی اور دل ہی دل میں چٹخارے لے رہا تھا، یہی کیفیت میرے دل میں بھی پیدا ہوئی۔ وقوعہ میں حرکت بمثال شخص مقابل است، نہ از خواہش ہائی آئینہ صافی منزل، ایں جا جمعے کہ بر بساط بے طلبی آرمیدہ اند، ارادہ دیگران را مراد خود فہمیدہ، کشف قلوب از معنی ہائی ایں عبارت ست و اشراق ضائر از مضامین ایں استعارت است“ جسے کشف قلوب کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ اہل دل کا آئینہ قلب خود تو صورتیں پیدا نہیں کرتا جو شے رو برو ہو اسی کی صورت ہوگی۔ اور یہ صورت اس شخص کی خواہشات اور ارادہ کی ہوگی جو مقابل ہے۔ بہر حال کشف احوال خواہ ارادتا ہو یا بلا ارادہ تصفیہ قلب پر موقوف ہے اور یہ تقوے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اہل دل کی مثال پانی کی ہے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان میں لطافت اس درجہ ہے کہ ہر ایک شے میں خواہ ہوا ہو یا جمادات نفوذ کرتے ہیں۔ جو لوگ اہل غفلت ہیں ان کی مثال پتھر کی سی ہے کہ شے سے مس نہیں ہوتے لیکن پانی کو ایک سرے سے حرکت دیا

بیدل

تو تمام اجزا متحرک ہوتے ہیں جو اہل صفا ہیں نہ صرف اہل صفا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ جو کدورت طینت لوگ ہیں ان کے باطن سے بھی باخبر ہوتے ہیں کیونکہ پانی، ہوا اور جمادات میں یکساں نفوذ کرتا ہے، مزید بحث مناسب مقام پر کی جائیگی۔ ۱۰۸۳ھ کا واقعہ ہے، بیدل دہلی میں تھا۔ ایک رات شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، اس حالت میں کہ پانی کا پیالہ بیدل کے ہاتھ میں تھا، دل میں آیا کہ پی جاؤں، آئین ادب و حیا نے پسند نہ کیا اس لئے پیالہ شاہ صاحب کے پیش کیا۔ آپ بے تکلف پی گئے۔

دوسری رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ کہ شاہ صاحب کے ہاتھ میں ساغر ہے اور شیشہ بغل میں، جس طرح مست ایک دوسرے کو پلاتے ہیں شاہ صاحب نے ساغر میرے پیش کیا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ ”اٹواراں محفل عصمت از آرائش و مینا معرا، و اوضاع آن انجمن تمکین از تہمت اسباب بے اعتدالی مبرا“، لیکن بحکم تسلیم میں نے قدح پر کینا اور پیش کیا، فرمایا کہ میرا دور پیمانہ کل رات ختم ہو گیا۔ اتنا اب تیری قسمت ہے جو تجھے دے رہا ہوں۔ ”بعد ازیں سرخوش قدح پیمائی شوق میباش، و دماغ اندیشہ بخار ہائی کدورت مخراش“

”سیرا میں میکہد ہنگامہ دورے دارد ہوش ہر کس قدم جادہ طورے دارد“
 ”ما گذشتیم ازیں ورطہ تو خود را در باب ہر گریباں سر کیفیت غورے دارد“
 ساقی اسرار نے چند ساغر پے در پے دئے، اسی عالم قدس میں میرے پاؤں مستوں کی طرح رٹکھڑانے لگے چنانچہ آج تک یہ نشہ نہیں اُترا۔

ان دو واقعات سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شہسوار میدان عزت اس وادی امکان کے غبار سے گزر گیا۔ تیسری رات عالم رڈیا میں مشاہدہ کیا کہ چاند نورانی صورتیں جمع ہیں، میں داخل ہوا تو سب مجھے کہنے لگے کیا ہی اچھا ہوا اگر شاہ صاحب کی رحلت کی تاریخ کہو میں نے فوراً کہا:

”ز بی تعینی ذات“ رفت نام ”صفت“ ۱۰۸۳ھ

سن کروجد میں آگئے اور کہا کہ الحق اس سے بڑھ کر لطیف تاریخ نہیں ہو سکتی، میں بیدار ہوا تو یہ مصرع صغہ خیال پر نقش تھا۔ طاہر الفاظ شمار کئے تو تحقیق واقعہ درست نہ تھی، ذرا غور کیا تو بطریق تعبیہ حساب اعداد موافق سال درست تھے۔ ”بی تعینی ذات“ کے اعداد ۱۶۵۳ ہیں اور ان میں سے صفت کے اعداد ۵۷۰ منفی کئے تو ۱۰۸۳ ہوا ہے۔

یہ واقعہ تو خواب میں رونما ہوا۔ چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اوڑیسہ میں کوئی خبر نہ ملی، حیران تھا۔ کبھی یہ شبہ گزرتا کہ شاید یہ محض وہم و خیال ہو۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات میں وہم عقل سے زیادہ پیش میں ہوتا ہے یعنی عواقب امور میں باہمہ شکوک زیادہ صاحب یقین ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی خیال آتا کہ ایک عمر ہم درس ملہم اسرار رہا ہوں اس قسم کی معانی کا وارد ہونا عالم خطا سے نہیں ہو سکتا۔ اور ایسے مضمون کا ظہور عبارت لغو نہیں ہو سکتی۔ آخر الامر چند دوست اوڑیسہ کی طرف سے آئے اور شاہ صاحب کی رحلت انہی ایام میں تحقیق ہوئی ناچار میں نے تاریخ پر چند مصرعے اور کہے :

کہ داشت ذات حقش ملک انتظام صفت	شہ سر پر یقین قاسم ہوا لہی
پرے نشانہ ز آشوب گاہ دام صفت	دماغ ہمت عنقا ئش رسائی کرد
تغافلے زدو برہم شکست جام صفت	حضور ذات مے شوق و حدش پیو د
رساند تا حدیث پے خرام صفت	بعافیت کدہ غیب برد شمع شہود
ز بی تعینی ذات رفت نام صفت	ز سالی واقعہ اش بنخودی بگو شمع گفت

یاد رہے کہ بیدل جیسا کہ ہم مناسب مقام پر واضح کریں گے ”ذات بحت“ کو منزہ از اسما و صفات کہتا ہے، یعنی ذات کسی نام یا صفت سے متعین یا مشخص نہیں ہو سکتی وہ بے تعین ہے، لیکن اسما و صفات جن سے ہم ذات کو معین اور مشخص کرتے ہیں یہ تعلق کائنات سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بحیثیت ذات بے تعین منزہ از صفات ہے اور بہ تعلق کائنات صفات سے مشخص ہوتا ہے، ذات

بیتل

”ایمپرسنل“ اور صفات ”پرسنل“ ہے۔ متکلمین نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے۔ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے۔

شاہ کابل | بیدل لکھتا ہے کہ میں اوڑیسہ تھا۔ ایک رات عالم افکار و غلبہ وجد میں بے اختیار یہ شعر میری زبان پر جاری ہو گیا۔

”از ہرچہ سرایت فرونی خود گوئی چہ گویت کہ چونی“

مصرع اولیٰ کا مفہوم وہی کچھ ہے جو شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ :

ای برتر از خیال و قیاس گمان و وہم وز ہرچہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بیایاں رسید عمر ماہچہناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

مصرع ثانی میں بیدل نے ایک بات پیدا کی ہے کہ جب یہ مسلم ہے کہ جو کچھ میں تیری حمد و ثنا میں کہوں تو اس سے بالاتر ہے تو یہ جاننے کے لئے کہ تو کیا ہے تیرے سوا اور کون بتا سکتا ہے، تو ہی اپنے آپ کو جانتے، غرض میں اس شعر کو حالت وجد میں تکرار کرتا رہا یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی ناگاہ الہام کدہ بے حرف و صوت سے یہ ندا سنی :

”از بابا ماست ہرچہ گویم ماہچہ توئی دگرچہ گویم“

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک شخص اپنے آپ کو جانتا ہے دوسرا شخص جو اس کا غیر ہے نہیں جان سکتا جب تک عین وہی شخص نہ بن جائے۔ اس لئے جو کچھ میں اپنی نسبت کہوں وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن بیدل نے اس شعر کی شرح خود ہی اس کے بعد ایک غزل میں کی ہے کہ :

”من آں شوقم کہ خود را در غبارِ خویش می جویم

رہے در جیب منزل کردہ ام ایجا دو می پویم“

میں وہ شوق ہوں کہ اپنے آپ کو نہ کہ کسی غیر کو اپنے ہی غبار میں ڈھونڈ

رہا ہوں، منزل کی جیب میں ایک راستہ ایجاد کیا ہے اور اسی پر چل رہا ہوں۔

یعنی جادہ و منزل دونوں میں آپ ہی ہوں یا دونوں مجھ سے باہر نہیں ہیں:

”بروں از رنگ و بو طرح بہار حیرتے دارم

دماغے می کشم در خون، گل تحقیق می بویم“

بہار کی رنگینی تو محسوس ہوتی ہے مگر میں اس عالم رنگ و بو سے باہر ”طرح

بہار حیرت“ رکھتا ہوں، خون سے دماغ رنگین کر رہا ہوں اور ”گل تحقیق“ پیدا کرتا ہوں، یعنی محسوسات سے جو صرف صورتیں ہیں الگ ہو کر میں اس حقیقت کی تلاش میں ہوں جو ان صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔

”نگہ درویدہ می دزدیم خیالے نقش می بندم

نفس در سینہ می کارم ہجوم نالہ می رویم“

میں نے نگاہ آنکھ کے پردہ میں چھپالی یعنی محسوسات کو نظر انداز کرتے

ہوئے اپنے باطن کی سیر کر رہا ہوں، میرا سانس بیرونی ہوا سے بے نیاز ہو کر

میرے سینہ ہی میں سرگرم عمل ہے اور ”ہجوم نالہ“ پیدا کر رہا ہے۔ یعنی میں عالم

تشبیہ یا محسوسات خارجی کے اسباب سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر اپنے

ہی دل میں وہ بات مشاہدہ کر رہا ہوں جو اصل حقیقت عالم شہادت کی ہے جسے

غیب کہتے ہیں۔ اور منزہ اسما و صفات سے ہے۔

”حدیث غیر تنزیہ دماغسم برنمیدارد

زبان و حدتم حرفے برائے خولیش می گویم“

تنزیہ کے سوا کسی بات کی برداشت میرے ذہن کو نہیں، میں وحدت

کی زبان ہوں، خود ہی کہتا اور خود ہی سنتا ہوں۔

”بچندیں اختلاف صورت و معنی من بیدل

جزا و دیگر چہ خواہم و انمود آئینہ اویم“

کائنات عالم کثرت ہے اس میں جتنی صورتیں اتنے ہی معانی بھی ہیں۔ لیکن

باہر اختلاف میں (بیدل، حقیقت نما آئینہ) ہوں جس میں اگرچہ صورتوں کی کثرت

بیدل

جلوہ گر ہے مگر ان میں حقیقت ایک ”وحدت“ ہے میں چونکہ اسی وحدت کا آئینہ ہوں اس لئے اسی حقیقت کو جلوہ دیتا ہوں، ”ما بچو توئی دگر چہ گویم“، آئینہ میں بھی وہی صورت حقیقت ہے جو آئینہ کے مقابل ہے، اس موضوع پر بیدل نے داد تحقیق اکثر اشعار میں دی ہے، مناسب مقام پر تشریح کی جائے گی۔

۱۰۷۶ھ کا واقعہ ہے کہ بیدل دہلی میں چند دوستوں کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجذوبوں کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک نے کہا کہ ان دنوں ایک مجذوب آیا ہوا ہے اس کا عجیب حال ہے۔ سیروں کھانے پینے کی چیزیں بے تکلف ہضم کر جاتا ہے اور اگر کچھ نہ ملے تو کئی ہفتے بے آب و نان پڑا رہتا ہے، کسی سے بات نہیں کرتا، جب کبھی زیارت کے لئے جانا ہوتا ہے اکثر اوقات لمبی تانے سویا ہوا پایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسے کابل میں دیکھا اس لئے آپ کو شاہ کابلی کہتے ہیں:

آں نشہ غیب فارغ از عرض ظہور از بسکہ تعینے ندارد منظور

جائے ہمہ ہوش است ندارد خبرے در جائے دگر بے خبر و جملہ شعور

وہ خود تو کسی سے بات کرتے نہیں اس لئے آپ کا نام وحسب و نسب کیسے

معلوم ہو۔ اب شاہ کابلی لوگوں نے نام رکھ دیا اسی نام سے مشہور ہیں:

مارا کہ علم است نہ معلوم شدن نے خواہش منشور نہ منظوم شدن

مضمون ظہوری بخیاں آمدہ است باید بزبان خلق موسوم شدن

اگر غور کیا جائے تو ہر ایک شخص زبان خلق ہی سے موسوم ہے۔ خود شناس

لاکھوں میں شاید ایک ہو اکثر اپنے آپ کو وہی کچھ سمجھتے ہیں جو لوگوں نے ان کے

دماغ میں ٹھونس رکھا ہے۔ اشیاء کائنات ہوں یا ذات باری تعالیٰ زبان خلق

سے ہی موسوم ہیں:

از و ہر چہ بگفتند از کم و بیش نشانے دادہ اند از دیدہ خویش

منزہ ذاتش از چند و چہ و چوں تعلقے شانہ عہما یقولون

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یک نعت شاہ کابلی نمودار ہوئے۔ سب سر و قد

تعلیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ مسکرا رہے تھے اور نگاہ میری جانب ہی تھی، اور میرے ہی پاس بیٹھ گئے۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا، کھانا پنا گیا۔ چند لقمے بھی نہ کھائے اور مجھ بے دست و پا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح شہر کے باہر اس مقام تک لائے جہاں بیٹھا کرتے تھے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں تو ادب و آداب کی وجہ سے چپکا بیٹھا منتظر تھا کہ شاہ صاحب کچھ فرمائیں اور شاہ صاحب خاموش۔

حق خاموش است باتو بصد رنگ گفتگو است شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجو است
موقوف اضطراب اگر نیست عرض راز گرداں ہی اشارہ تحقیق موبہ مست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خاموشیت ہر جا بہار ساز شود نفعہ رنگ بوست
عشق است چنگ و غزل میں چنگ بنواست دل شیشہ است و قلقل میں شیشہ بے گلوست
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست

نماز عصر سے شام اور شام کے بعد رات کا کچھ حصہ اسی طرح خاموش بیٹھے
بیٹھے گزر گیا۔ ناگاہ شاہ صاحب تہقہہ مار کر منہ اور وہی بیت جو عالم غیب سے اوڑھ لیا
میں میں نے سنا تھا کہ ”از ما با ماست ہر چہ گویم
ما بچو توئی دگر چہ گویم“

شاہ صاحب نے پڑھا۔ معاشقہ کر میرے حواس باختہ ہو گئے۔ آخر ضبط نہ
ہو سکا، پوچھا کہ یہ بیت کس کا ہے؟ پھر منہ اور کہا کہ میرا ہے، اس میں شبہ کی
کونسی بات ہے۔ اتنا کہا اور پاؤں دراز کئے اور کہا کہ ”ایں جاکشاد چشم غیر از حیرت
چیزے ندارد، باید خوابید“

”شور تعمیر ہوس گرد و دماغت بستہ نیست“ گوشہ امنی بغیر از چشم برہم بستہ نیست“
”عاقبت خواہی برف جرات نظارہ کوش“ بوئی راحت نیست تا مژگاں بہم پیوستہ نیست“
یہ بیداری کا کرشمہ ہے کہ ہوس کی عمارت کا شور و شغب دماغ میں بلند ہوتا ہے
آنکھیں موندھ لو تو گوشہ امن ہے آرام و آسائش تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب
پلک سے پلک ملتی رہے، آنکھیں کھلی ہوں تو نظارہ کثرت کب چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔

بیدل

شاہ صاحب تو سو گئے اور میں وہیں عالم حیرت میں بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ رات آخر ہونے کو تھی مجھ پر بھی خواب کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

شوخی کہ بہ بیزبانم افسوں کرد آمد بزباں وحیرتم افسوں کرد
حرفے کہ بہ پردہ خیالم می گفت بر رو آورده از خودم بیروں کرد
وہ شوخ جو چپکے چپکے مجھ پر جادو کر رہا تھا، بات کی اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، وہ بات جو میرے خیال ہی میں کہی تھی میرے منہ پر کہی اور میں آپے سے باہر ہو گیا۔

صبح ہوئی، آنکھ کھلی، میں تو وہیں تھا، مگر شاہ صاحب موجود نہ تھے، ادھر ادھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے، دہلی کی خاک کئی دن چھانٹا پھر نہ ملے، آخر تھک کر بیٹھ رہا۔
اں جلوہ غیب کایں تیرا راست ونگہ چونکہ ز پیش چشم برخواست
گر گویم خضر بود ترک ادب است آنجا کہ حق است خضر و الیاس کجاست
جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا وہ جلوہ غیب ہی تھا جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، پھر میرے دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ اگر کہوں کہ خضر تھا تو ترک ادب ہے۔ جہاں ”حق“ ہے وہاں خضر و الیاس کا کیا نہ کو رہے۔

دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ بیدل کو بھی ایک جگہ چین نہ تھا۔ موسم گرما کی شدت، آشوب چشم کا عارضہ، ”بند رابن“ سے گزر کر شہر متھرا میں پہنچا۔ بازار لگا ہوا تھا۔ دوکانوں میں سوائے جلس مرآت اور متاع ناشناسی سب کچھ تھا۔ بیدل چاہتا کہ کہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر سسٹلے، لیکن کوئی شناسا نہ ملا۔

حضور و حد تم جز در دل محرم نمی گنجم
چہ سماں داشت یارب شگاہ بے سربانی
میں مینائی تحقیق بطرف کم نمی گنجم
کہ من در ملک دل ہیچوں آنس یکدم نمی گنجم
ہشتم گر شود آئینہ چوں آدم نمی گنجم
گہے در صد محیط آغوش یک شبنم نمی گنجم

گئے زان رنگ میکا ہم کہ سر در ذرہ میدزدم گئے زان شوق می بالم کہ در خود ہم نمی گنجم
 چو گوہر دقت طعم بروں افکنده زیر دریا بخود گنجیدہ ام چند آنکہ در عالم نمی گنجم
 بیدل یگانہ روزگار تھا اس کی یکتائی کسی محرم راز وحدت کی تلاش میں تھی، کہ
 جہاں اس کی گنجائش ہو مینائی تحقیق کی شراب کسی کم ظرف میں کہاں رہ سکتی ہے۔ یہ
 وحشت جو میرے جنوں کی شکل و صورت گرد آلود رکھتی ہے اگر بہشت بھی پیش نظر ہو
 تو دہاں بھی آدم خاکی کی طرح میری گنجائش نہیں، کبھی تو ضعیف چیونٹی کی آنکھ میں سو
 آسمانوں کو گردش میں لاتا ہوں، اور کبھی سو سمندر بھی ہوں تو ایک قطرہ شبنم کے
 برابر میری ان میں گنجائش نہیں۔ کبھی تو اس وضع سے اتنا حقیر ہوتا ہوں کہ ایک ذرہ
 میں سما سکتا ہوں، کبھی شوق مجھے اتنا بڑا بنا دیتا ہے کہ اپنے آپ میں سما نہیں سکتا۔
 جس طرح دریا موتی کو باہر پھینک دیتا ہے اسی طرح اس بحرِ مستی سے میری دقت
 طبع مجھے باہر لے آئی میں اپنے آپ میں اتنا گنجان بن گیا ہوں کہ ایک عالم میں میری
 گنجائش نہیں ہے۔

اتفاقاً ایک رفوگر پر نظر پڑی، جس دوکان پر بیٹھا ہوا سوزن کاری کر رہا
 تھا اس کا متاع بھی اکیلا تھا: نگاہ کی طرح دیدہ تصور میں غیر کی گنجائش ہی نہ تھی،
 جب تک خود پہلو تہی نہ کرے کسی دوسرے کی اس میں سمائی نہ تھی مگر دیدہ سوزن
 میں رشتہ کی طرح مجھے بھی جگہ دی، اب مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں میں باخاطر
 نہ ہوں، میری گراں جانی اس کے پہلوئے اخلاق میں سوئی کی طرح ٹوٹ کر نہ رہ
 جائے:

بیک دور روزہ سرو برگ زندگی پسند کہ بہر خلق پے سود خور زیاں باشی
 اگر غبار شوی محو دامن خود باش چناں مباح کہ تشویش دیگران باشی
 ابھی ایک ساعت نہ گزری تھی کہ ایک شخص دوکان کے سامنے آیا۔ رفوگر
 کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ اگر تشریف رکھیں مجھے اٹھنے کی عزت بخشیں۔ اس نے
 کہا کہ نہیں یہ درمند میرا دوست ہے پرسش احوال چاہتا ہوں میں آنکھیں بند کئے

بیدل

بیٹھا تھا آواز سے شناسا معلوم ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شاہ کابلی رفوگر کی جگہ بیٹھے مسکرا رہے ہیں، میں آچھل پڑا۔ فرمایا کہ تھوڑی دیر سو رہو۔ عالم بخودی عین شعور ہے اور صحبت خواب آئینہ حضور، میں نے آنکھیں بند کیں اور نیند کا غلبہ اتنا ہوا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہی دوکان اور وہی رفوگر، شاہ کابلی غائب تھے، لیکن عارضہ چشم بالکل رفع ہو چکا تھا۔

آں طبیب افسون نیرنگی نمایاں کرد و رفت
در چشم را علاج از چشم حیراں کرد و رفت

حیران تھا کہ میرے حال پر اتنی التفات بھی ہے۔ اور درد دور ہی رہتے بھی ہیں، یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟ دو سال اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں میں عقد نکاح میں جکر ادا جا چکا تھا۔ اور آبائی پیشہ سپاہ گری بھی اختیار کر لیا، کہ سایہ تبغ ہی میں امان ملے۔

بدرفع چشم زخم خلق گمنامی فسوں دارد بروں تازا ز در شہرت کہ شہرت بلوئی خوں دارد
سلامت پیشہ را بنود بہ از دیوانگی کبے جنوں کن یا سپاہی شو سپاہی ہم جنوں دارد
وجہ معاش کی وجہ سے ایک گونہ مہولت اور اطمینان تو تھا مگر وہ دارستگی
کہاں جو تجربہ میں میسر تھی، آخر مجھ پر حقیقت کھلی نمحصہ تو ہم فقر و غنا سے نجات ملی اور یہ
منکشف ہوا کہ طلب مقصد بلا جہد ہمت سے دور ہے اور آرزوئے طلب کے ساتھ
بگرہ نج کو شمش پسند نہیں کرتا تو تیرے ہی فقر کا قصور ہے۔ جو کچھ تجھے دولت فقر
سے ملا تو نے گم نہ کیا کہ اس کے لئے زحمت جستجو کرنی پڑے۔ اور جو تیرے پاس تھا
دور نہیں گیا کہ اس کے پیچھے دوڑنا پڑے، ”صاحب لباس پیوستہ عریانی درغل
دارد، و شخص عریاں دامن کسوت بے سعی بدست نمی آرد“ پس فقر بہر حال
موجود ہے۔ اور غنا اکثر مقام میں مفقود ہے۔ ہمت کا تقاضا ہے کہ مشکلات پر کوشش
سے غالب آئے نہ آرزوئے تن آسانی۔ بیدل اس مقام پر فقر و غنا پر بحث کرتا
ہے کہ :

ای تحیر بعت بزم فنا
اعتبارات جہاں عز و قر
گزشتی فقر باشد مدعا
عرض قدرت خارج اسباب نیست
ذات موسوم است بے ساز صفات
فرصتی خواہد ای بے معرفت
یک سامان صفت چوں بر رنگ
اوبصد قدرت صفت پیدا کند
نماک را یک عمر باید خورد خوں
شاخ و برگ آندم کہ خواہد رختن
رشتہ با موم باید جمع کرد
شمع گر صد شعلہ بر تو افکن است
ایں بمر عرض غنائے پیش و پس
مدعا ایں است کہ ہر وہم وطن
خاصہ اسبابے کہ بے درد مہرت
فقرت از سیر گریباں جاہل ست
گر باسانی شود اسباب جمع
بے تردد جمع اسباب معاش
در معیشت مایہ عیش تو بس
از تردد ہر چہ یابی کلفت است
کو غنا کو فقر ای غنا فل توئی

چند باشی منکر وضع غنا
جمع اسباب است بے ترتیب فقر
جلوہ بیرون عدم تا ز دچرا
شوخی طوفان بیرون آب نیست
پس غنا با وصف باشند فقر ذات
تا براید ذات در رنگ صفت
بہر معدومی غمی خواہد در رنگ
ایں بیک تغیر ذات انشا کند
تا برنگ شاخ و برگ آید ہر وہم
نیست دشوارش بخاک آمیختن
تا شرارے را توانی شمع کرد
چوں خمنش خواہی نفس ہم ام ہست
تا تنہا فل کردہ فقر است و بس
ربط اسباب غنا بہ ہم وزن
اتفاق آوردہ باشد در برت
وین غنا بے جمع اشیا مشکل ست
تیرگی در خانہ باید نور شمع
خوش تراست از کسب فقر بے تلاش
آنقدر جہد یکہ نتوان زد نفس
گر ہمہ خواب است خصم راحت است
مفت یکتائی ست اظہار دوی

ان ابیات کا مفہوم یہ ہے جسے مولانا جامی نے اپنے شیخ طریقت خواجہ

عبید اللہ احرار کے وصف میں لکھا ہے کہ :

بیدل

جو فقر اندر لباس شاہی آمد ز تدبیر عبید اللہی آمد
 بیدل کے ابیات میں ایک خاص بات ہے فقر بلا غنا اور غنا بلا فقر ایسا ہی
 ہے جیسے ایک شخص مادر زاد رنگا ہو یا لباس ہو مگر کسی کے بدن پر نہ ہو۔ وہ عریانی
 کی پوشش ہے۔ خواہ جسم عریاں ہو آخر جسم ہے۔ محض لباس اگر جسم کی پوشش اور
 زینت نہ ہو بے معنی ہے۔ اس لئے فقر تو بہر حال مقدم اور مقصود تحقیقی ہے ”فقر“
 کے معنی لغوی زمین شور ہے جس میں کچھ پیدا نہ ہو، اصطلاح میں احتیاج اس کا مفہوم
 ہے ”اللہ غنی وانتم الفقراء“ غنی تو اللہ ہی ہے۔ انسان تو پیدائشی فقیر ہے۔
 جو کچھ دیا ہوا ہے اللہ ہی کا دیا ہے۔ اس پیدائشی احتیاج کو بقدر ضرورت رفع
 کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مناسب اسباب بھی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ جمع ہوں تو احتیاج
 رفع ہو جاتی ہے اس لئے وہ اسباب جو احتیاج رفع کرتے ہیں ”غنا“ سے موسوم
 ہیں۔ بیدل استدلال یہ کرتا ہے کہ اگر ہستی کا مدعا محض فقر ہی ہوتا تو ”جلوہ بیرون
 عدم تازہ چرا“ تو عدم سے ہستی کا ظہور ہی کیوں ہوتا۔ اور یہ اسباب غنا جو رفع
 احتیاج ہیں پیدا ہی کیوں ہوتے آخر ان کی کچھ غرض اور مقصد بھی ہونا چاہئے ورنہ
 یہ کائنات ہی باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدرت الہیہ کا ظہور انہی اسباب سے
 ہوا ہے۔ دریا میں پانی تو ہے لیکن شوخی طوفاں بھی اسی میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر
 یہ ساکن ہی رہے تو شوخی طلاطم کیوں ہو، بیدل نے اسی ضمن میں ایک اہم مسئلہ
 کو حل کیلئے جو ہمیشہ بحث کا موضوع رہا، یعنی:

ذات مہوم است بے ساز صفتا پس غنا یا وصف باشند فقر ذات
 یہ متکلمین اور تصوف کا دقیق مسئلہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذات صفات سے
 منزہ ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارے فہم کی رسائی ہے ہستی مطلق یا ذات باری تعالیٰ
 مہوم ہوتی اگر صفات نہ ہوتی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ فقر ذات کا وصف غنا ہے، اسی
 وصف اسی صفات سے ہم نے اتنا سمجھ لیا کہ ”ہست“ وہ واجب الوجود ہے۔ اب
 زیر بحث فقر و غنا کے ضمن میں ذات و صفات ہیں۔ ذات بے صفات عریاں ہے

صفات بے ذات وہی جسم اور لباس کی مثال ہے۔ غلط فہمی نہ پیدا کرنی چاہئے۔ یہ مثالیں فہم تفہیم کے لئے ہیں۔

ادبرون از وہم و قال و قیل من
خاک برفرق من و تمشیل من
(عارف رومی)

ذات کو بھی رنگ صفت کے ظہور کے لئے عرصہ درکار ہے۔ لیکن یہ سامان صفات بجلی کی سرعت کی طرح معدوم ہو جاتا ہے۔ مٹی ایک عمر میں خون جگر پی کر شاخ و برگ کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے لیکن شاخ لٹ جاتی ہے اور پتے جھڑ جاتے ہیں تو مٹی میں مٹی ہوتے دیر نہیں لگتی۔ دھاگہ اور موم جمع ہوں تو ایک شعلہ شمع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دھاگہ اور موم کو بننے میں کافی عرصہ چاہئے لیکن ایک پھونک شمع گل کرنے کے لئے کافی ہے، یہ تمام اسباب غنا جو تو اپنے آگے پیچھے دیکھ رہا ہے اگر تو ان سے تغافل بیتے تو فقر ہی فقر ہے۔ اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ یہ ربط جو اسباب غنا میں ہے تو اسے توڑ پھوڑ کرنے رکھ، لیکن یہ بھی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان اسباب کی فراہمی کے لئے کچھ تردد کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ”آزار“ ہے۔

”مدعا از ہستی ما بس ہمیں آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود“

یہ شعر اسی بیت کے ہم معنی ہے کہ :

”گر ز ہستی فقر باشد مدعا جلوہ بیرون عدم تازد چرا“

لیکن ہر ایک کوشش کی ایک حد ہے۔ اسباب غنا سے بقدر ضرورت ہی لینا چاہئے۔ اور اس کو مقصد بالذات نہ سمجھنا چاہئے۔ نفس انسانی ”کثرت“ پسند ہے، اور فراہمی کثرت کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ کثرت مال، کثرت اولاد، غرض کثرت کی طلب جو ضرورت سے زیادہ ہے مذموم طمع ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ مادر کار داریم اکثری و بر کار نیست

بیدل

یہ شعر اس بیت کی شرح ہے کہ:

”در معیشت مایہ عیش تو بس

آنقدر بہدیکہ نتوان زد نفس“

اتنی دوڑ دھوپ کہ سانس پھول جائے اور آخر ٹوٹ کر رہ جائے۔ اصل مقصد فوت ہو جانا ہے۔ اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، یہ اخلاقاً مذموم ہے۔

بیدل لکھتا ہے کہ جب یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

”کو غنا کو فقر اسی غافل توئی

مغت یکتائی ست اظہار دوئی“

تو مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے ہوس سے کنارہ کیا۔

در خموری دستی نزد م بیرون عدم ساغر ہستی نزد م

تاپوں گرہ شش جہت مساوی نمود خورشید صفت بہ پستی نزد م

میں نے خموری اور مستی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، عدم سے باہر میں ساغر

ہستی سے سرشار نہیں ہوا۔ یعنی اتنا بدمست نہیں ہوا کہ اپنی اصل حقیقت کو بھول

جاتا۔ جب تک گرہ کی طرح شش جہت میں توازن مساوی نہ ہوا سورج کی طرح پستی

کی طرف توجہ نہ کی۔ یہ تو لفظی ترجمہ ہے، مفہوم یہ ہے کہ ”تعدیل بہرامر کمال عرفا ست“

سورج شش جہت مساوی روشن کرتا ہے، سورج تو بلند مقام پر ہے اور اپنی

بلندی مرتبہ سے نیچے نہیں آتا اس لئے کہ شش جہت کو مساوی درجہ پر دکھتا ہے، اگر

یہ میزان عدل کائنات میں نہ ہوتی تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ اسی طرح ہمارے

نظام معاشرت میں اگر تقسیم معیشت مساوی نہ ہو تو توازن قائم نہ رہے گا اور فتنہ و

فساد شش جہت میں رونما ہوگا اور ہوتا ہے۔

ایک دن میں گھوڑے پر سوار دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا، دیر سے دیکھا کہ کچھ

آدنی جمع ہیں اور سب میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ گھوڑے کو ایڑی دی کہ نزدیک

ہو کر دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیوں میں ہی ان کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہوں۔

جب نزدیک آیا۔ ایک شخص کو کہتے سنا کہ یارو دیکھو دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑتا رقص کرتا آرہا ہے۔ میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو شاہ کا بلی تھے، ایک عالم بخودی میں میں گھوڑے سے نیچے اُترا، اور شاہ صاحب کی طرف سایہ کی طرح جھکا، کمال شفقت سے مجھے گلے لگایا۔

تا دو چار ناز گرداں نرگس مستانہ ام شوق جوشے زد کہ می پنداشتہ منجانہ ام
یار شد بے پردہ دیگر تاب خود داری کراستہ ای نیتقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام
قریب ہی ایک دوکان خالی تھی اس کے گوشہ میں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ جو کچھ گفتگو اس وقت دونوں میں ہوئی اس کا آغاز تو بیدل نے اپنی موجودہ حالت خانہ داری سے کیا کہ ”تخم تجر دبریشہ تاہل تیندہ است و بہار آزادی بشاخ و برگ تعلق گردیدہ، اما نسیم گلشن بایں رواج مخبر است، کہ نہال یکتائیم، با بیاری نیرنگ علائق ثمری کہ عبارت از نتائج باشد، نخواہد بست تا آن قدر بار خاطر تواند گردید، حدیقہ بے تقسیم باغبانی او ہام، اسباب شگونہ دوزنگی نخواہد آورد، تا میں ہمہ تشویش و بستی تو اں کشید“ یعنی بظاہر اب تو میں امور خانہ داری کے جھیلے میں الجھا ہوا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنا نہیں کہ مجھے اتنا بھی شعور نہ رہے کہ یہ برگ و بار علائق دنیوی میرے نہال یکتائی کو مجھ سے پوشیدہ کر دیں، فرمایا کہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے سمجھا ہے، ہم ”لم یکن لہ کفواً احد“ کے افراد ہیں؛

مانشہ مختصم در بزم تفرید فارغ ز خیال صاف و در تقید
بوی ز بہار رنگ رویم بر است زیں پیش نمیتواں با عیاں جوشید
اسی موضوع گفتگو سے شاہ صاحب نے تصوف کے اہم نکات بیان فرمائے۔
ماروح مجسم و غیب مشہود یعنی عدمیم سحر پرداز نمود
چوں آب و ہوا علے زندہ ہوا چوں حیح و بخار خلقت از ماموژ
یہ تو ایک طویل اور دقیق بحث ہے، سردست ہم بیدل کے سوانح حیات

بیدل

لکھ رہے ہیں آخر گفتگو میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ”جیسے ہم عالم کہتے ہیں وہ صفوہ دل کا مطالعہ ہی ہے اور جنہیں ہم اشیاء سمجھتے ہیں وہ سطرنگاہ ہے جو تحریر ہو رہی ہے، دل اجتماع کیفیت علوم ہے، اور علوم اور اکات معانی نامفہوم، اپنی طرف سے وسوسہ پیدا کرنا بھی ایک صفت ہے اور اوہام کو نشوونما دینا بھی قدرت ہے، وادی ظہور میں تلاش کسب غیریت ہے نہ اظہار غیبت، جہاں تک ہو سکے ”در لباس کوش و ناممکن است در خود پوش“

باشوخی لباس ہماں سرچیب باش در عالم شہود ز مردان غیب باش
ناز حقیقہ ست نیاز مجاز ما یک چند شوق موسیٰ و درد شعیب باش
ہنگامہ خیال دوئی گرم کردہ ایم مائیم و عرض آئینہ گو جلوہ غیب باش
صفت بے ذات خود نما ہو تو معدوم ہے۔ اور ذات بے صفت موهوم،
کسی شے کی نمود و متصور نہیں ہو سکتی، جہاں کہیں ہم صفات سے موسوم نہیں
ذات ہیں، اور جہاں اسما سے مشخص ہیں صفات ہیں۔

شاہ صاحب کی باتیں میں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا، مجھ پر ایک
بیخودی سی طاری تھی، جب ہوش میں آیا شاہ صاحب کو موجود نہ پایا۔
دلدار رفت و بیخودیم در کنار ماند مثال جست و آئینہ حیرت شکار ماند
مژگاں نبرد صوفیہ آغوشے از وصال آخر نصیب دیدہ ہماں افتار ماند
اس واقعہ کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے میں ابھی تک اسی ساغر کے
خیال میں مست ہوں۔

چہار عنصر میں بیدل نے جو بھی واقعات لکھے ہیں ان کو خرقِ عادت
ہی کہنا چاہئے، لیکن بیدل ہر ایک واقعہ پر حکیمانہ بحث بھی کرتا ہے، درست
ہم واقعات معربان کرتے ہیں اور مختصر بحث بھی بیدل کے ہی لفظوں میں لکھتے
ہیں۔

بیدل پر ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ نان شبیہ تک محتاج تھا۔ یہ

واقعہ اکبر آباد میں رونما ہوا۔ خود لکھتا ہے کہ اس مقام میں جو کچھ اسباب معاش تھا ختم ہو گیا۔ اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ جب بھوک نے سخت تنگ کیا نہ معلوم کیا جی میں آیا کہ بازار میں کل آیا۔ ”شرم افلاس از ہر جنس چشم می پوشید و خجالت بیدری از ہر متاع داغ می خرید“ بازار میں ہر ایک قسم کی چیزیں اکل و شرب کی موجود ہوتی ہیں۔ لیکن افلاس کا بُرا ہونا مارے شرم کے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھ سکا۔ جیب میں پیسہ ہو تو کسی شے کی خریداری کا حوصلہ ہو۔ خجالت بیدری کی وجہ سے ہر ایک چیز سے داغ حسرت ہی خرید کر سکتا تھا۔ میری وضع ایسی نہ تھی کہ کوئی محتاج تصور کر کے کچھ دیتا۔ اور نہ میری غیرت گوارا کرتی تھی کہ آشنا و بیگانہ میری موجودہ حالت سے واقف ہو۔ منعم حقیقی نے استغنا میرے مزاج میں اس حد تک پیدا کر رکھا تھا کہ میں کسی حالت میں اپنے آپ کو اس کے غیر کا محتاج نہیں سمجھتا تھا۔

جز حق سوئی ہر کہ حاجت بست احرام پیش آیت میں چار غم یاں انجام
 ننگ کم ہمتی، و تشویش سوال رسوائی احتیاج، و نو میدی کام
 میں بازار گزر کر دریا کی طرف گیا۔ دو گھونٹ پانی پیا کہ شاید حرارت سے
 معدہ کو کچھ تسکین ہو۔ مگر اس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ غرض اسی حالت میں
 پھر لوٹا جب میں ”مدار و روازہ“ کے قریب آیا، سر جکرایا، گرنے کو تھا، کہ
 پیشاب کے بہانہ ایک دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ استنجا کے قصد سے دیوار کو
 ناخنوں سے کریدنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک سنگ ریزہ آیا۔ دیکھا تو دور
 اکبری کا ایک سنگ تھا جو وزن میں عہد عالمگیری کے پانچ سکوں کے برابر
 تھے۔ سبحان اللہ! کس وقت سے بیدل کے احتیاج کا انتظار کر رہا تھا۔
 عالم غیب سے جو کچھ عطا ہوا اس نے سر دست میرا اضطراب تشویش رفع کر دیا۔
 اور ایک مدت تک میری قناعت کا دستگاہ سرمایہ رہا۔

مدت شکر کہ احتیاج کوشش تعلیم آگاہم کہ دوا خراز فضل کریم

بیدل

ہرچند بدیوار رجوع آوردم دستم نرسید جز بداماں کریم
اللہ تعالیٰ کے احسان و انعام و کرم و عنایت کا شمار و بیان کرنا ایسا
ہی ہے جیسے شعاع آفتاب کی ترجمانی ایک ذرہ کرے۔

جس سال شاہ جہان کی بیماری کی خبر سلطنت کے طول و عرض میں مشہور
ہوئی بیدل مرزا عبداللطیف کے ہمراہ تھا جو مرزا قلندر غم بیدل کے
رشتہ داروں میں سے تھا۔ مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج کا سر
لشکر ہی تھا۔ شاہ شجاع نے ”بیماری پدر سکتہ مضمون سلطنت اندیشہ“
اور وہ جنوں سر پر سوار ہوا کہ پایہ تخت دہلی کی طرف فوج کشی کی، بنگالہ سے
سرحد مالک بہار تک سپاہ پھیلا دی، تمام راجے اور جاگیردار فرمانبردار
ہی نظر آئے۔ اور سپاہ کا دل بھی بڑھا ہوا تھا۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ اورنگ
زیب عالمگیر نے دہلی کی فرمانروائی کے لئے پیش قدمی کرتے ہوئے پیش دستی
کی ”و حقوق خدمت پدرش پیش از دیگران بجا آوردہ“ سواد الہ آباد میں
اس کے موکب اقبال نے ”ادبار بر شوکت شجاع ریخت“ ہزاروں میدان
جنگ میں کھیت رہے۔ شاہ شجاع تو ورطہ ہلاکت سے نکل کر جان بچا کر
بھاگا۔ مگر عالمگیری لشکر تعاقب میں تھا۔ ہرچند مرزا عبداللطیف نے کوشش کی
کہ کہیں پرچم کو مقابلہ کیا جائے مگر بے سرفوج کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اس لئے
خیریت اسی میں دیکھی کہ کسی طرف کنارہ کر جائے۔ ایک جماعت کے ساتھ دس
روزہ مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر اس آباد پٹنہ میں پہنچے۔ ایک روز
بمقام ”چاند چور“ خیمے استادہ تھے اور ہمراہی ادھر ادھر نظر دوڑا رہے تھے،
ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا۔ دوپہر سے ایک تل سفید نظر پڑا۔ لیکن سمجھ میں
نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ ہماری جماعت میں سے سرمست خاں اور مبارز خاں
اور میں تینوں سوار ہو کر تفتیش حالات کے لئے ادھر گئے۔ ایک احاطہ باغ
دیکھا۔ اس کے چاروں طرف طواف کیا، دروازہ میں داخل ہوئے، اس میں

دو بنگلے تھے اور درمیان ایک تالاب تھا۔ ہم نے اور گھوڑوں نے پانی پیا، اب خیال آیا کہ واپس لوٹیں، ادھر ادھر جا سو ساناہ نظر کی تو دیکھا کہ تالاب کے دوسرے کنارہ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں تو کسی متنفّس کا نشان نہیں یہ دھواں کس آتش کدہ سے اُٹھ رہا ہے۔ چونکہ ایسے مقام میں خوف بھی تھا اس لئے تلواریں نیام سے نکال لیں آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک حجرہ زمین دوز ہے، اتنے میں ایک پری زاد پر نظر پڑی، کہ فرش پر بیٹھی ہوئی ہے، اپنے چہرہ آتشیں کے سامنے آگ جلا رکھی ہے، اور حقہ پی رہی ہے، چہرہ سے کچھ وحشت ٹپکتی ہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خرمین حُسن پر کسی کے عشق کی بجلی گری تھی، لباس سے عطر کی خوشبو نے فضاء معطر کر رکھی تھی۔ قصہ حُسن تھا جو لباس عشق میں محبوب تھا۔ میں نے ذرا جرات پر سسش احوال کی، بے دماغانہ دیکھا، گویا بجلی کو ند گئی، اس کی گردش چشم سے لڑکھڑا کر گرا۔ آخر ایک اضطراب کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہا، ناگاہ اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور دل سے ایک آہ کھینچی اور یہ بیت پڑھی:

ساہبا در طلب روی نکو در بدر ایم

روی بنما و خلاصم کن ازیں در بدری

تھوڑی دیر کے بعد حقہ ہاتھ میں لئے حجرہ سے باہر آئی اور بنگلہ کی طرف خراماں خراماں گئی، میں بھی پیچھے ہو لیا۔ صدر بنگلہ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی مثال آئینہ مقابل بیٹھ گیا۔ اس کی زبان پر اگر کوئی حرف آتا تھا تو وہی بیت تکرار ہو رہی تھی، ناگاہ پھر گردش چشم میری طرف ہوئی۔ نگاہیں خنجر تھیں کہ میں تاب نہ ناسکا۔ جب ذرا ہوش درست ہوئے تو ان دونوں جوان مرد ہمارا ہیوں کو قریب بیٹھا دیکھا لکڑوہ عجمہ حُسن غائب تھا۔ مجھ پر پھر بے ہوشی طاری ہوئی۔ جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ مرزا عبداللطیف بہت پریشان ہو رہا تھا کہ اتنی دیر ہوئی تینوں میں سے کوئی واپس نہ لوٹا۔ آدمی تلاش میں بھیجے۔ حالانکہ

بیدل

فاصلہ ایک کوس کا تھا مگر وہ ادھر ادھر خاک چھانتے رہے۔ آخر اس مقام پر پہنچے جہاں میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے اٹھا کر لائے۔ میری زبان سے وہی شعر بار بار جاری تھا۔ مرزا نے علاج کیا، آخر خدا خدا کر کے حواس بجا ہوئے۔ میرے ہمراہیوں کا خیال تھا کہ یہ مقام آسیب زدہ تھا۔ مگر انھوں نے کچھ نہ دیکھا۔ ایسے مشاہدات کا انکار تو نہیں ہو سکتا، کئی ثقہ لوگ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بعض مقامات پر جہاں کبھی جنگ ہوئی شور و غل کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ”گراموفون“ میں آواز کا نقش ثبت ہو جاتا ہے اسی طرح بعض واقعات کے نقوش بھی قائم رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سائنس اور بالخصوص علم النفس کی ترقی کے بعد ان واقعات کی علمی توجیہ بھی تسلی بخش کسی وقت ہو جائے۔ سردست ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔

چوبشروی سخن اہل دل گو کہ خطاست

سخن شناس نہ دیر اخطا میں جاست

لیکن وہ واقعات جو بیدل بیان کرتا ہے ان کے مشاہدہ کرنے والا ہر ایک دیکھو دل نہیں ہوتا، عارف رومی کہتا ہے:

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل

بیدل کا ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ ”ہر نقشہ کہ می بینی حرفیت کہ می شلوی“ اشیاء کے خواص ہمیں کیسے معلوم ہوتے اگر وہ خود ہی نہ بتائیں، اس تماشا گاہ عالم میں یہی چلتی پھرتی منہ بولتی تصویریں نقوش حیرت میں جو آئینہ دل پر چھوڑ جاتی ہیں۔

۱۰۷۰ھ کا واقعہ ہے کہ مرزا قلیندر بنگالہ میں سفر کر رہا تھا، اسباب علائق

قصہ ”مہسی“ میں چھوڑ آیا تھا، یہ قصہ آن روئے دریا گنگ ”پٹنہ“ سے بیس

کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وہ ایام ہیں جب شاہ شجاع آوارہ دشت ادبار ہو رہا تھا اور بادشاہ عالمگیر کا اقتدار ممالک ہند پر چھا رہا تھا، بد نظمی اور بد امنی کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں جبکہ یہ حالات تھے سفر کرنا جان کو خطرہ میں ڈالتا تھا بالخصوص دیہات سے گزرنا سخت مشکل کا سامنا تھا۔ مرزا قلندر نے مجھے قصہ ”مہسی“ سے اسباب لانے کے لئے بھیجا، ایک خادم ساتھ کر لیا۔ میں پیدل سفر کرنے کا عادی نہ تھا۔ پہلے ہی دن دریا کے اس طرف تین کوس چلا تھا کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور تکان اس شدت سے محسوس کی کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ہر چند نو کرنے راستہ کے خطرہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حوصلہ افزا باتیں کیں، پاؤں دابے، آخر اٹھنا ہی پڑا۔ دوپہر کے بعد رات کا کچھ حصہ سر میں کٹا اور صرف دو کوس کا فاصلہ طے ہوا۔ ”ہم جمنپور“ پہنچے، دن بھر کی کوفت کی وجہ سے آتے ہی سو گیا۔ صبح اٹھا تو کوئی اثر کوفت کا باقی نہ تھا، مگر مناسب یہی خیال کیا کہ کوئی کرایہ کا ٹٹول جائے تو سفر بسہولت طے ہو جس سے دریافت کیا اس نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ موجود حالات میں کون خطرہ مول لے۔ ناچار پھر پیادہ چل پڑا۔ تین کوس چلا تھا کہ گرمی کی شدت نے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ آفتاب سر پر غضب آلود شعاعیں برس رہا تھا، دور سے ایک درخت نظر پڑا یہاں پہنچ کر اس کے سایہ میں دم لیا۔ آفتاب حد زوال سے گزر گیا۔ اور ہوا میں گرمی بھی اعتدال پر آرہی تھی ہمت کر کے پھر اٹھا تو سہی مگر وہی پہلے دن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہیں بیٹھ گیا۔ خادم بیچارہ بھی بحکم تسلیم خاموش رہا۔ اب ہم دونوں شام کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی ایک پہر دن باقی تھا کہ میں نے دیکھا، کہ ایک نحیف منحنی بوڑھا ایک گھوڑی بچہ دار پر سوار ہماری طرف آرہا ہے۔ ایک لڑکا لکڑی ہاتھ میں لئے ہم رکاب ہے۔ نزدیک آیا تو نہایت تپاک سے ملا۔ اور کہا کہ ان وقتوں میں پیادہ پا سفر کرنا آپ جلیسوں کا کام نہیں۔

بیدل

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اس بے تکلفی اور گرم جوشی سے ملنا کسی ناواقف سے بعید ہے۔ حافظہ پر بہت زور دیا مگر دیدہ تصور میں کوئی ایسی شناسا صورت سامنے نہ آئی۔ مسکراتے ہوئے کہا کہ شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں جان محمد ہوں۔ قصبہ مہسی میں خواجہ شاہ محمد کا ملازم ہوں جس کا مکان مرزا قلندر کی ہمسائیگی میں دیوار بدیوار ہے۔ خواجہ صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ دریاء گنگ سے آپ کو قصبہ میں لاؤں، مگر آپ نہ ملے، میں لوٹ آیا، اچھا ہوا کہ آپ یہاں مل گئے۔ یہ گھوڑی حاضر ہے۔ آپ سوار ہوں میں ہمرکاب چلوں گا۔ میں نے انصاف سے بعید خیال کیا کہ میں باوجود جوانی سوار اور یہ ضعیف بوڑھا پیدل چلے۔ اور تو کچھ عذر نہ تھا، میں نے کہا کہ اس درخت کے سایہ میں کچھ دیر آرام بھی غنیمت ہے۔ آپ سوار ہو کر آگے چلیں، میں بھی آپ کے نقش قدم پر آپ سے آملوں گا۔ اور استنجا کے بہانہ سے اُٹھ کر ایک طرف چلا گیا جب واپس آیا تو لڑکا گھوڑی کی لگام تھامے اسی جگہ کھڑا تھا مگر وہ پیر باد یا دہاں سے چلا گیا تھا۔ ناچار میں سوار ہوا۔ نماز شام کا وقت تھا کہ تین کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سرا میں جو راستہ میں پڑتی تھی پہنچے۔ وہ بوڑھا پہلے ہی یہاں موجود تھا۔ میں نے بہت معذرت کی اور اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگا کہ نوکروں کا کیا احسان اگر میں آپ کو مذہب نہ پاتا، تو ہمرکاب ہی چلتا۔ بہر حال رات یہاں ہی ٹھہریے۔ آرام و آسائش کا ہر ممکن سامان موجود ہے۔ اتنا کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر سترخان پر کھانا چنایا تو میں نے کہا کہ بھئی ہمارے پیر طریقت کو بھی تو بلواؤ، تلاش کے بعد بھی نہ ملا۔ رات آرام سے میٹھی نیند سویا۔ صبح اُٹھا تو وہی لڑکا گھوڑی لئے سرا پر حاضر تھا۔ کہنے لگا کہ نزدیک ہی قصبہ ہے۔ اور یہ سرا اسی کے مضافات میں واقع ہے، میں اور بوڑھے میاں رات وہاں رہے۔ مجھے یہاں آپ کی خدمت میں بھیجا اور آپ علی الصبح ہی قصبہ مہسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ آپ جس وقت

چاہیں سوار ہوں میں حاضر ہوں، لیکن وہ آپ کو راستہ میں نہ ملے گا۔ میں سوار ہو کر چل پڑا۔ نو کوس کا سفر تھا، عصر کے وقت مہسی میں خواجہ شاہ محمد کے مکان پر پہنچا تو پیر مرد وہاں دروازہ پر منتظر پایا۔ گھوڑی تو رط کے حوالہ کی اور بار بار شکریہ ادا کرتا رہا وہ انکسار اور ندامت سے جواب دیتا رہا۔ آخر رخصت چاہی، میں اپنے گھر پر آیا۔ دوسرے روز خواجہ صاحب کے بیٹوں کو اطلاع ہوئی تو برسمِ قدیم ملاقات کے لئے آئے میں نے بوڑھے کا ذکر چھیڑ دیا کہ بہت با اخلاق آدمی ہے۔ وہ حیران ہوئے اور کہا کہ اس نام اور علیہ کا آدمی تو آج تک ہم نے دیکھا تک نہیں، اب میری حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔

”تصور جو ہر آگاہی قدرت کجا دارد

بہار فضل آنسوی تعقل رنگ با دارد“

قدرت کے کرشموں کی نیرنگیاں ایسی نہیں کہ ہم عقلاً ان کی کنت تک پہنچیں، ماننا پڑتا ہے کہ عقل سے پرے بہار فضلِ خدا کی رنگینیاں بھی ہیں۔

”نہال آید بروں تخمے کہ بنشانند در خاکش
درین لوی زیبا افتادن، ایجاد عصا دارد“

ایک بیج سے درخت نشوونما پاتا ہے جسے قضا و قدر مٹی میں گاڑ دیتی ہے، اس وادی امکان میں جو پاؤں سے نہیں چل سکتے ان کو بھی سہارے کے لئے عصا مل جاتا ہے۔

”ندید از آبلہ ریگ رواں منع جنوں تازے

بہ نومیدی ز پانٹشیں کہ ہر واما ندہ پا دارد“

پاؤں میں خواہ چھالے پڑ گئے ہوں۔ ریگ رواں کسی جنوں تاز کی مانع رفتار نہیں، تو مایوس ہو کر پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ رہ، ہر ماندہ و در ماندہ کو بھی چلنے کے لئے پاؤں خدا کے فضل و کرم سے مل ہی جاتے ہیں۔

بیدل

”بگردوں میرد نظارہ را و اماندن مرگان
مشو غافل ز پروازے کہ بال نار سادارد“
آنکھیں کھلی ہوں تو ایک نگاہ بے دست و پا نظارہ کو آسمان
تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ سمک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا
جسے تو سمجھتا ہے دور تر ہے قریب راہ دراز میں (مؤلف)
اگرچہ نگاہ میں بال و پر نہیں لیکن اس کی پرواز دیکھ کہ باوجود بے سرو
سامانی کتنی رسا ہے۔

”اثر مائی غنا روشن نشد بی احتیاج این جا
ز اسرار کرم گر آگہی دارد گدا دارد“
طلب ہو تو مطلوب ملتا ہے۔ درد ہو تو دوا بھی ہے اور اس کا اثر
بھی ہے۔ ”اسی خواجہ درد نیست و گرنہ طیب ہست“ اسی طرح جہاں حنیج
ہو وہاں غنا کا بھی ظہور ہوتا ہے، بخشش کے راز سے اگر کوئی واقف ہے تو
گدا ہی ہے۔

”بجناب کرم افسوں ورع پیش میر
بے گناہی گنہے نیست کہ آنجا بخشند“ (بیدل)
صاحب مغفرت کے حضور تقویٰ کا جادو نہیں چلتا۔ بے گناہی
گناہ تو نہیں کہ وہاں بخشا جائے، پہلے گناہ بنو پھر مغفرت طلب کرو۔
مری غرض گناہ سے نہیں لذت گناہ
بندہ تیرے فضل سے رحمت پرست ہے (مؤلف)

”سراپا محو شو تا جملہ آگاہی شوی بیدل
بقدر گم شد نہا ہر کس این جا رہنما دارد“

اے بیدل جتنا اپنے آپ سے غافل ہوگا اتنا ہی آگاہ ہوگا۔ جتنا کوئی گمراہ ہوا اتنا ہی رہبرِ کامل کا طالب ہوتا ہے۔

شاہ عالمگیر تو دکن کی تسخیر میں مصروف تھا۔ ادھر دہلی اور اکبر آباد کے گرد و نواح میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی، حکام نے خود سری اختیار کر رکھی تھی۔ ہر ایک کے سر میں ہوائے حکومت و تسلط سمائی ہوئی تھی۔ حوالی متھرا کے اکثر پرگنوں میں لوٹ کھسوٹ اور تعدی کا دور دورہ تھا۔ شرفاء کا ننگ و ناموس لٹ رہا تھا، داد گری بغیر بیداد متصور نہ تھی، ہر روز دکن سے ایک نیا عالم آتا یہاں تک پہنچتے پہنچتے پڑا ہوا جاتا۔ تجارت پیشہ کا کوئی قافلہ ان راستوں پر آتا تو لٹ جاتا، بیدل دو سال سے متھرا میں تھا۔ متمول آدمی تو اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے اور تیر و تفنگ سے اپنی جان و مال کی حفاظت بھی کر رہے تھے، بیدل کے دل میں خیال آیا کہ یہاں سے چلنا چاہئے، جس طرح ہو دہلی پہنچو، اس منحصر آفات سے تو نجات ہو۔

فرستے دارمی، زگرد اضطراب دل بر آ
ہمچو خوں، پیش از فشردن از رگ بسل بر آ
خلقے آفت خرمن است ایں جا بقدر احتیاط
عافیت می خواہی از خود اندک ای غافل بر آ
از تکلف در فشار قبر نتوان زیستن
چوں نفس دل ہم اگر تنگی کند از دل بر آ
اگر فرصت ہے تو دل سے اضطراب کی گرد جھاڑ کر بکل آ، پیشتر اس کے
کہ لہو کی طرح ہے رگ بسل سے آپ ہی باہر آ جا یہ سمجھ لے کہ خلق کا خرمن
آفت ہے۔ اس لئے اگر خیر چاہتا ہے تو احتیاط برتتے ہوئے لے لے خبر
تھوڑا سا اپنے آپ سے باہر آ، فشار قبر میں بھی تکلف کے ساتھ زندگی

بیتدل

دوبھر ہے جس سے دم گھٹتا ہے اگر دل بھی تنگی کرے تو دل کو بھی چھوڑ کر
باہر آ۔

دوستوں سے جب میں نے ارادہ کا ذکر کیا تو سننے لگے کہ آپ کو یہ کیا
سوچھی، اگر آپ عزم مصمم اعتماد خوارق پر کئے ہوئے ہیں تو جب اس کی
آزمائش ہوگی اور آپ صحیح و سلامت گھر پہنچ جائیں گے تو ہم بھی آپ کی
کرامات پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اگر اپنے زور بازو اور شجاعت پر بھروسہ
ہے تو فتح کے وقوع کے بعد حق مبارک باد ادا کریں گے، ورنہ ظاہر
حالات جو کچھ ہیں آپ بھی دیکھ رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسے
دہلی کہ ہنوز دور است پہنچ سکتے ہیں، کسی کی نہ سنی ایک ”بہلی“ کرایہ کی۔
محمل کشی آثار خیال ست گزشتن رنج و غم ایں مرحلہ پیوستہ نمائد
مفت است از صاحب ثریب جوہر قدرت چنداں کہ دل خوں شدہ خستہ نمائد
بر ناخن امداد شکستن بگمارید اسی بے خیراں کار کسی بستہ نمائد

پہلے دن کا پڑاؤ ”اعظم آباد“ تھا، اس مقام پر قریب چاس ”بہلیاں“
ایک ماہ سے بدرقہ کے انتظار میں پڑاؤ ڈالے کھڑی تھیں۔ یہاں نہ کوئی
فوجی سوار نہ پیادہ نظر آیا کہ اس کی حفاظت میں آگے بڑھتے، دوسرے
روز میں سفر پر آمادہ ہو گیا تو دوسروں کے دل میں بھی گدگدی ہوئی
مگر وہاں کے لوگوں نے روکا اور کہا کہ آج کل بے بدرقہ سفر کرنا اپنے
آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے مگر قافلہ چلنے کے لئے تیار ہو چکا تھا، اتنے میں
ایک فقیر ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ لئے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔
اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر صدا کی آفتاب عالم اقبال ہم سفر ہے،
کسی قسم کا وہم خطرہ دل میں نہ لاؤ۔ غرض قافلہ روانہ ہوا۔ میرے ہمراہ
دو خادم تھے۔ ایک بیمار اور دوسرا ضعیفی کی وجہ سے خدمت سے آزاد۔
راستہ میں اُقتادیہ پڑی کہ بہلی کے دونوں پہیے دھرے سے نکل گئے۔ پیل

بھی زخمی ہوا۔ قافلہ والوں نے یہ بد فال سمجھی، غرض ہزار خرابی کے بعد شیر گڑھ پہنچے۔ رات توجوں توں کر کے یہاں بسر کی، ابھی پہر رات باقی تھی بہلی بانوں نے کہا کہ قافلے والے اسباب باندھ رہے ہیں اگر وہ آگے نکل گئے تو ہم بچھڑ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ تمہیں کس نے روکا ہے چلو، شیر گڑھ کی آبادی کے قریب ہی ایک قلعہ تھا۔ قصبہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی۔ اور اس قلعہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر اور گاؤں تھا۔ جہاں کے قزاق اکثر چھاپہ مارتے۔ اہل قلعہ میں بیٹھے تیر و تفنگ بے اثر کی پائے ہوئے انھیں پرانگندہ کرنے کی بے فائدہ کوشش بھی کرتے۔ ہمارے بہلی بان مقراض واران قزاقوں سے جوڑ میل رکھتے تھے، ابھی رات باقی تھی کہ ہم بہلی کے ساتھ ایک اور راستہ پر ہوئے۔ عرصہ گزر گیا اور میں حیران تھا کہ چاروں طرف قافلہ کی گرد تک دکھائی نہیں دیتی، ممکن ہے کہ ہم کارواں سے پہلے ہی آگے دور نکل آئے، یہاں تک کہ ہم گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھا کہ سواروں کی ایک جماعت چپ و راست گھوڑوں کو دوڑا رہی ہے۔ لیکن غبار میں انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ میں نے بہلیانوں کی منت کی واپس لوٹو، مگر وہ توارا دتا اس جگہ لائے تھے سنتا کون، اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک نیلے گھوڑے پر مسلح سوار اسی جماعت سے باہر نکلا۔ تازیانہ ہاتھ میں تھا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا ہماری بہلی کے قریب آیا۔ شکل و صورت سے مسلمان نظر آیا۔ آتے ہی بہلی بانوں پر برس پڑا، او بد بخوتم اندھے ہو گئے تھے کہ محبوبانِ الہی سے ایسی ناشائستہ حرکت کی، بہلی بان کانپ رہے تھے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور خطا ہوئی معاف فرمائیں۔ بات یہ ہے کہ راستہ بھول گئے۔ خیال یہ تھا کہ یہاں کے رہنے والوں سے راستہ دریافت کرینگے ادھر آٹکلے، اب جس طرف ارشاد ہوا دھر چلیں۔ سوار نے تازیانہ سے

بیدل

ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ خبردار ذرا بھی اُدھر اُدھر نہ ہونا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ پہلی باتوں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے اپنے آپ کو قافلہ کے درمیان دیکھا۔ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

جن دنوں بیدل کا قیام متھرا میں تھا، قلعہ دار دوست تھا ایک دن اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ قلعہ کیا ہے جنات کا گڑھ ہے، تین سال سے میں یہاں ہوں مختلف مقامات سے پتھر برستے ہیں یا کسی گوشہ سے آگ بھڑکتی ہے۔ کئی افسوں طراز آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ فوراً ایک شعر بیدل کے خیال میں آیا۔ ”باعفاریت جہانے دیگر جائے کم نیست مکانے دیگر“ ایک کاغذ پر لکھ کر قلعہ دار کو دیا کہ قلعہ میں ایک نیزہ پر آویزاں کرو۔ جب تک بیدل وہاں رہا یعنی تین سال کے عرصہ میں پھر یہ شکایت نہ ہوئی۔ بیدل اسے ”اثر سخن“ سے منسوب کرتا ہے۔

اے دماغ فطرت سرگرم سودائے سخن
نقطہ و خطے کہ از پر کار امکاں دیدہ
دشنگاہ رنگ بومی عالم غیب و شہود
جن انس آئینہ تاثیر حکم اندوس
کیست زین تمثال نیرنگی نیاز رنگ ہوش
از زمین تا آسمان یک حلقہ آغوش است
تہمت مضمون دیگر بر طلسم خود مبند
بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات تحریر سخن ہے۔ انسان خود ایک پہیلی ہے اور یہ سخن ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن یہ نقطہ و خط اور حروف اور عبارت جو کتاب کائنات میں تصویری نقوش ہیں محض اتنی ہی بات نہیں، اصل شے تو معانی ہیں اور یہ حقیقت ہے، اور اسی کا اثر ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس موضوع پر ہم پہلے بھی بیدل کے لفظوں میں بحث

کر چکے ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کے اثر پر زور دیتا ہے۔

نہ ہمیں صوت و صدا پر وہ ساز سخن است

خامشی نیز اثر پرور راز سخن است

گوش گو تا بتا مل نظرے باز کند،

کہ حقیقت ز اسیراں مجاز سخن است

تصویر | چہار عنصر میں بیدل نے چند اور واقعات بھی نقل کئے ہیں۔

اور نظم و نثر میں دادِ سخن دی ہے، ان میں سے ایک واقعہ بیدل کی اپنی تصویر کے متعلق ہے۔ عقیدت مندوں میں ایک شخص ”انوپ چتر“ نامی نقاش تھا کہ ”روح مانی بکسوت غبار رنگ گرد قلمش می گردید، و فطرت بہزاد در پردہ ناموس خاک انفعال تردد سنیش می کشید“

خامہ او ہر کجا تصویر شمع می کشید

ہئیت پروانہ گرد در نظر می بست نقش

ریشہ نخلے کہ از کلکش نم پرواز یافت

زیں ادا ہر جانب زنگ صنعت می شکافت

اس مصور کے ورقِ دل پر نقش عقیدت اتنا گہرا تھا کہ اکثر التجا کرتا کہ

اجازت دیں کہ آپ کی تصویر کھینچوں تاکہ صفحہ روزگار پر یادگار رہے۔

”چوں فضولیہائی ایں جنس اشغال غیر از آئینہ لہونی زدود، طبیعت نیرنگی

مسترت ساغر التفات کم می پیود یا میں اس قسم کے شغل کو محض تفریح ہی

خیال کرتا تھا اس لئے طبیعت ادھر نہ آئی۔ ایک روز بہت منت و سماجت

سے کام لیا اور کہا کہ میں کسی اور خدمت کے لائق تو نہیں اگر اجازت ہو تو

میری سعادت ہے۔

آئینہ چہ دارد ز سرو برگ قبول

جز آنکہ ترا جلوہ دہد در نظرت

بیتدل

میں نے بھی اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو اجازت دے دی،
اس نے اس ”عجز سرشت“ کا نقش ”صفوہ اثر“ پر باندھا، دیکھا تو میں
خود حیران رہ گیا کہ یہ میں ہوں یا میری تمثال۔

سیر اور امتیاز فرع و اصل آشنا داشت مستغنی ز وصل
تما شود بیگانہ ہم محرم نشان بیدلم می گفت بے کام و زبان
اگرچہ تصویر نقل اور میں اصل تھا، مگر دونوں میں فرق نہ تھا، اگر کسی
دوست کے پاس ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ بیتدل میرا ہم نشین ہے، اور بیگانہ کو
بھی پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ تصویر خود بول رہی ہے کہ میں بیتدل
ہوں۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ منہ اور زبان کے بغیر ہی بولتی ہے،
اس تصویر کو کتاب میں تہ کر رکھا، دس سال تک اس نگارستان کا
تماشا دیکھتا رہا، ۱۱۰۰ھ میں ”بہ مقتضائی عجز بشری“ مجھ بے دست و پا
کے قویٰ پر عارضہ زور پکڑ گیا۔ یہاں تک کہ اجاب زندگی سے مایوس
ہو گئے۔

بودم گردے فسرده یاس مال پرواز بباد رفتہ و ریختہ بال
چوں عکس نمود داشتیم لیک بوہم چوں صبح نفس میزدم اما بخیاں
ایک رفیق اسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، ناگاہ اس تصویر پر
نظر پڑی، کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا کہ ”آہ، اس تصویر کو نظربد کھا
گئی۔ غالباً کسی لڑکے نے نم آلود ہاتھ اس پر پھیرا ہے، اس لئے اس کا رنگ
آڑ گیا“ حاضرین نے بھی یکے بعد دیگرے تصویر دیکھی اور افسوس کرتے
رہے۔ ایک نے کہا کہ نمی کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا، نم کا اثر صفوہ کتاب
کے حروف پر بھی ہونا چاہئے تھا۔ میں نے حاضرین کی گفتگو سن کر کہا کہ
میں بھی دیکھوں کہ کیا بات ہے۔ تصویر دیکھی تو واقعہ میں ایک مدہم سا نقش
رہ گیا تھا۔ میری یہ حالت نہ تھی کہ افسوس میں رفقاء کا شریک ہوتا۔

تصویر ہاتھ سے گر پڑی، جب میں رُوبصحت ہوا اور رفتہ رفتہ جسم ناتواں میں پھر سے قوت و توانائی محسوس کی اور اپنے آپ کو تندرست پایا تو ایک دن اسی تصویر کا خیال آیا کہ بیچارہ نے کس ذوق و شوق سے کھینچی۔ تصویر اسی کتاب میں نقش معنی فراموشی اور اسی محفل حروف میں دود مشعل خاموشی تھی۔ کتاب کھول کر دیکھی تو حیران رہ گیا۔ وہی شوخی رنگ نمایاں تھا گویا ابھی کھینچی ہے۔ گویا بیدل بے زبان گرم گفتگو شعلہ نوائی تکلم ہو رہا ہے، اور بہار گذشتہ پھر سے اسی رنگینی کے ساتھ جلوہ نما ہے، رفقاء نے بھی دیکھی اور سب تصویر حیرت بن کر رہ گئے۔ سب کا رنگ ہوش اُڑ گیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مجھے اب سوچنے کی فرصت نہ تھی، جنون بے اختیاری اجزای صفحہ را بچاک گریباں رسانید، واضطراب بے حوصلگی ہچکچاہٹ بخاک مدفون گردانید، یعنی پھاڑ ڈالی۔

بیدل تا سیر رنگ و بو ہا کریم صد عقدہ ز نیرنگ جہاں واکریم
اما توجہ عالمی کہ حشر تصویر در پردہ نقش تو تماشا کریم
اس واقعہ کے ضمن میں بیدل لکھتا ہے کہ اس قسم کے واقعات جہاں بچپنی کی قدرت کے عجائبات سے ہیں کہ ہم انسانی خواہ کتنی ذہنی کاوش سے کام لے یہ گتھی سلجھنے میں نہیں آتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسرار عالم غیب ہیں۔ اگر فطرت بشری میں یہ جوہر ہوتا کہ اس قسم کے اسرار کی حقیقت اس پر منکشف ہوتی تو عاجز نہ ہوتی، اس طرح ہر ایک صاحب عقل اس کی کنہ کو پہنچ جاتا۔ اگر زمین کو پر لگ جاتے، تو آسمان کو بغل میں وبالیتی، اور اس طرح ننگ پستی و پامالی سے ذلیل و عاجز نہ ہوتی، اور اگر ذرّہ کے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو آفتاب بن جاتا اور اسے حرارت اخذ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ پس آدمی جمیع امور میں مجبور ہے اور تمام افعال و اعمال میں معذور۔

ای آنکہ هیچ عالمے بار تو نیست جز قہمت و ہم گرد آثار تو نیست
بر خیز بکار خویش مژگاں و اکن ہر خند کشادہ ہم کار تو نیست

مرسد | بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ میں ہوئی، تاریخ خود ہی انتخاب سے نکالی، پیدا عظیم آباد پٹنہ میں ہوئے اور فوت دہلی میں جہاں مستقل رہائش رکھی تھی، وفات ۱۱۳۲ھ میں واقع ہوئی۔ بیدل محض شاعر نہ تھا، سنائی اور عطار اور رومی اور سعدی وغیرہم کی طرح صاحبِ حال بھی تھا۔ معاصرین اولیاء اللہ میں شمار کرتے، چنانچہ ایک رباعی میں اشارہ کرتا ہے کہ:

بیدل بدورِ وزہ عمر مغرور مشو بنیاد تو نیستی ست مہمور مشو

ہر چند ابدال و قطب و غوث خواند اسی خاک بایں غبار مسرور مشو

یہ عمدہ دورِ وزہ ہے اس پر اترانا نہ چاہئے۔ جس ہستی کی بنیاد ہی نیستی ہو وہ آباد ہونے سے رہی، کوئی ابدال یا قطب یا غوث بھی ہو اور لوگ یہ سمجھ کر احترام بھی کریں تو فوق البشر تو نہیں ہو سکتا۔ اس آدمِ خاکی سے یہ غبارِ شہرت کشفِ کرامت اڑ کر پھیلے تو اس پر خوش نہ ہونا چاہئے۔

سودا کے ایک خمس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے زمانے میں بھی شعرا بیدل کے مزار پر تقریبِ عرس پر جمع ہوتے اور اپنا پیچیدہ کلام سناتے۔ اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ تمام شعراء بطور پیر و مرشد اور استادِ فن بیدل کا اتباع کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں مجھے دہلی میں چند ماہ قیام کا اتفاق ہوا۔ جو عقیدت مجھے تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں اولیں فرصت میں فاتحہ خوانی کے لئے مزار پر حاضر ہوتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کہاں واقع ہے۔ میرے تصور میں روضہ کا ایک ایسا ہی نقشہ تھا جیسا کہ مشاہیر کا عموماً دیکھ چکا تھا۔ دریافت پر مجھے اتنا معلوم ہوا کہ قبر ریس کورس کے قریب میں ہے۔ میں اس سڑک پر ہولیا جو دہلی سے نظام الدین اولیاء کو جاتی ہے۔ مگر مجھے راستہ میں کہیں نشان نہ ملا۔ یہاں تک کہ میں پیدل ہی مقبرہ نظام الدین اولیاء پر پہنچ گیا۔ یہاں میں نے مجاورین سے دریافت کیا تو ایک نے کہا کہ آپ بیدل کی نسبت دریافت کرتے ہیں جو شاعر تھا۔ مجھے یہ فقرہ سن کر دھکا سا لگا۔ کہا کہ ہاں شاعر تو تھا، اس نے کہا کہ آپ اسی سڑک پر

واپس ٹوٹیں، داہنے ہاتھ بلندی پر مٹکے شاہ کا مزار ہے، وہاں آپ کو لکڑیوں پر مٹکے آویزاں دکھائی دیں گے، عین اس کے سامنے ایک قبرستان ہے وہاں اس شاہ کی قبر ہے۔ آتے ہوئے میں نے مٹکے لٹکتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس لئے اطمینان ہو گیا کہ اب مرزا صاحب کے مزار کا پتہ مل گیا۔ میں اس مقام پر واپس آیا۔ سڑک کے کنارے بائیں طرف ایک قبرستان تھا میں نے ان قبروں کو پہلے دیکھا جن کے گرد چار دیواری تھی، اور کتبوں کو بھی پڑھا ان میں بیدل کا نام نہ ملا۔ یہ مزار بھی بہت پورے تھے، دیواروں کا کچھ حصہ گر چکا تھا اور کچھ گر رہا تھا، اسی طرح اور قبریں بھی دیکھیں جن کے سر ہانے کتبے نصب تھے۔ اس فہرست رفتگاں میں بھی مرزا صاحب کا نام نہ تھا۔ کتبوں کے مطابق معلوم ہوا کہ ان میں بعض اللہ والے بھی تھے، جب مجھے یقین ہو گیا کہ ان قبروں میں آپ کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تو سخت اندر دہ خاطر ہوا۔ اور حسرت بھری نظر سے اس عبرت گاہ کو دیکھتا ہوا پھر سڑک پر اتر آیا۔ مجھے خیال آیا کہ آپ کی قبر آخر انہیں میں ایک ہے، چلو میں کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھ لیں۔ سڑک کے کنارے ایک قبر کے سر ہانے میں نے فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے بعد شہر کی طرف لوٹا۔ راستہ میں مجھے رہ رہ کر ایک واقعہ کا خیال آتا، جب میں پہلی دفعہ دہلی میں چند روز کے لئے آیا تھا۔ میری طائب نلی کا زمانہ تھا۔ میں امرا و وزراء کے مقبرے دیکھتا ہوا صفہ جنگ کے مقبرہ پر کتبہ پڑھ رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بنگالی ہندو میری طرح ہی سیر کرتا ہوا آکر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ کیا پڑھتے ہو، اس پر کیا لکھا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کتبہ ہے اور متونی کا سنہ و ذات شعر کے آخری مصرع کے حروف سے نکلتا ہے۔ صنعت جس بھی سمجھائی تو کہا کہ یہ نہایت اچھی صنعت ہے۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تم طائب علم معلوم ہوتے ہو۔ بتاؤ تم نے یہاں عجیب چیز کیا دیکھی۔ میں نے کہا کہ ہر ایک چیز ہی عجیب ہے۔ کیسی عالی شان عمارتیں ہیں۔ مسکرایا اور کہا کہ عالی شان عمارتیں تو ہر جگہ ہیں، میں نے کہا کہ آپ ہی فرمیں آپ نے کیا عجیب چیز دیکھی۔ میرے خیال میں

بیدل

تو کوئی خاص بات نہیں آئی۔ کہا اور کیا اچھا کہا کہ میں نے ایک بات دیکھی ہے، ان امرا و وزرا کے مقبرے اُجاڑ پڑے ہیں۔ اور مسجدیں اور اولیا و فقرا کے مقبرے آباد ہیں، تم سمجھے کیوں، میں نے پھر قصور فہم کا اعتراف کیا، کہا کہ یہ دنیا دار لوگ تھے، جب تک دنیا میں رہے دنیا نے ان کا ساتھ دیا، جب دنیا چھوڑی، دنیا انھیں بھول گئی۔ مقبروں میں اللہ والے ہیں اور مسجدوں میں اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اللہ جی قیوم ہے اس لئے جو بھی اس سے وابستہ ہوا وہ بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا داروں کے ہاں اُلو بولتا ہے اور مقبروں اور مسجدوں میں زندگی کی رونق ہے، اس واقعہ کا خیال مجھے بار بار آتا اور یہ دسوسہ بھی کہ کیا بیدل بھی دنیا دار تھا کہ آج مجھے اس کی قبر کا نشان تک نہ ملا۔

میں مکان پر آیا تو میرا لڑکا میرا انتظار کر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی پوچھا کہ آپ کے چہرہ پر پڑمردگی سی چھائی ہوئی ہے، کیا کہیں دور نکل گئے تھے۔ زیادہ کوفت تو نہیں میں نے کہا کہ بخور دار نہیں وجہ کچھ اور ہی ہے۔ میں نے اس کو تمام واقعہ من و عن سنایا اور یہ بھی کہا کہ دیکھو نظام الدین اولیاء کے مقبرہ پر کتنی رونق ہے۔ اور کیسی عالی شان عمارت روضہ پر ہے۔ لڑکے نے ایک اور ہی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ بات یہ ہے کہ ان حضرات کی زندگی ہی میں لوگ ان کو پوجتے تھے، تب سے پوجاریوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ بیدل ایک قلندر تھا۔ وہ ان باتوں کی بیہودگی سے خوب واقف تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو بھی جب تک زندہ رہا خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور نہ اس نے پیری مریدی کا ڈھونگ رچایا۔ عقیدت مند سینکڑوں تھے اور اب بھی ہیں۔ وہ اپنے سخن میں زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ اس کا احترام کرنے والے اہل علم و فضل ہیں وہ جہلا کی تحسین نا شناس کا دلدادہ نہ تھا جو قبروں کو پوجتے ہیں۔ اب میری بھی آنکھیں کھلیں اور کہا کہ سچ کہتے ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ ”پیر شو بیا موز“ جو کچھ میرے لڑکے نے کہا خود بیدل نے بھی ایک قطعہ میں اس کو واضح کیا ہے :-

گو گزشتہ رفیقاں ز دل فراموش اند کلام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوش اند
 تو سخت بے خبری ورنہ رفتگاں یک سر ز خجلت مژہ واکردن تو رو پوش اند
 چراغ انجمن حیرت نظر بودند کنوں بہ پردہ دل داغ ہائے خاموش اند
 ہنوز زحمت سعی تومی کشند بخاک تو تازہ بار تعلق نرسے دوش اند
 پچشم بستہ نگاہی کہ ایں پری صفتاں نزاہت انجمن شیشہ خانہ ہوش اند
 نرفتہ اندازیں بزم تاسخن باقیست زدیدہ رفتہ حریفان ہنوز در گوش اند
 اب میں نے سمجھ لیا کہ بیدل تو مجھ سے کلام کر رہا ہے۔ قبر والے تو کسی سے
 بولتے نہیں۔ مردے نہیں بولتے زندے بولتے ہیں۔

ایک ماہ بعد مجھے پھر اسی سڑک پر جانے کا اتفاق ہوا۔ دل میں تھا کہ وہیں
 سڑک کے کنارہ پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لوں گا۔ جب یہاں پہنچا تو میری حیرت کا
 اندازہ کون کر سکتا ہے کہ یہی قبر جس کے بالیں پر میں نے گزشتہ ماہ فاتحہ خوانی کی
 تھی ”سیمنٹ“ کے ”پلستر“ سے پختہ بنی ہوئی تھی اور سامنے اس پر جلی حروف میں
 لکھا ہوا تھا کہ :-

”مرقد مرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ“

قبر کے ایک پہلو پر یہ الفاظ تھے ”بہ توجہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن“ آج
 اتنے عرصہ بعد مجھے الفاظ یاد نہیں رہے مگر یقیناً یہی کچھ تھے، اگرچہ میری حیرت
 آمیز مسرت کی انتہا نہ رہی مگر افسوس بھی ہوا کہ خیر بیدل کو تو اس کی پرواہ نہ
 تھی کہ اس کے قول کے مطابق بعد وفات اس کا کیا فائدہ ہے کہ ”گل کند مقبرہ ام
 بہزاد ام“ مگر اعلیٰ حضرت کی شان کے شایاں تو کسی طرح نہ تھی۔ اتنا تو مجھے بھی
 معلوم تھا کہ موجودہ والئی دکن کا مورث اعلیٰ آصف جاہ اول بیدل کا شاگرد
 اور عقیدت مند تھا، مگر یہ راز نہ کھلا کہ اتنی پشتیں گزرنے کے بعد حضور نظام
 کو تعمیر مرقد کا خیال کیسے آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا، کہ یہ سب اہتمام ایک عقیدتمند

کی خاطر ہی ہوا کہ افسردہ نہ ہو، ورنہ
 اسی مردہ دل آراش مرقد چہ تناست نام تو ہماں بہ کہ لب گور نگیرد

تذکرہ

مرزا عبدالقادر بیدل کی نسبت تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر ملاحظہ اس کا حوالہ دیا جائے تو ایک دفتر بن جائے گا۔ ہم صرف دو تذکرہ نویسوں کی رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک موافق ہے اور دوسری مخالف، موافق میر غلام علی آزاد بلگرامی "خزانہ عامرہ" میں لکھتا ہے کہ

ترجمانی

"بیدل مرزا عبدالقادر عظیم آبادی بیدل مرزا عبدالقادر عظیم آبادی غی کہہ پیرمی کہہ سخن دانی و افلاطون خم سخن دانی کا پیر مغاں ہے (بحاظ شاعرانہ نشیں یونان معانی است) اور بلوانہ حکیمانہ تفکر اس کو شعراء میں وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو افلاطون کو حکماء یونان میں۔

مشہور روایت ہے کہ افلاطون "خم" میں سا لہا سال گوشہ نشین رہا، می کہہ کے ملازمت میں "خم" نے عبارت میں لطف پیدا کر دیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ معانی کو اگر ملک یونان تصور کیا جائے تو بیدل کو افلاطون کہنا چاہئے۔

"کہ قدرت کہ بطرز تراشی او تواند کس میں یہ طاقت ہے کہ اس طرز کو جو اسکی رسید و کرا طاقت کہ کمان بازونی اپنی ہے پہنچ سکے اور کس میں یہ قوت ہے او تواند کشید چنانچہ خود جس دعویٰ کہ وہ کمان جو بیدل ہی کا زور بازو کھینچ سکتا ہے کوئی اور کھینچ سکے۔ چنانچہ اس دعویٰ کا می جنبانہ مدعی در گذرانہ دعویٰ

طرز بیدل، سحر مشکل کہ یہ کیفیت اعلان بباغِ دہل وہ خود کرتا ہے۔ اسے
مدعی طرز بیدل کا دعوائے نہ کر، جادو بھی

عجائز رسد“

بھلا معجزہ کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔
راقم الحروف کہتا ہے کہ اگرچہ بیدل نے اس تعلیمی سے کام نہیں لیا جو شعراء کا
عموماً خاصہ ہے مگر کبھی کبھی اسے خود بھی اپنی بلند خیالی کا احساس ضرور ہوتا تھا
چنانچہ ایک غزل کا ایک شعر ہے :

”سربے نیازی فکر را، بہ بلندی نرساندہ ام

کہ بجز بتبع نظم من، احد سے خیال زمیں گند“

مؤلف خزانہ عامرہ بیدل کے دعوائے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

”رساندہ پایہ معنی بہ آسماں ہم بلند طبع شناسد کلام بیدل را“

”نشہ فقر جزو دماغش و فروغ بیدل کے دماغ میں فقر کا نشہ اس حد

روشن دلی نور چراغش“ تک تھا، کہ اس کے دماغ کا جزو دین

گیا تھا۔ اور اس کی روشن دلی اس کے چراغِ جان کے نور سے جلوہ فروز تھی۔

میر آزاد نے جو کچھ بیدل کی نسبت لکھا ہے اس کی تصدیق واقعات سے

ہوتی ہے۔ چنانچہ آغاز شباب میں شہزاد محمد اعظم کے ہاں ملازمت اختیار کی۔

شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر آیا تو کسی نے کہا کہ آج بیدل کا بھی

جواب نہیں۔ شہزادہ نے کہا کہ اچھا اسے کہو کہ ایک قصیدہ لکھے، تاکہ اس کے

مرتبہ کا بھی اندازہ ہو سکے۔ دوستوں نے بیدل کو کہا کہ اس میں کیا قباحت

ہے اگر ایک قصیدہ ولی نعمت کی مدح میں لکھو۔ بیدل نے مناسب یہی سمجھا کہ

مستعفی ہو گیا۔ میر آزاد لکھتا ہے کہ میرا مشرب بھی یہی ہے یعنی ترک مدح اور رد

صد، امر کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور یہ امر کی ہمت کا تقاضا ہے لیکن ردِ صلہ

فقر کی ہمت کے مناسب ہے۔ چونکہ مرزا بیدل اہل دولت و ثروت سے ہمیشہ

کنارہ کش رہا، حق تعالیٰ امراءِ عصر کو اس کے آستانہ پر لایا، چنانچہ غازی

اور ننگ زیب عالمگیر کے آخری عہد اور محمد شاہ رنگیلا کے جلوس کے اوائل تک ارکان ہر سلطنت اس کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ہدیہ نیاز پیش کرتے رہے، جب نواب آصف جاہ ۱۱۳۳ھ میں کشور دکن پر مسلط ہو گیا تو مرزا بیدل کی خدمت میں لکھا کہ یہاں تشریف لائیں۔ یاد رہے کہ اول نواب آصف جاہ بیدل کا شاگرد بھی تھا۔ مرزا یہ بیت لکھ کر بھیج دیا:

دنیا اگر دہندہ نہ خیرم ز جائے خویش
من بستم حنائی قناعت بپائے خویش

اگر مجھے دنیا جہان کا مال اس غرض سے دیا جائے کہ میں اپنا گوشہ فقر و قناعت ترک کر کے کسی صاحب جاہ کے در دولت پر حاضر ہو کر جیبہ ساتی کروں تو یہ مجھ سے بعید ہے اس لئے کہ میں نے حنائی قناعت پاؤں پر باندھ رکھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا بیدل نے فقر و فاقہ قبول کیا اور قناعت پیٹھ تھا لیکن جو دولت علم و فن اس کے پاس تھی اس کی احتیاج امراء کو تھی۔ اور یہی حاجت ان کو خود مرزا بیدل کی خدمت میں بصد نیاز کھینچ کر لائی۔

میر آزاد لکھتا ہے کہ میر عبد الولی عزت سوری سے منقول ہے کہ بعد وفات مرزا بیدل شعراء شاہجہان آباد دہلی ہر سال مرزا کی قبر پر بتقریب عرس جمع ہوتے، اور کلیات مرزا حسب معمول نکال کر مجلس میں لاتے۔ میں اس نیت سے کہ آیا مرزا کو میری یہاں آمد کی بھی کچھ خبر ہے، کلیات کھولی تو پہلا شعر یہ تھا۔

چہ مقدار خوں در عدم خورده باشم
کہ بر خالم آئی و من مردہ باشم

تو میرے مزار پر آئے اور میں مردہ تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عدم میں کتنا ہیچ و تاب کھارہا ہوں، حاضرین نے بھی یہ شعر پڑھا اور میر عبد الولی کی نیت سے واقف ہوئے تو بیدل کی کرامت کے قائل ہو گئے۔

بیدل

بیدل کی کلیات میں ایک لاکھ سے زیادہ ابیات ہیں، غزلیات میں ردیف ”ت“ میں پانچ سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ اکثر شعرا کی کلیات میں اتنے ابیات نہیں ملیں گے۔

بیدل کے بارہ میں صرف اعتراض یہ ہے کہ خارج آہنگ ہے، یعنی زبان فارسی میں ایسی ترکیبیں اختراع کیں جس سے اہل زبان مانوس نہ تھے اور اسے غیر محاورہ کہتے، مثلاً بیدل نے اپنے بیٹے کی وفات پر ایک مرثیہ مخمس میں لکھا، ایک شعریہ ہے کہ

ہرگز دو قدم خرام می کاشت
از انگشتم عصا بکف داشت

جو کبھی دو قدم چلتا تو میری انگلی اُس کے ہاتھ میں عصا کا کام دیتی، شعر

کی لطافت کے علاوہ امر واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ عصا کی ضرورت بوڑھوں کو ہوتی ہے جس کے سہارے چلتے ہیں۔ بوڑھا پاپا بھی دوسرا بچپن ہوتا ہے کہ دونوں کو چلنے میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ اپنے والد کی انگلی پکڑ کر قدم بقدیم چلتا ہے گویا یہ عصا، پیر ہے۔ انگلی اور عصا میں مشابہت معنوی اور صوری شعر کی خوبی کو اور بڑھا رہی ہے۔ لیکن ”خرام می کاشت“ ایک نیا محاورہ ہے، اور اسی پر اعتراض ہوا کہ غیر محاورہ ہے۔ بات یہ ہے بیدل نے اس میں وہ بات پیدا کی ہے جو کسی کے ذہن میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ ”خرام می کاشت“ کا مفہوم یہ ہے کہ چلنا سیکھتا تھا۔ انگریزی زبان میں محاورہ ہے (اور دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ گویا ”خرام“

بمنزلہ ایک بیج کے تھا جس کو وہ طفولیت میں بوتا تھا۔ آگے چل کر اسی بیج کا نشوونما ہونا تھا۔ لیکن نہ ہو سکا اور نہ میری پیری کا عصا ہوتا۔

خان آزاد ”مجمع النفائس“ میں لکھتا ہے کہ بیدل نے صرف پُرانی لکیر کو پٹینا پسند نہ کیا بلکہ ازراہ قدرت نمایاں تصرف بھی کیا۔ ولایتی اور ان کے کا سہ

بیدل

لیس ہندی اس بزرگوار کے کلام پر حرف رکھتے ہیں۔ لیکن میں تو اس تصرف میں خوبی ہی خوبی دیکھتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حسد بڑی بلا ہے جب اہل سخن جن کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ اہل زبان ہیں بیدل کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر کی باندی تک نہ پہنچ سکے تو اتنی بات کہنا کیا مشکل ہے کہ خارج از آہنگ ہے شبلی نعمانی مرحوم ہندی ”شعر العجم“ میں جہاں کہیں بیدل کا ذکر کرتا ہے تو ایسے نقطوں میں کہ قابل ذکر ہی نہیں سمجھتا، چنانچہ صائب کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہم عصروں تک کو ادب سے یاد کرتا تھا لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معترف تھا، یہ اس کے صحیح مذاق کی بہت بڑی دلیل ہے، نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے کہ:

صائب چہ خیالی ست شوی ہجو نظیری

عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہاں تک تو مضائقہ نہیں لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے بد مذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کر دی اور توبت یہ پہنچی کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری کے کلام پر سر دھنتے ہیں

”بنیاد ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد براں مزید کرد“
(فرود)

اسی طرح مرزا غالب کی تعریف کرتے ہوئے مولانا رشاد فرماتے ہیں کہ ”مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا، اس لئے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں پھوڑتے۔ عجیب بات ہے، ایران کے انقلاب کی اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی، لیکن خود بخود یہاں بھی

انقلاب ہوا۔ یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سینکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا، مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا، ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستہ پر پڑ گئے تھے، لیکن عرفی، غالب آملی، نظیری، حکیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا، چنانچہ دیوان فارسی کے خاتمہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

یہ اشارہ خاتمہ دیوان فارسی پر ایک تقریب میں پایا جاتا ہے۔ اس میں وہ عرفی و غالب و نظیری اور علی حزیں کے اتباع کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر بیدل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ یہ اجتہاد اور جدت، جس کی تعریف میں مولانا شبلی رطب اللسان ہیں اشارتاً اسی تقریب میں ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

”در سلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن و اشتم
کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں تا میدمش
سلوک میں جو کچھ بھی میرے سامنے آیا اس سے میں گزر گیا۔ کعبہ کو دیکھا تو اسے راستہ چلنے والوں کے نقش قدم سے تعبیر کیا۔ بیدل کہتا ہے کہ
”کعبہ و بت خانہ نقش مرکز تحقیق نیست
ہر کجا گم گشت رہ سرمنزے آراستد“

بیدل نے اس موضوع پر مختلف پیرواروں میں کئی اشعار لکھے ہیں، یہ تخیل جو غالب کے اس شعر میں ہے بیدل ہی سے لیا گیا ہے، بیدل کہتا ہے کہ

در طلب باید گذشت از ہرچہ می آید بہ پیش
گر ہمہ سرمنزہ مقصود باشد جاودہ است

چہ دنیا و چہ عقبی سدا رہ تست اے غافل
بیا بگذر کہ از بہر گذشتن ہست باطل ہ

بیدل

گرز دنیا بگذری تشویشِ عقیقی ہائل است
 تاز خود نگزشتہ میبایدت صد جا گذشت
 نیست در دشت طلب با کعبہ مارا احتیاج
 سجدہ گاہ ناست ہر جا نقش پا افتادہ است

—————

اگر از دیر و ارسیم شوق کعبہ پیش آمد
 تنگ و پوی نفس یارب کجا ہا میبرد مارا
 تخیل بیدل کا ہے غالب نے جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے اس سے وہ
 بات پیدا نہیں ہوتی جو بیدل کے اشعار میں ہے، غالب سے بہتر تو ہمارے علامہ
 اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد

دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقیقی بھی چھوڑ دے

غالب نے صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ سلوک میں جو بھی پیش آئے اس
 سے گزر جانا چاہئے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں گزرنا چاہئے اور یہ کہ منزل بھی کوئی
 ہے کہ نہیں۔ یہ بات بیدل نے بتائی ہے۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔
 سر دست ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کا نظریہ دربارہ بیدل اور غالب
 کس حد تک صحیح ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شبلی کا مدوح غالب بیدل کی تعریف میں تو رطب اللسان
 ہے اور آپ بیدل کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری بیدل جیسے
 شعرا نے بگاڑ رکھی تھی غالب نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ شاعری کا انداز بالکل
 بدل دیا۔ ابتدا میں بیدل کی پیروی کی وجہ سے وہ بھی غلط راستہ پر پڑ گیا تھا۔
 مولانا بالفضل اولنا نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ابتدا سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اور
 یہ کہ کس وقت اس کو اس کا احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔ غالب کا

فارسی اور اردو کلام غالب نے خود اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔ فارسی کلام جس پر خود غالب کو ناز ہے اسے تو کوئی پوچھنے والا ایران میں بھی نہیں، البتہ اردو کلام کو خاص شہرت خاص وجوہ سے ہوئی۔ غالب فارسی اور اردو کلام دونوں میں بیدل کا مداح ہے۔ اردو میں اس کا ایک شعر ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے
میری ایک غزل کا یہ شعر ہے :-

کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں

انداز وہ طرزِ بیدل کا اشعار میں پیدا ہو نہ سکا

یہ کہنا زیادہ حقیقت کے اقرب ہے جو میں نے اس شعر میں واضح کیا ہے کہ غالب نے کوشش تو بہت کی کہ بیدل کا انداز پیدا کر سکے لیکن نہ کر سکا۔ اس لئے اسے چھوڑنا پڑا، فارسی میں بھی بیدل کا مداح ہے۔

مرزا غالب نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اہل علم تو تھوڑے ہوتے ہیں اور ان میں اہل تقلید محققین سے زیادہ ہوتے ہیں۔ شہرت عوام میں ہوتی ہے جس کو عوام قبول کریں اسی کا کلام زبان زد ہو جاتا ہے۔ دوسرے بات یہ ہے کہ معاصرین کو خیال میں بھی نہ لانا چاہئے اور جوان میں سے مشہور ہوا سے کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا چاہئے اور خود اس کی جگہ متمکن ہونا چاہئے۔ بد قسمتی سے اس وقت مرزا قلیل کی شہرت عام تھی اور اس کے شاگرد بھی بہت تھے، قلیل فوت ہو چکا تھا۔ غالب نے حسبِ عادت کہہ دیا کہ قلیل ایک ہندو تھا اسے فارسی سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے، قلیل کے شاگرد بھرک اٹھے تو غالب کی یہ بھی عادت تھی، کہ پھر عذر خواہی پر اتر آتا۔ چنانچہ معذرت کرتا ہوا لکھتا ہے کہ عموماً بزمِ سخن میں اجباب کہتے ہیں کہ غالب قلیل سے بہتر نہیں کہہ سکتا۔ جواب میں لکھتا ہے کہ :

فیضے از صحبت قلیلم نیست رشک بر شہرت قلیلم نیست

بیدل

یہ صحیح ہے کہ میں قاتل کی صحبت کا فیض یافتہ نہیں ہوں اور نہ مجھے قاتل کی شہرت پر رشک آتا ہے۔

مگر آناں کہ پارسی دامنند ہم بریں عہد ورائے و پیمانند
مگر جو پارسی داں ہیں ان کا اس پر اتفاق ہے۔

کہ زابل زبان نبود قاتل ہرگز انا صفہاں نبود قاتل
کہ قاتل اہل زبان نہ تھا اور ہرگز اصفہان کا رہنے والا نہ تھا۔
لاجرم اعتماد را نسزد گفتہ اش اعتقاد را نسزد

اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس کی زبان چونکہ لکسانی نہیں قابل اعتبار بھی نہیں اور اس کا کلام سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔
اس کے بعد غالب اپنی نسبت لکھتا ہے کہ میں علی حزیں اور جلال اسیر کو چھوڑ کر قاتل کا اتباع کیوں کروں۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح رواں معنی را آن ظہوری جہان معنی را
میں طالب آملی اور عرفی اور نظیری کا دامن کیسے چھوڑ دوں، بالخصوص
ظہوری جو روح رواں اور جہان معنی ہے اس کے بعد ظہوری کی تعریف میں
چند ابیات ہیں جس کی نسبت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ صائب بیضا شاعر
ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف عام غوش اعتقاد ہی یا شہرت عام پر کرتا
ہے۔ جب مولانا کا مدوح غالب ان حضرات کا مدح ہے تو سمجھیں نہیں آتا کہ
مولانا ان شعرا کو ان کے اصلی مرتبہ سے گرانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں،
صائب نے سچ کہا ہے:

صائب دو چیز می شکستہ قدر شعر را

تحمید ناشناس و سکوت سخن شناس

غالب بیدل، ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سخن شناس

ہی نہیں سخن گو بھی ہے اور مولانا ان کی مذمت کرتے ہیں۔
 اسی مثنوی میں غالب قاتل کے شاگردوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ
 تم نے جو میرے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ میں نے ”زودہ“ کو غیر محاورہ باندھ ہے۔
 می زودہ، غم زودہ، شراب زودہ کو نسی ترکیب ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ”تعلیب“
 ہے:

ہمچناں آں محیط بے ساحل	قلزم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایت دارد	کہ بدیساں بدایت دارد
”عاشقے بیدے بنوں زودہ“	قدح آرزو بخوں زودہ“
کردہ ام عرض ہمچناں ”زودہ“	طعنہ بر بحر بیکراں زودہ“
گرچہ بیدل ز اہل ایران نیست	لیک ہمچوں قاتل تاوان نیست
صاحب چاہ دوستگاہے بود	مرد را نہیں نمد کلاہے بود

اسی طرح محیط بے ساحل اور قلزم فیض مرزا بیدل نے ”زودہ“ اپنی مثنوی
 میں باندھا ہے، یہ بیت داستان محبت کے شروع میں لکھا ہے کہ:

عاشقے بیدے بنوں زودہ قدح آرزو بخوں زودہ

میں نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ تم نے مجھ پر نہیں بلکہ اس بحر بیکراں پر
 اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ بیدل ایرانی نہیں ہے لیکن قاتل کی طرح نادان بھی
 نہیں یعنی فارسی سے خوب واقف ہے، زبان پر اس کو پوری قدرت حاصل
 ہے، جسے ”الب“ ”محیط بے ساحل“ اور ”قلزم فیض“ اور بحر بیکراں کہے، ایسے
 شخص کا کیا حق ہے کہ بیدل کے کلام پر حرف لائے جبکہ وہ خود غالب کی تعریف
 میں زمین و آسمان کے قلم بے ملارہا ہے۔

جس ”اجتہاد“ اور ”جدت“ کی تعریف غالب سے منسوب کی جاتی ہے،
 وہ اس کا خود مدعی نہیں، لیکن یہ عقیدت کا کرشمہ ہے کہ یہ دعویٰ اس سے منسوب کیا
 جاتا ہے، جن کا وہ اتباع کرتا ہے ان کو نام بنام شمار کرتا ہے، اس نے قاتل کی نسبت

بیدل

لکھنے کو تو لکھ دیا کہ وہ اہل ایران نہیں۔ لیکن وہ خود بھی ایرانی نہیں ترکمانی ہے، اور اہل زبان شعر کا اتباع اس نے کیا تو کیا قاتل نے نہیں کیا۔ غالب کو معلوم تھا کہ فارسی شروع سے مسلمانوں کی حکومت کی زبان رہی ہے اور یہ کہ اہل زبان ظہوری و نظیری و عرفی و غیر ہم نے ہندوستان ہی میں فروغ پایا۔

اجتہاد اور جدت بیدل کے کلام میں پائی جاتی ہے اور غالب نے سخت کوشش کی کہ بیدل کی طرز اس کے کلام میں پیدا ہو جائے، وہ خود کہتا ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوا۔ غالب کا اُردو کلام اس کا اپنا انتخاب کردہ ہے، اگر زبان اور اہل زبان ہی ایک معیار پرکھنے کا ہو جس پر غالب قاتل کے مقابلہ میں زور دیتا ہے تو ہم بلا خوف تردد کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا اُردو کلام اس پایہ سے گرا ہوا ہے بلکہ اسے اُردو کہنا ہی صحیح نہیں ایک ولایتی اُردو میں کہتا ہے۔

برہمن کی بیٹی آج میری آنکھ میں پری

غصہ ہوا، وگالی دیا، و دگر لری

اسی قسم کی زبان اُردو غالب کی بھی ہے۔

شمار سچہ مرغوب بُتِ شکل پسند آیا

تماشا بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یہ تمام غزل ایک لفظ آمد سے فارسی بن سکتی ہے۔ وہ فارسی مصادر کا عام استعمال کرتا ہے، آخر اس نے مومن کا اتباع کیا اور جو چند غزلیں اس نے حکیم مومن خاں کی طرز میں لکھی ہیں وہی اس کا شاہکار ہے، مومن کی زبان اتنی شستہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کی زبان ہمارے زمانہ کی زبان ہے، بلاشبہ ذوقِ اہل زبان ہے اور اس کے کلام میں بھی روزمرہ ہے لیکن حشو و زواید اور حروف جار کی بھرمار جو اس کے اشعار میں ہے مومن کا کلام اس سے پاک ہے۔ لیکن ذوق و غالب کو ایسے شاگرد ملے جنہوں نے حق شاگردی ادا کیا۔ اور مومن کو کوئی ایسا آدمی نہ ملا۔ غالب ان سب کا جانشین تھا جو غدر

سے پہلے گزر چکے تھے، اب وہ میدان میں اکیلے رہ گیا۔
 یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ غالب کے بہترین اشعار
 فارسی اور اردو میں وہ ہیں جن کا تخیل بیدل کے کلام سے لیا گیا ہے۔ چند
 اشعار کا ہم حوالہ دے چکے ہیں۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے

لہ بیدل کہتا ہے:

آہم ز نار سائی شد اشک و با عرق ساخت
 پستیست گر خجالت شبم کند ہوا را

غالب کہتا ہے:

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بیدل نے تو ایک بات پیدا کی ہے کہ آہ نار سا ہوئی تو اس نار سائی پر آنسو
 مہل پڑے۔ یعنی آہ اشک میں مبدل ہو گئی۔ آہ تو بلندی کی طالب ہے اور جب تک
 رسا ہے ہوا کی طرح بلند ہے۔ لیکن نار سائی کی خجالت نے اس ہوا کو شبم میں
 تبدیل کر کے زمین کی طرف پستی میں گرایا۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی
 ہو گیا۔ خجالت نار سائی کی اور نار سائی پستی کی دلیل ہے۔ غالب کے شعر میں آنسو
 دم سرد بن گئے، اس لئے پانی کا ہوا ہو جانا باور آیا۔ ایک بدیہی امر جو روزمرہ
 مشاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے ”باور“ استعمال کرنا کوئی عجیب بات نہیں، پانی میں
 حرارت ہوا سے کمتر ہے پانی ہوا حرارت سے ہوتا ہے، سردی سے منجمد ہو گا۔ اس لئے
 شعر غلط ہے، بیدل کا مشاہدہ صحیح ہے۔

”مطلبم از سے پستی تر دماغیہا نبود

یک دوسا غر آب دادم گرئی مستانہ را“ (بیدل)

غالب کہتا ہے کہ

بیدل

بیدل نے کبھی کسی شاعرِ ہم عصر یا متقدم کی ہجو نہیں لکھی، اگرچہ اس کے اپنے زمانہ میں واسد موجد تھے اور اس کے کلام کو ”خارج آہنگ“ کہتے جو درحقیقت

مے سے غرض نشا ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے
غالب نے ”مطلب“ کی جگہ ”غرض“ اور ”تردماغی“ کی جگہ نشاط استعمال
کئے ہیں، بیدل اور غالب کے تصوف میں یہی فرق ہے کہ بیدل گریہ مستانہ کو
آبدار بنا رہا ہے اور غالب بیخودی چاہتا ہے۔
بیدل کہتا ہے:

بسمہ داغ، ویدل نالہ دیدہ سرشکم
مجلتم ہمہ جاشعلہ کار سوختہ گی ما
سینہ پرداغ ہے اور دل سے نالہ نکلتا ہے، آنکھوں میں آنسو ہیں، ہر ایک
مقام پر بوجہ محبت شعلہ کی طرح میرا کام جلنا ہی ہے:
شمع محفل بر خموشی بست و مینا بر شکست
ہر کسے زیں انجمن طرزِ دگر نالید و رفت
شمع محفل تو چپکے روتی رہی اور آخر خاموش ہو گئی یعنی بجھ گئی شراب کی صراحی
ٹوٹی تو شراب کے آنسو اندیل دے اس انجمن سے ہر ایک اپنی اپنی طرز پر روتا ہوا
چلا گیا۔
مجلے بر شعلہ، اشکے توشہ، آہی را ہبہر
شمع در شبگیر فرصت طرفہ ساماں کرد و رفت
شمع بزم میں تین باتیں ہیں ایک تو شعلہ اور دوسرے اشک تیسرے دھواں، شمع
کو ایک رات کی فرصت ملی تو اس نے سامانِ سفر باندھا، صبح کو کوچ تھا۔ محل تو
شعلہ پر باندھا، زاد سفر یہی گریہ آہوں کا دھواں راہبر تھا۔ بزم ہستی سے اس سرد
سامان کے ساتھ نکلی، یہ قافلہ صبح ہوتے ہوتے لٹ گیا۔

تذکرہ

۹۹

بیدل کا اجتہاد اور جذبت ہے۔ مگر اس نے کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ ”چہار عنصر“ میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ ایک صحبت میں ہمعصر شعرا اور بیدل کو ایک ہی

سحر آہ و گلستاں نگہت و بیل فغاں دارد

جہانے سوئے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

جہاں محسوسات عالم صورت ہے۔ اور اس کی اصل بے صورتی بے رنگی ہے۔

صورتے از بے صورتی آمد بروں

باز شد اتا الیہ راجعوں (رومی)

گلستاں میں پھولوں کی بو، بیل کا نالہ، صبح کی آہ سب ایک عالم پریشان

ہے اور یہ کارواں بصد حسرت بیرنگی کی طرف جا رہا ہے۔

کس ازین حرماں سرا با ساز جمعیت زلفت

چوں سخن تارفتہ انداز لب پریشاں رفتہ اند

اس حرماں سرا دنیا سے کوئی بھی جمعیت کے ساز و سامان کو لے کر نہیں گیا۔

بات کی طرح جو مُنہ سے نکلتی ہے پریشاں حال و خاطر ہی گیا۔ بات جب تک دل

میں ہے اسے جمعیت حاصل ہے، مُنہ سے نکلی تو بیرونی دنیا میں افواہ کی طرح پھیل گئی۔

غالب کہتا ہے کہ

بوی گل، نالہ دل، دود چراغ محفل

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب نے نگہت کی جگہ ”بو“ اور فغاں کی جگہ ”نالہ“ اور ”آہ“ کی جگہ

”دود“ استعمال کیا ہے۔

(۳) بیدل کہتا ہے کہ

دامن دل گرفتہ ایم ہمہ خون مستان بگردن مینا

بیدل

زمین میں طبع آزمائی کرنی پڑی، بیدل تو اس عرصہ زمین کو جلدی ہی طے کر کے فارغ ہو گیا اور دوسرے سرگرداں خاک چھانتے رہے۔ یہ واقعہ اس نے

دل از ہمدوشی عکس تو بر آئینہ می لرزد
کہ اوست منے ناز است این دیوارِ نم دارد

آئینہ میں بھی آب ہے۔ گویا یہ ایک دیوار ہے جس میں نم سرایت کر چکا ہے۔ آئینہ میں اس مست ناز کا عکس پڑ رہا ہے اور مست کے پاؤں بھی لڑکھڑاتے ہیں اور دیوار آئینہ بھی مندار، دل کانپ رہا ہے کہ دونوں گرنے پڑیں، مطلب یہ ہے کہ آئینہ اور تمثال کی بنیاد ہی کیا، ایک ہستی عدم نما اور دوسرا عدم ہستی نما، یہ خیال بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے، دامن گرفتہ ایم ہمہ الخ کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب نے دل کو مجرم قتل ٹھہرا کر اس کا دامن پکڑا ہوا ہے، اصل مجرم تو کوئی اور ہے وہ مینا ہے۔ دل تو دلدار کے قبضہ میں ہے اور دلدار مست اور نشہ مستی مینے دیا ہے۔ دل خون ہی تو ہے اس کے دامن پر دھبہ ہے تو اس کو مجرم نہ سمجھنا چاہئے۔ یہ لہو مست ناز کے ہاتھوں سے ہوا جس کے ہاتھ میں مینا کی گردن ہے اس نے اصل مجرم کو بھانپ لیا اور گردن دیائی، بات یہ ہے کہ دلدار کو قتل کا مجرم قرار دینا آداب و ادب کے خلاف ہے، ”تو گو گناہ من است“

غالب کہتا ہے کہ

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتارِ دیکھ کر

مطلب یہ ہے کہ وہ شراب پی کر لڑکھڑا رہا ہے اس کی لغزش مستانہ پر خلق مر رہی ہے۔ اس لئے مجرم قتل مینا کی گردن پر ہے کہ نہ وہ شراب پیتا اور نہ مست ہوتا اور نہ لوگوں کا خون ہوتا، موجِ مے کانپ رہی ہے کہ مجھے اصل مجرم نہ ٹھہرایا جائے۔

بیان کیا ہے لیکن کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ کہ کون کون موجود تھے۔
اجتہاد اور جدت پسندیدہ امور ہیں، لیکن ترکیب الفاظ غیر مانوس

(۴) خلقے بعدم دود دل و داغ جگر برد

خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد

مطلب یہ ہے کہ ایک دنیا حسرت زدہ آپہں بھرتی اور داغ جگر لے کر
زیر خاک چلی گئی۔ ان کی مٹی سے گل لالہ اور سنبل کی تعمیر ہوئی ہوگی کہ گل کے جگر پر
داغ اور سنبل کے پیچ و خم میں وہی دہواں ہے جو دل سے آہ کی صورت میں پیچ و خم
کھاتا ہوا نکلتا ہے۔

غالب کہتا ہے کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو کہ پنہاں ہو گئیں

مطلب یہ ہے کہ کیسی کیسی حسین صورتیں تھیں جو مر کر خاک میں مل گئیں
سب تو نہیں ان میں سے کچھ لالہ و گل کی صورت میں پھر سے خاک سے پیدا ہو گئیں۔
(۵) بیدل کہتا ہے کہ

اے خوش آں جو دکھ از نخلت وضع سائل

لب با طہار نیازند و بایما بخشد،

غالب کہتا ہے کہ

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

بیدل کا یہ شعر بھی فرد ہے :

برآستان رحمت مطلق برید نیست

دستیکہ مطلب از لب سائل برآورد

اس حد تک نہ ہونی چاہئے کہ ناگوار گزرے اس لئے جدت پسند طبیعت کو لامحالہ متقدمین کا اتباع بھی کرنا پڑتا ہے، اور اسی سے نئی بات پیدا بھی کی

سب کچھ دیا ہوا تو اللہ کا ہے اور اسی کی رحمت مطلق کی بخشش ہے کہ اغنیاء اور اہل کرم کو داد و دہش کی توفیق عطا ہوئی اللہ تعالیٰ تو بن مانگے دے رہا ہے۔ اس لئے اخلاق الہیہ کا تقاضہ ہے کہ اہل کرم بھی سائل کو بن مانگے دیں۔ ایسا ہاتھ قلع کرنے کے لائق ہے جو سائل کا مطلب اس کے منہ سے کہلوائے۔ سوال میں احساسِ ذلت ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔

(۶) بیدل کہتا ہے کہ

عالم فریب، دیدہ عاشقِ نئی شود
آئینہ خیال تو صورت پرستِ قیمت

کائنات عالم صورت ہے۔ جو عاشقِ حقیقت پرست ہیں وہ اس عالم صورت اور اس کی رنگینیِ حسن پر فریفتہ نہیں ہوتے عالم صورت عاشق کو فریبِ نظر میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ تیرے خیالِ حقیقت کا یہ آئینہ دل صورت پرست نہیں ہے۔

چوں نگہ در دیدہ صیدِ آفت خویشی و بس
در نہ این بزمِ تحیرِ حلقہ داسے بیش نیست

تیری نگاہ تیری آنکھ کے حلقہ میں ہی رہتی ہے، لیکن تجھے اس سے خارج میں ایک کائناتِ نظر آ رہی ہے، حقیقت میں تو اپنی آفت کا آپ شکار ہے۔ ”آفت“ کے معنی جوڑنا، پوشگی، تیری نگاہوں نے جو تاروں کا حال بچھا رکھا ہے اس میں کائنات اسیر ہے لیکن حقیقت میں جسے تو کائناتِ غیر سمجھ رہا ہے وہ ایک حلقہء دام ہے جو تجھے پھانس رہا ہے۔ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں کائنات کا شکاری ہوں اور کائنات کا شکار تو ہو رہا ہے کہ اس کے حسن صورت پر فریفتہ ہے۔

جاتی ہے، زبان کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔ خود بیدل کا نظریہ اس بارہ میں جو کچھ ہے وہ اس کی ایک غزل سے واضح ہو سکتا ہے۔

اصل میں یہ دونوں باتیں فریبِ نظر ہی ہیں، اگر تو نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ تیری نگاہ تیری آنکھ سے جدا نہیں اور جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے تیرے دیدہ دل کے تصورات ہی ہیں، باہر کچھ موجود نہیں، تو حقیقت میں اپنے آپ پر فریفتہ ہے۔ غلط فہمی سے تو اسے غیر سمجھ رہا ہے، یہ بزمِ تحیر تیرا ہی دل ہے،

ہرچہ گزشت از نظر نیست برون از خیال

بیدل ازیں دام گاہ رفتہ کجا میرود

جو کچھ تیری نظر سے گزر رہا ہے تیرے خیال سے باہر نہیں تیرے ہی دل کے تصورات ہیں۔ اور دامِ خیال سے باہر نکل بھی نہیں سکتے۔ اگر تجھے گزرتے ہوئے یا جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو جا کر کہاں جائیں گے تیرے دل سے باہر نہیں جاسکتے۔

غالب کہتا ہے کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام علقہ دامِ نیال ہے

بیدل اور غالب کے اشعار میں تخیل ایک ہی ہے:

(۷) در سایہ ابرو نگہت مست و خرابست

چوں تیغ ز سرور گذر د عالم آبست (بیدل)

تیرے ابرو کے سایہ کے نیچے تیری نگاہ مست و خراب ہے، ابرو تلوار

کی مانند ہے جس میں آب ہے، یہ سمجھنا چاہئے کہ ابرو عالمِ آب (میںخانہ) ہے اور یہ پانی سر سے گزر چکا ہے اس لئے آنکھ مست و خراب ہے۔

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے (غالب)

بیدل

امروز ناقصاں بھالے رسیدہ اند
کز خود سری بحرف سلف خط کشیدہ اند

”بھوں“ نہایت غیر ماثوس ثقیل لفظ واقع ہوا ہے۔ غالب نے ابرو کو مخراب مسجد سے تشبیہ دی ہے اس کے زیر سایہ یعنی سرپرستی میں خرابات یعنی چشم مست ہے، بیدل نے ابرو کو تلوار سے تشبیہ دی ہے اور اس کی آب کو شراب کے معنی میں لیا ہے مسجد کے زیر سایہ خرابات تو نہیں ہوتی مگر عالم آب میں جب کوئی غرق ہو تو خراب حال ہی ہوگا۔

(۸) یاد آزادیست گلزار اسیرانِ قفس

زندگی گر عشرتے دار دایمِ مردن است (بیدل)

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا (غالب)

یہ عالم افساد ہے۔ غم کی تصدیق خوشی کے تصور کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

زندگی اور لطفِ زندگی کا احساس موت اور المِ موت کے ساتھ ہی ہے۔

(۹) ای غنچہ دودم تنگی دل مغنم انگار

زیر غم کدہ ہر گاہ الم رفت طرب رفت

غنچہ خود طرب گاہ ہے۔ مگر کھلنے سے پیشتر تنگی دل محسوس کرتا ہے۔ اس

غم کدہ دنیا میں خواہ تنگی دل ہی کیوں نہ ہو غنیمت سمجھنی چاہئے کہ یہی دودم ہے چند روزہ ہے۔

(۱۰) بیدل ایں انجمن وہم دگر نتواں یافت

در وہم مفت تماشا ست طرب باید کرد

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن (غالب)

آج ناقص طبع خام خیال اپنے زعم ناقص میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس کمال کو پہنچ گئے۔ اور خود سری کی وجہ سے سلف کے کلام پر خط نسخ کھینچ رہے ہیں۔

(۱۱) سازِ ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نہ داشت
ہر نوائی را کہ دادیدم خموشی می سرود (بیدل،
نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی ہے نکلے ہے جو بات چاہے (غالب)
سازِ ہستی سے نغمہ عدم کے سوا اور کچھ آواز کاتوں میں نہیں آئی،
جس کسی سر ملی آواز کامیں نے تجزیہ کیا وہ خموشی کا راگ ہی الاپ رہی تھی،
ہر ایک شخص جب تک زندہ ہے سرگرم سخن رہتا ہے۔ مگر موت کے بعد ہمیشہ
کے لئے خاموش ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وجود و عدم کے درمیان ہے۔
آغاز و انجام ہر ایک شے کا جو ”ہست“ ہے ”نیستی“ ہے۔

(۱۲) رنج دنیا، فکر عقبی، داغ حرام، درد دل

یک نفس ہستی بدوشم علیے را بار کرد

ہستی یا زندگی تو ایک تارِ نفس سے وابستہ ہے، یہ رشتہ ٹوٹا تو انسان
تمام دنیا جہاں کے بوجھ سے سبکدوش ہو گیا، جب تک زندہ ہے دنیا کا رنج
اور عاقبت کی فکر اور دماغ حسرت و حرام اور درد دل برداشت ہی کرنا
پڑے گا۔

بندگی، شاہی، گدائی، مفلسی، گردن کشی

خاک عبرت خیز ماصد رنگ تہمت می کشد

انسان خاکی امیر ہو یا فقیر، شاہ ہو یا گدا، غلام ہو یا آقا، مغرور ہو یا خاکسار
غرض ہر ایک رنگ ایک تہمت ہی ہے جو آدمی اپنے سر پر دھر رہا ہے، زندگی
چند روزہ ہے جب ہر ایک شے گزشتنی اور گزشتنی ہے تو ان کو ان سے منسوب

بیدل

انکار کا ملاں ہمہ را نقل مجلس است
 تاکس گماں برد کہ بہ معنی رسیدہ اند
 یہ بر خود غلط ترقی پسند جب کبھی مجلس آرائی کرتے ہیں تو ان کی بحث
 کا موضوع متقدمین پر حرف گیری ہی ہوتی ہے اور دانستہ یا نادانستہ وہ
 لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ بس وہی حقیقت آشنا ہیں۔ اگر وہ ایسے
 ہوں تو متقدمین کی توہین کی ضرورت ہی کیا ہے ”مشک آہست کہ خود

کرنا تہمت ہی ہے۔ وہ کیا لایا تھا کہ اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بندگی اور شاہی وغیرہ ہیں
 کی چیز تھی یہیں رہ گئی۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگان
 تھوڑی سی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے (غالب)
 (۱۳) بیدل من و آں دولت بیدار سرفقہ

کز نسبت او چینی خاموش سفال است (بیدل)
 اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
 کاسہ جم سے میرا جام سفال اچھا ہے (غالب)
 (۱۴) من و سازد و کاں خود فروش بہا چہ حرف است این

جنوں این فضولی در سر منصور می باشد (بیدل)
 قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
 ہم کو تقلید تنک نظر فی منصور نہیں (غالب)
 (۱۵) گر تو نکشائی ز خواب ناز مرثاں چارہ نیست

از ہمیں چشمیکہ دار می نور امین دیدہ اند (بیدل)
 صد جلوہ رو برو ہے جو مرثاں اٹھائیے
 طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے (غالب)

ہوید نہ کہ عطار گوید: ”علم و ہنر ایسی شے نہیں کہ کسی کے کہنے سے علم و ہنر ہو جائے وہ ثابت شدہ حقیقت ہونی چاہئے۔ یہ مرض عام ہے جس سے خواص بھی نہ بچ سکے، غالب میں یہ تعلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور عوام ضرور اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں، یہ کسی بات کو بزور منواتا ہے اور جب ایک دفعہ لوگوں نے مان لیا تو تقلیداً یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور پھر شہرت اور خوش اعتقادی بھی پیدا ہو جاتی ہے مولانا شبلی کے علم و فضل سے کون منکر ہے مگر آپ نے بیدل کی طرف مناسب توجہ نہیں فرمائی۔ غور کرنا چاہئے کہ آپ کا مدوح غالب ہے اور غالب کے مدوح خلال اسیر اور ظہوری اور بیدل، اور بیدل کا سب سے بڑھ کر مداح ہے۔ اب اگر مولانا ان حضرات کی مذمت بمقابلہ غالب کریں اور یہاں تک لکھ دیں کہ انھوں نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا اور غالب نے ان کی پیدا کردہ خرابی رفع کی تو اس صغریٰ و کبرئے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے بیدل نے واضح کیا ہے کہ ”تا کس گماں برد کہ بہ معنی رسیدہ است“ اور اس حد تک معنی سے واقف ہے کہ غالب بھی نہیں، یہ ممکن ہے کہ مولانا ہی کی رائے صائب ہو اور مولانا بیدل کی شاعری ہی پر تنقید فرما رہے ہیں مگر بیدل صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکماء اسلام میں اس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ہمارے علامہ اقبال کی یہ رائے ہے کہ برگسان سے فلسفی کے افکار بھی بیدل کے کلام میں ہیں۔



نکات

نکات بیدل میں زیادہ تر بعض فقرات کی شرح ہے جو ”چہار عنصر“ میں واقعات کے ضمن میں بیدل نے لکھے ہیں۔ یہ شرح بھی مثنوی ”عرفان“ اور ”طلسم حیرت“ اور ”طور معرفت“ کے ابیات اور کچھ غزلیات، قطعات اور رباعیات سے کی گئی ہے۔ اس طرح نکات نظم و نثر میں بیان کئے گئے ہیں۔ فارسی علم ادب میں نثر جو عموماً مقفی عبارت ہی ہوتی ہے جا بجا نظم سے مرزین کی جاتی ہے گلستان سعدیؒ اس کی واضح مثال ہے۔

نکات کے شروع میں بیدل لکھتا ہے کہ:

”اگر منکر نبوت نہ باخطرات جو بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلی

ایمان داری بہج جانب چشم بے ادب مکشا“

اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو جو بھی تیرے دل پر وارد ہوتا ہے اس کا احترام واجب ہے اور اگر تیرا ایمان ہے کہ ”اللہ، نور السموات والارض“ اور اسی نور کی تجلیات مشاہدہ ہو رہی ہیں تو کسی طرف بے ادب نگاہ نہ کر۔ اس نکتہ میں بیدل ”وحی“ کی حقیقت بیان کرتا ہے، ”نبوت“ مشتق ہے لفظ ”نبا“ سے، معنی خبر دینا، خبر ہر ایک زمانہ کے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس لئے نبی مخبر صادق ہوتا ہے اور اخبار صحیحہ نبوت ہے، قلب انسانی پر

جو کچھ وارد ہوتا ہے یا اس سے واردات کے بعد خیالات پیدا ہوتے ہیں اگر اس میں نفسانی تناؤں اور آرزؤں کی آمیزش نہ ہو تو اس کو اصطلاح میں الہام یا القا کہتے ہیں۔

علماء اسلام اور دیگر حکماء طبعین والہین نے وحی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ”چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند“ بات اصل میں یہی ہے جیسے بیدل تحقیق اور تقلید کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ :

انکاری غیر باش تصدیق این است واکرد بدل دلیل توفیق این است
تبعیت خلق از حق غافل کرد ترک تقلید گیر تحقیق این است

عموماً لوگ سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرتے ہیں اور وحی بطور حقیقت بیان کرتے ہیں، لیکن اپنی تحقیق سے تصدیق نہیں کرتے۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ ”وحی“ صرف انبیاء کو ہوتی ہے اور انبیاء کو فوق البشر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ قرآن میں ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کی وحی کا بھی تذکرہ ہے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کیا جائے تو ہر ایک شہد کی مکھی نبی ہے، آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ ”وحی“ تحریکات فطریہ ہے۔ اور اس میں غلطی اور غلط فہمی کا امکان نہیں، تمام کائنات میں ہر ایک شے ”وحی“ کے تحت ہی کام کرتی ہے اور کبھی غلطی نہیں کرتی۔ لیکن انسان کی حالت کچھ مختلف ہے۔ وہ غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے، دیگر اشیاء نہ غلطی کرتی ہیں نہ ترقی، اس لئے غلطی اور ارتقاء لازم و ملزوم ہیں۔ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے۔ ورنہ وہ دیگر حیوانات کی طرح ہوگا۔ انسان کو بھی وحی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح دیگر اشیاء کو لیکن انسانیت کی مناسبت کے لحاظ سے انسان کو وحی بلفظہ ہوتی ہے اور کوئی خیال انسانی قلب میں بلا حروف پیدا ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

”وحی“ کا سرچشمہ صحیفہ کائنات ہے جس کی تعریف ہے ”لاریب فیہ“

بیدل

جس میں کوئی الجھن نہیں اور اسی الجھن کا نتیجہ تذبذب اور شک و شبہ ہوتا ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہوتی ہے کہ ”اتل ما وحی الیک من الکتب“ (تلاوت کرو وہ جو تجھے کتاب (کائنات) سے وحی ہوتا ہے) یہ وہ حقیقت ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے، اس لئے کہ ہر ایک شخص کے مشاہدہ اور تجربہ میں یہ بات آتی ہے۔ بلاشبہ ہم کسی شے کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتے، لیکن جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے اور ہر ایک شخص مشاہدہ کر رہا ہے اور ایک ہی طرح مشاہدہ کرتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ علامہ محمود شبستری ”گلشن راز“ میں کہتا ہے کہ :

ہر آن کو را کہ جانش در تجلی است

ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است

جس کسی کا باطن نورانی ہے وہ جانتا ہے کہ تمام کائنات کتاب الہی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کا باطن خواہ اس معنی میں نورانی نہ ہو جو علامہ ممدوح کے ذہن میں ہے وحی کی حقیقت سے فطرتاً واقف ہے خواہ اس کا اسے علمی شعور نہ ہو جیسے کہ دیگر حیوانات کو نہیں ہوتا۔ چونکہ ہم نے اس موضوع پر علاحدہ بحث کی ہے اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے سرپرست ہم بیدل کا نظریہ بیدل کے الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔ لیکن اتنا سمجھ لینا مقدم ہے کہ ہمارے پاس تحقیق کا ذریعہ صرف بصورت بصیرت ہے، ایسی بات جو ان سے باہر ہو یا جس کی تصدیق بصورت بصیرت نہ کرے محض ”وہم محال اندیش“ بیدل کے لفظوں میں ہے۔

بیدل نکات میں لکھتا ہے کہ :-

”در عالم آثار کثرت بساز از واپردا خلق، سرمایہ فرصت در با خلق است، اگر چراغ بنیش قابلیت نوری دارد و جز در انجمن مفروز، تا با فسون خیال از تجلی کما ہی چشم پوشی، و در حضور آباد

کرشمہ جمال بکسب حرمیں نکوشی“

فرصت داری جزا گہی کار بند بر آئینہ ات تہمت زنگار بند

ہر چند بود یک مژہ واکردن چشم باز است در حضور ز نہار بند

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں جو محسوس ہو رہی ہے حقیقت جلوہ گر ہے اور یہ حقیقت اس سے باہر متصور نہیں ہو سکتی۔ یعنی معرفت انہی صورتوں کے صحیح تصور پر موقوف ہے۔ اس لئے اسے مشاہدہ کرتے ہوئے دور از کار توقعات اور ادہام سے ذہن خالی ہونا چاہئے۔ اگر ہم اس عالم کو دیکھتے ہوئے کسی اور عالم ادہام میں سرگرداں ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تحقیق سے ہم بہت دور ہیں۔ اگر تیری آنکھ میں نور بصیرت ہے تو اس چراغ بنیش کو اسی انجمن عالم کثرت میں روشن اور اس کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ کرنا چاہئے اور قیاس و گمان و دہم سے قلب کو پاک و صاف رکھنا چاہئے۔ قلب انسانی مثال آئینہ ہے اس لئے اگر آئینہ کدورت اور ادہام سے صاف ہوگا تو کائنات خارجی کا عکس بھی اسی نسبت سے قلب میں صاف ہوگا۔ اور اگر تو نے ایسے قیاسات وغیرہ سے زنگار آلود کر دیا تو عکس بھی اسی رنگ میں دیکھے گا، اور یہ تیرے اپنے قیاسات اور ادہام ہی ہونگے جو خیالات خام اور باطل ہیں اس کے بعد جو کچھ تیرے قلب پر صحیح تذکر و تفکر سے وارد ہوگا وہ حق ہے۔ جب اللہ ہی نور السموات والارض ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر تو آنکھیں کھول کر مشاہدہ کرے گا تو اسی نور کی تجلیات کے حضور اپنے آپ کو پائے گا اور اگر قیاسات وغیرہ میں الجھ گیا تو حضوری سے دور بھٹک کر گمراہ ہوگا۔ اس ”نکتہ“ کی تشریح اس کے بعد دوسرے ”نکتہ“ میں اس طرح کی گئی ہے :-

”از فرط گر سگی کہ حرارت غریزی بہ وداع قوامی دامن می

چنید صاحب ریاضت اشکال غریبہ می بیند یعنی بخارات کہ

بیدل

مادہ تخیل است ہر گاہ بدماغ صعودی نماید تمثال ہائے عالم
 خواب در عین بیداری نقاب می کشاید، بچناں، منگام نزع نیز صور
 مثالی بر طبائع منکشف می گردد و آن از باقیات عالم خیال ست
 و گرنہ در نفس الامر تحقیق آن دشوار و محال مثل شعلہ چراغیکہ چون
 روغنش کم شود سراپا در میگرد و روشن تر میگرد و تا باندک فرصت
 بمیرد، چون غلبہ جوع موجد صفر است و غلبہ صفر مادہ ایجاد سودا و
 جمعی را کہ با مبداء توجہ است از سطور این بخار با سطور حقائق و
 معانی می خوانند، و فرقہ را از حقیقت بے خبر لست اشکال دیو و
 جن میدانند، چہ دود یا ازین آتش نامشعل متصاعد نگردد، و
 چہ سواد یا کہ ازین صفرائی سوختہ بطوفاں نرسید، اگر ہوشیست باید
 فہمید کہ غیر اشیائی محسوسہ معین ہر چہ در خیال پر تو اندازد و اہمہ
 سوائی است و خلاف قاعدہ اتفاق آنچه در نظر با مشکل یا بند
 بخار بینائی۔

خلقیست دریں جنوں سرائی نیز زنگ زندانی اختراع چندیں فرہنگ
 من بندہ آنکہ در ادب گاہ ثبات جوعش مجنوں نسا زد و سیری رنگ
 بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ صحیح حواس اور صحیح دل و دماغ، صحت
 جسم کے ساتھ ہی ممکن ہے چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ
 گر عین و گرا قیاس دریافتہ در انجمن حواس دریافتہ
 بردا من جسم پاک تحقیر مدوند حق را بہیں لباس دریافتہ
 تمام علوم اور حکمت اسی خاک کی جسم کے ساتھ ہی ہم پر منکشف ہوئے
 اور ہو رہے ہیں، یہی حواس ہیں اور یہی قلب اگر یہ نہ ہوں تو ہمیں نہ کسی بات
 کا شعور ہو نہ علم اس لئے جسم کو حقیر شے نہ سمجھنا چاہئے، ہمیں ”حق“ کی
 معرفت اسی لباس جسم میں ہو رہی ہے جو ہم نے اور تمام مادی کائنات

نے پہن رکھا ہے۔ اور یہ لباس صورت کتنا حسین اور کتنا رنگین ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نکات ہی میں لکھتا ہے کہ :-

ریاضت صفائی باطن می آرہ بشرط اعتدال، وضعف برقوائے می
گمارد بافراط کمال، مدعا ازین کسب مواد فاسدہ را باصلاح آورد
است، نہ اجزائے صالح را نیز فاسد کردن، این جائز نگار از
طبیعت زدودن است، نہ آئینہ را بمشق صیقل فرسودن، بحکم قد فرانی
وجود از انبیاء پیچ کس بریاضات شاقہ نہ ساخت الا بقدر اصلاح مزاج
و بخوردن خود نیز نہ پرداخت مگر بمقدار ضرورت احتیاج،

بنیاد جسدہ کہ کارگاہ اسماست روزی دوز حکمت طبعی برپاست
برصوم و صلوٰۃ برمیفرز کاینجا تعدیل بہرامر کمال عرفاست
ریاضت کی غرض اتنی ہے کہ باطن میں صفائی پیدا ہو اور اس کے لئے
بھی اعتدال شرط ہے، اگر اعتدال سے بڑھے تو افراط میں آجھ کر رہ جاؤ گے،
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قوے میں ضعف پیدا ہو جائے گا، ریاضت
کی غرض وغایت یہی ہے کہ فاسد مادہ رفع ہو اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب
ہو، یعنی جو خرابی باطن میں ہے اس کی اصلاح ہو جائے، نہ یہ کہ جو اجزاء صالح
ہیں ان کو فاسد بنایا جائے۔ طبیعت سے زنگ کدورت رفع کرنا مقصود ہے،
نہ کہ مشق صیقل سے آئینہ کے وجود کو نابود کرنا اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ
انبیاء سے بڑھ کر ریاضت شاقہ اور مجاہدہ حاکم کسی نے نہیں کیا۔ لیکن ان نفوس
قدسہ کو بھی اس وجود کی فطری ضرورت کا احساس تھا۔ جس حد تک صلاح
مزاج کا تقاضا تھا انھوں نے خورد و نوش و خواب کی احتیاج میں کمی کی۔
اس جسد انسانی کی بنیاد ہی اسی سے قائم ہے۔ چند روزہ زندگی بھی اسی خورد
و نوش اور ضروریات سے بسر ہو رہی ہے اس لئے تیرے لئے یہی مجاہدہ
کافی ہے کہ ارکان اسلام صوم و صلوٰۃ پر کچھ اور زیادہ نہ کر، کیونکہ تعدیل

بیدل

ہر ایک امر میں اہل معرفت کا کمال ہے حقیقت یہ ہے کہ رہبانیت میں حظِ نفس ہے اس لئے نفس انسانی رغبت سے کرتا ہے، اعتدال قائم رکھنا نہایت سخت بجاہدہ ہے۔ اور اسے قائم رکھنا سخت مشکل ہے۔ اس تشریح کے بعد اس ”نکتہ“ زیر بحث پر غور کرنا چاہئے۔ بیدل کہتا ہے کہ ”بھوک کی شدت سے حرارت غریزی قوی کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ جب قوائے کمزور ہوتے ہیں تو صاحب ریاضت عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بخارات مادہ تخیل ہیں جب یہ بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تو عین بیداری میں عالم خواب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اسی طرح نزاع کی حالت میں بھی مرنے والا وہ تصورات جو اس کے ذہن میں ہی محفوظ ہوتے ہیں مشاہدہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ اس کے اپنے خیالات ہی کا عکس ہوتا ہے، نفس الامر میں اس کی تحقیق محال ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چراغ جب اس میں تیل ختم ہونے کو ہوتا ہے تو سنبھالا لیتا ہے۔ اور ایک نخت پوری روشنی دیتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد گل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی سنبھالا لیتا ہے، اور اس میں زندگی کے آثار پوری قوت کے ساتھ محسوس ہوتے ہیں مگر جلد ختم ہو جاتا ہے، بھوک کی شدت سے سفر پیدا ہوتا ہے اور غلبہ صفر سے سودا کا زور ہوتا ہے، وہ لوگ جن کی توجہ خدا کی طرف لگی ہوئی ہے جب بخارات دماغ کی طرف چڑھتے تو خیال کرتے ہیں کہ ہم پر معانی و حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے اور ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور جو حقیقت سے بے خبر ہیں وہ دیوا اور جن اور پری دیکھتے ہیں، اس آتش نامشعل سے کتنا دھواں اٹھتا رہتا ہے جو دماغ کو تاریک کرتا ہے اور اس صفرائی سوختہ سے کتنا سودا پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے سروں پر کھیلتا ہے، اگر ہوش و حواس درست ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ بھی غیر اشیاء محسوسہ و معینہ خیال میں منعکس ہوتا ہے سب سودائی و ہم ہے اور خلاف

قاعدہ جو کچھ نظر آئے وہ غبارِ بینائی ہے۔

اس عالمِ نیرنگ میں جس کو ”بیدل جنوں سرا“ سے تعبیر کرتا ہے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں جو شراب جنوں کے نشہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بے پر کی اڑاتے ہیں جس کی تصدیق مشاہدہ اور تجربہ سے نہیں ہوتی، بیدل کہتا ہے کہ میں تو اس اہل نظر محقق کا غلام ہوں جو اس ”ادب گاہ ثبات“ میں اپنے ہوش و حواس درست رکھتا ہے، اگر بھوکا ہے تو مجنوں نہیں بنتا اور اگر پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو رنگ ریاں نہیں مٹاتا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

ما کذب الفواد ما رآی، در سول، نے جو کچھ مشاہدہ کیا اس میں اس کے
ما زاع البصر وما طعی لقا، دل نے کچھ جھوٹ نہیں ملایا، اس کی نظر نہ
رآی من آیت ربہ الکبریٰ، کسی اور طرف بہکی اور نہ اپنے اصلی مقام سے اچھا
وما لہم بہ من علم ان، کچھ شک نہیں کہ اس نے اپنے پروردگار کی
یتبعون الا الظن وان، قدرت کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے، (مشترکین
الظن لا یغنی من الحق، جو کچھ کہتے ہیں) ان کو اس کی تحقیق تو نہیں وہ تو
شیاء۔ نری اُٹکل پر چلتے ہیں اور اُٹکل کو حق سے دور کی

(۲۶) نسبت بھی نہیں۔

یہ نکتہ ازبر کرنا چاہئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

”ما کذب الفواد ما رآی“ کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئے۔

یہ ”کذب“ کیا ہے جو وہ نفسانی آرزو و نفس یعنی مشاہدہ میں ملا دیتا ہے، خواہشات نفس، تمنا، دوزارہ کار، توقعات، قیاسات ہیں۔

آں حضرتؑ کے ”مقام محمود“ کی بلندی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے

بیدل

کہ اس جاوہ ارتقاء کے ہر ایک مرحلہ اور ہر ایک منزل پر ”انا عبد اللہ“ ہی کہتے ہیں، اور بار بار فرماتے ہیں کہ ”ہا عرفناک حق معرفتک“ اسی سے معلوم ہوا کہ آپ کے ذہن میں کتنی وسعت تھی، بیدل نے مثنوی ”محیط اعظم“ میں کل انبیاء کی کیفیت بیان کی ہے کہ خمنانہ وحدت سے ہر ایک نے بقدر استعداد پیمانہ یا اور اپنے متبعین کو بھی اسی پیمانہ سے پلایا۔ اُمت نوح تو اتنی بدمست ہوئی اور عالم آب میں اس حد تک غرق ہوئی کہ پھر نہ ابھری۔ حضرت موسیٰ نے ساغر ”تشبیہ“ کو دور دیا۔ اُمت موئی اسی مادی دنیا کی نیزنگی میں مدہوش رہی۔ حضرت عیسیٰ نے قدح تنزیہ حواریوں کو پیش کیا۔ یہ منصور کی طرح ”انا الحق“ کہتے ہیں۔ اُن حضرت نے تشبیہ اور تنزیہ یعنی کثرت اور وحدت دونوں کی رعایت کی۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھایا اور اچھی طرح ذہن نشین کر دیا کہ ممکنات کبھی واجب کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ”لیس کمثلہ شی“ میں تنزیہ ہے اور ”هو السميع بصیر“ میں تشبیہ اس لئے اسلام جس کے ساتھ اُن حضرت مبعوث ہوئے کامل دین ہے۔

بیدل نے ان نکات میں نفسیات کا ایک اہم مسئلہ حل کیا ہے، وہ یہ کہ جو کچھ خارج میں محسوس ہوتا ہے وہ معین و شخص ہے ہر ایک شخص اشیاء کو ایک ہی طرح اور ایک ہی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے بشرطیکہ اس کے حواس درست ہوں۔ اس لئے اس کتاب کائنات میں کوئی ”ریب“ کوئی الجھن، کوئی شک یا شبہ نہیں، انھیں کا عکس یا ”ظل“ حواس کے ذریعہ قلب انسانی پر پڑتا ہے خواہ بالا راوہ ہو یا بلا راوہ ہے۔ ناممکن ہے کہ ہم آنکھیں رکھتے ہوئے سورج کو تو دیکھیں اور اس کی روشنی اور اس کے ماحول سے چشم پوشی کریں۔ تمام ارض و سما ایک ہی نظر میں ہمارے آئینہ دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ثبت ہوتے ہیں کہ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ ان کو محو کر سکے۔ یہ عکس ہمیشہ کے لئے قلب میں محفوظ ہو جاتا ہے، اگر یہ عکس من و عن ایسا ہی

ہے جیسا کہ خارج میں ہے، یعنی ہمارے ذہنی تصورات اور خارجی اشیاء جن کے یہ تصورات ہیں ایک ہی جیسے ہیں جسے اصطلاح میں ”عین“ کہتے ہیں تو یہ ”حق“ ہے اور اہل ذکر و فکر جانتے ہیں کہ یہ ”باطل“ نہیں۔ اگر کوئی باطل پرست یہ کہے کہ یہ ”مایا“ اور ”فریب نظر“ اور ”ہیچ“ ہے تو بیدل ایک رباعی میں کہتا ہے کہ ”از باطل سخن حق کہ باوردار د، جو شخص کائنات کو باطل کہتا ہے وہ خود بھی تو باطل ہے اس لئے کہ کائنات کا ایک جزو وہ بھی ہے۔ اور بقول بیدل ”باطل از باطل پروید حق ز حق“۔ باطل سے باطل ہی پیدا ہوگا، اس باطل کا جو دعویٰ ہے باطل ہی ہوگا۔ بیدل مثنوی ”عرفان“ میں کہتا ہے کہ ان باطل پرست لوگوں کو اتنا شعور نہیں کہ ”یقینہ خفتہ در ہر پردہ ظن“ وہ کچھ بھی کہتے ہیں یقین کے ساتھ ہی کہتے ہیں۔ اگر کہتے ہیں کہ یہ عالم باطل ہے تو ان کو اتنا تو شعور ہونا چاہئے کہ وہ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ، اور اگر کہیں کہ سچ کہتے ہیں تو یہ حق اس بینہ جہاں باطل میں کہاں سے آگیا۔ غرض انسان جو کچھ بھی کہے یا تصور کرے اس کی تہ میں ”حق“ کی موجودگی واجب ہے اور اگر نہ ہو تو یہ محض وہم محال اندیش ہے۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کی تحقیق اس کی اپنی حد تہ ہے۔ ایک رباعی میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ سایہ خاک پر تو سیاہ نظر آتا ہے لیکن پانی میں تمثال ہے جس نے سایہ خاک پر دیکھا اس نے اسے سیاہ کہا۔ وہ بھی سچا ہے اور جس نے پانی میں دیکھا اس نے تمثال سے تعبیر کیا، یہ بھی سچ کہتا ہے دونوں حالتوں میں سایہ ایک مشترک شے ہے، تنازعہ اگر کچھ ہے تو اس کی صورتوں میں ہے تو یہ شاید کی حد نظر پر موقوف ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ باطل دیکھتے ہیں۔ اس حد تک مشاہدہ عین خارجی اشیاء اور ذہنی کے مطابق ہے اسی کا شعور ”علم“ سے موسوم ہوتا

بیدل

ہے چنانچہ بیدل لکھتا ہے کہ

چسیت علم؛ اصل قدرت بیچوں
نظم جمعیت ظہور و بطون
حسن مرآت عالم و معلوم
نور تمیز حاکم و محکوم
نزد اصل حقیقت ایجاد
ہرچہ بینی ز مفرد و ترکیب
دارد از علم جو ہر ترتیب

علم کیا ہے؟ قدرت بیچوں کی اصل، جو ظاہر یعنی آفاق یا خارج میں ہے اور جو کچھ ذہن یا قلب انسانی میں اس کا عکس ہے ان میں عین مطابقت کا شعور علم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں عالم اور معلوم دونوں جلوہ نما ہوتے ہیں، یعنی جاننے والا عالم اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسے کسی شے کا علم ہو اور وہ شے معلوم اسی حالت میں کہلا سکتی ہے جب اسے جاننے والا بھی کوئی ہو۔ اس لئے عالم و معلوم میں ربط علم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہمیں کسی شے کا علم نہ ہو وہ بمنزلہ عدم ہے۔ اس لئے ہر ایک شے معلوم کا ظہور یا انکشاف یا احساس یا ادراک علم کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، نتیجہ واضح ہے ہر ایک شے خواہ مفرد ہو یا مرکب علم ہی سے اس کی حقیقت ہے جس سے وہ مرتب ہوئی ہے۔

اس نظم کا اوّل اور آخری بیت غور طلب ہے۔ یہ کہ اس کائنات کا نظم و نظام ایسا پختہ ہے کہ اسے کوئی طاقت غیر اللہ توڑ نہیں سکتی۔ اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا پیدا کردہ نہیں۔ اسی کائنات سے ہمارے تمہارے علوم ماخوذ ہیں اگر یہ باطل ہو تو ہمارے علوم بھی باطل ہیں۔ بقول بیدل "باطل از باطل بروید حق ز حق"۔ اس لئے اس کائنات کی پیدائش میں بھی علم ہی کار فرما ہے، جسے لسان مذہب میں علم الہی کہتے ہیں۔ اسی آئینہ کائنات میں اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادت کی قدرت اور خود کائنات معلومہ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ تصوف کی جان اور اصل اصول ہے۔

اس لئے اشیاء محسوسہ، معینہ و مشخصہ کے سوا اگر کچھ نظر آئے تو بقول بیدل محض سودا ہے، ہم نے ”چہار عنصر“ میں سے بعض واقعات کا حوالہ دیا ہے جو بیدل نے اپنی سرگزشت کے ضمن میں قلم بند کئے ہیں۔ اگر جنات بھی ایک مخلوق ہیں اور موجود ہیں خواہ وہ غیر مرئی ہوں تو بحث تحصیل حاصل ہے۔ اور اگر نہیں تو محض قوت و اہمہ کا کرشمہ ہے، اور بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ ایسی مخلوق ضرور موجود ہے۔ لیکن اکثر اوقات لوگ عالم اوہام میں وہ کچھ تصور کرتے ہیں جس کی تحقیق نفس الامر میں نہیں ہو سکتی۔ یہ محض جنون اور واہمہ کا غلبہ ہے۔ بہر حال بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ خارج یا اتفاق میں موجود ہے خواہ اس کا وجود مرئی یا غیر مرئی ہو اگر اور کچھ نظر آئے تو باطل ہے، یاد رہے کہ ”باطل“ کا مفہوم محض ”عدم“ نہیں جس کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا، باطل وہ ہے جو بے نتیجہ اور عبث ہو جس سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو ڈھرا سکتا ہے۔

بیدل نکات میں کہتا ہے کہ :-

”گفتگوئے ارواح و مثال بیروں اعتبارات جسمانی مہمل است،
و گیر و دار عالم اجسام بے بادہ مثال و ارواح معطل، جسم را
قبل از آثار پیدائی در حقیقت روح مخفی فہمدن است چوں
کیفیت کوزہ در گل، و روح را بعد از نشائی ظہور، اجزائی جسم
منزوی دیدن، چوں صورت خیال در دل، تا حضور صورت معرض
جلوہ نیاید معنی ہیولادہ جہاں صور باطن اشکال بودن است، و
صورت مرتبہ ہیولا معنائی ہماں کیفیت کشودن، اگر ہیولا بے صورتے
متصور است صور از کجائی جو شد و اگر صورت از لباس قدرت

عاریست ہیولا را کہ می پوشد“

ہر چہ خاکسار ہیولائی گل است گل نادیدہ ساز ہیولائے خاک شد
رمز صفائے آئینہ با واشگافتم اسم کدورت است کہ از سنگ پاک شد

بیدل

چوں باز عرض نوبت زنگار وارسید آئینہ رابنگ ہماں اشتراک شد
 خورشید اگرچہ شب بسک بال می زند روزانہ دیدہ کہ با وج سماک شد
 یک رشتہ بود پا دسرے اعتبار دہر خلقے بہ پیچ و تاب تو ہم ہلاک شد

اس نکتہ کا مفہوم یہ ہے کہ ارواح اور مثال کے بارہ میں بحث اس مادی کائنات سے باہر بالکل بے معنی بات ہے اور مادہ یعنی عالم اجسام میں جو یہ گیر و دار کا شور برپا ہے روح کے بغیر متصور نہیں ہو سکتا۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک شے یا حقیقت جسم اور روح ہے جسم کے ظہور سے پہلے یہ جسم روح مخفی یعنی غیر مرئی یا پوشیدہ تھی، جیسے کیفیت یا صورت کوزہ مٹی میں ہو۔ مٹی میں یہ قابلیت ہے کہ اس سے کوزہ بنتا ہے۔ اور اگر یہ قابلیت نہ ہوتی تو کوزہ ظہور میں نہ آ سکتا، اسی طرح روح میں اجزاء جسم یا مادہ پوشیدہ ہیں جو ظہور کے بعد مشہود ہوئے، جیسے صورت خیال دل میں، مطلب یہ ہے ایک قابلیت ”بالقوہ“ موجود تو ہوتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور یا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ ظہور میں آئے جیسے ایک دانہ میں درخت، جب یہ دانہ زمین میں بویا جاتا ہے اور پھوٹتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ قابلیت شجر کی صورت میں رونما ہوتی ہے یعنی یہ قابلیت اب ”فعل“ میں آئی اور ہمیں معلوم ہوا کہ پہلے پوشیدہ یا ”بالقوہ“ دانہ میں موجود تھی، اس لئے ہر ایک شے جو بالقوہ ہو یا بالفعل ضرور ہے کہ اس کا ہیولا پہلے موجود ہو۔ ”عدم موجود گردد ایس محال است“ عدم موجود نہیں ہو سکتا، یہ ناممکن ہے لیکن ہیولا بھی ایک قابلیت صورت ہے۔ یعنی صورتیں اس میں بالقوہ موجود ہیں اور خود بھی بے صورت نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو یہ تمام صورتیں کہاں سے آئیں ظاہر ہے کہ ہیولا ہی کی پیداوار ہیں۔

اگرچہ آدم کی پیدائش طین سے ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ ”طین“ میں قابلیت یا بالقوہ آدم موجود تھا جب یہ قابلیت فعل میں آئی تو آدم کا

ظہور ہوا۔ قرآن میں بھی ہے کہ انسان کی تخلیق کی ”ابتدا“ طین سے ہوئی، آدم ظہور میں نہ آیا تھا لیکن ”طین“ پہلے موجود تھی، لفظ ”بدا“ قرآن میں ”خفی“ کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو شے ”خفی“ تھی اس کا ظہور ہوا، قانون فطرت یہ ہے کہ ہر ایک شے جو ظہور میں آتی ہے اس کا مادہ یا ”ہیولا“ پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ

ہیچ شکلی بے ہیولے قابل صورت نشد

آدمی ہم پیش ازاں کا دم شود بوزنیہ بود

اہل علم و حکمت کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کوئی شکل بلا ہیولا

قابل صورت نہیں ہوتی، اس لئے آدمی بھی پیشتر اس کے کہ آدم سے موسوم ہو بند تھا۔ بیدل نے اس شعر میں ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ہیولا بھی ایسا ہونا چاہئے جس کی صورت اس شکل سے ملتی جلتی ہو جو اس سے قانون ارتقاء کے تحت پیدا ہو۔ آدمی طبقہ حیوانات میں ممتاز درجہ پر نظر آتا ہے اس لئے اس کا ہیولا اس طبقہ میں ایسا ہونا چاہئے جو اس سے بہ نسبت دیگر حیوانات زیادہ تر مشابہ ہو اور یہ بند ہے۔

مسئلہ ارتقاء پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ سر دست ہم صرف

بعض نکات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ درحقیقت جسے

روح اور مثال اور جسم کہتے ہیں ایک ہی حقیقت کے مختلف نام اور اس کے

ارتقائی درجات ہیں۔ عالم اجسام یا مادی دنیا صرف عالم صورت ہے۔ ”باصرہ“

میں رنگ اور روپ، ”لامسہ“ میں سختی و نرمی، سردی و گرمی اور علیٰ ہذا القیاس

لیکن ان صورتوں میں ”حقائق“ رونما ہوتے ہیں، اور یہ اصل شے ہیں، ”حقائق

مجردہ“ کا احساس تو انسان کو ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان کو حواس اسی نے

دئے گئے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں ان کا احساس ہو۔ ناممکن ہے کہ انسان

کو بلا صورت حقائق شیاء کا علم ہو۔ اس لئے مجرد معانی دل میں بلا حروف

بیدل

محسوس نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی خیال بلا صورت مثالی ذہن میں متصور نہیں ہو سکتا۔
بیدل نکات میں روح و مثال و جسم پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔ روح اصل
حقیقت ہے لیکن یہ غیب ہے اور غیب ہی رہے گی، بیدل کے الفاظ حسب ذیل
ہیں:-

”غیب مطلق مرتبہ ایست کہ باعتبار مفہوم مجاز حقیقۃ الحقائق
نامیدہ اند، و غیب اضافی نشاء کہ بحسب لطافت تمام عالم
ارواحش معین گردانید، و غیب متمثل لطافتی موسوم مثال بحکم
میلان کثافت آرائی، و غیب مصور کیفیتی منقوش اجسام بمقتضای
کمال کثافت یعنی ختم مرتبہ پیدائی، پس غیب مطلق یعنی حقیقت
الحقائق خفائی محض است منقطع الاشارات مشعر حقیقت ذات و
غیب اضافی خفائی معین نفی اشارات مطلق اسماء و صفات و غیب
مصور شہود و یقینی حسن و شعور“

ہمہ غیب است شہود ایں جان نیست
اصل ہر سوسن و گل نیز نگہ نیست
شعلہ خاکستر محض است آخر
نتواں جلوہ مطلق دیدن
اعتبارات ہمہ اوہام اند
مفہوم اس نشر و نظم کا یہ ہے کہ جسے ہم ”شہود“ سے موسوم کرتے ہیں وہ
بھی غیب ہے۔ اس غیب کی حقیقت کا ہمیں احساس تک نہیں ہو سکتا
کیونکہ وہ مطلق مجرد ہے۔ اس کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اصلاح تصوف
میں اسے غیب مطلق یا حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ اس مرتبہ غیب الغیب یا
”لا تعین“ میں تمام اشارات منقطع ہیں، اس مرتبہ میں چونکہ وہ کسی اسم و
صفت سے موسوم و موصوف نہیں اور ہم بلا اسم و صفت کچھ سمجھ ہی نہیں

سکتے اس لئے اس کو ”الہ“ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کلمہ توحید کے شروع میں اسی اشارت کی نفی کی گئی ہے ”لا الہ“ لیکن فہم و تفہیم کے لئے اسے غیب الغیب یا حقیقۃ الحقائق اور احادیث اور ایسی ہی عبارت سے موسوم کرتے ہیں، یہی غیب بحسب لطافت ”روح“ سے موسوم ہے۔ اس کو اصطلاح میں غیر اضافی کہتے ہیں۔ یہ خفائی معین ہے۔ تیسرا مرتبہ غیب متمثل ہے، اگرچہ یہ بھی خفی ہی ہے مگر اس کا شہود ذہن انسانی میں ہوتا ہے۔ چوتھا مرتبہ غیب مجسم، اس میں بوجہ کمال کثافت ظہور اپنے منتہائی عروج پر ہوتا ہے۔ عام فہم لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کسی شے کی ”کنہ“ معلوم نہیں ہو سکتی ہمیں جو کچھ معلوم ہے یا معلوم ہو سکتا ہے وہ اس شے کی صفات ہی ہیں جنہیں ہم کسی اسم سے موسوم کرتے ہیں، اس کی مثال یہ کائنات ہے جو محسوس و مشہود و معین و مشخص ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ صرف صورتوں کا مجموعہ ہے، جو محسوس ہو رہی ہیں۔ قانون معرفت یہ ہے کہ مثل ہی مثل کو پہچانتی ہے، نور کا ظلمت پر امد ظلمت کا نور پر قیاس نہیں ہو سکتا ایک رباعی میں بیدل نے یہی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اصداد ایک دوسرے سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس لئے روح روح کو مثال مثال کو جسم جسم کو ہی پہچان سکتا ہے، چونکہ انسان ان تینوں کا جامع ہے اس لئے تینوں کی معرفت اس کے لئے ممکن ہے۔ جب کوئی مادہ پرست دہریہ یا مشکک یہ کہتا ہے کہ ہمیں اس عالم اجسام کے علاوہ کسی اور شے کا علم نہیں یہ ”دہر“ ہی ہے جس میں ہمارا مرنا جینا ہے۔ مرکز ہڈیاں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئیں تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی زندگی ہمارے لئے نہیں۔ تو وہ جہاں تک اس کا مشاہدہ حسی ہے سچ کہتا ہے، اس کی تحقیق یا نظر اسی حد تک ہے۔ وہ مادی کثافت یا صورتوں میں اتنا مجبور ہے کہ اس لطیف حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا جو ”من وراء حجاب“ صورت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس حقیقت کو مادی ابصار درک نہیں کر سکتی، لیکن مثل کو مثل پہچان سکتی ہے۔ روح کو روح کی معرفت

بیدل

ہی حاصل ہو سکتی ہے، اس لئے اہل مذاہب روحانیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

راقم الحروف کے مطالعہ سے وہ مباحثہ بھی گزرا جو مسٹر مل (اور سروولیم ہملٹن) میں دربارہ معرفت رہا، اس پر تبصرہ ہربرٹ سپنسر (نے لکھا۔ مسٹر مل کی یہ رائے تھی کہ معرفت اضداد سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نور و ظلمت جب دونوں کا تصور ہمارے ذہن میں ہوگا تو ان میں امتیاز سے ہم ان سے روشناس ہوں گے۔ سروولیم ہملٹن نے یہ اعتراض کیا کہ بلاشبہ اضداد سے امتیاز کا احساس تو پیدا ہوتا ہے لیکن ان کی معرفت نہیں ہو سکتی۔ پانی کے ایک قطرہ پر ہم بحر کو قیاس تو کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ لیکن پانی کو آگ پر قیاس نہیں کر سکتے، معرفت تو یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہو کہ پانی اور آگ خود کیا شے ہیں۔ ہربرٹ سپنسر نے سروولیم ہملٹن کی تاثر کی، اہل تصوف کا یہ پامال شدہ مسئلہ ہے کہ مثل ہی کو مثل کی معرفت ہوگی۔ اسی کو اصطلاح تصوف میں ”عینیت“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن ”عینیت“ کا صحیح مفہوم شیخ اکبر نے یہ واضح کیا ہے کہ جب تک ہم کسی شے کا ہیولا خود نہ بن جائیں ہمیں اس شے کی معرفت تامہ حاصل نہیں ہو سکتی، یہ تو ظاہر ہے کہ جیسی زید کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے ویسی عمرو کو زید کی نہیں، عمرو اگر زید بن جائے تو عمرو زید کا ”عین“ ہوگا۔ اسی طرح ہر ایک طبقہ میں ہر ایک شے کی معرفت کلی اس شے کے عین بننے ہی سے ممکن ہے ”ہر کہ درکار نک رفت نک شد“ اس لئے دوئی یعنی غیر کی نفی اور وحدت کا اثبات ہی حق شناسی ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس عالم اجسام میں ہر ایک صورت اپنی مثل کو پہچانتی ہے، ”کند ہم جنس با ہم جنس پرواز“ سوال یہ ہے کہ روح کو روح کس طرح پہچانتی ہے۔ ان نکات کو اگر ملا کر پڑھا جائے جن کا حوالہ

ہم بلفظہ دے چکے ہیں تو بیدل کا نظریہ معرفت بھی واضح ہو جائے گا۔ بیدل ایک اور نکتہ میں لکھتا ہے کہ :-

”گواہ قوت جسم آدمی ست سعی در ادائی شرائط عبادت، و شاہد قوت عقل توجہ بر اکتساب علوم و حکمت، و دلیل قوت روح پرواز ہمت بعروج نسبت وحدت، مادہ ایں ہر سہ قوت مقدار اعتدال غذاست کہ بہ تقویت آن جسم توانا شود بر قدرت اعمال، و عقل اعانت یابد در سعی تحصیل کمال، و روح بال کشاید بفضائے محبت ذوالجلال، اگر اسباب غذا منفقود باشد، تردد جسم در طلب وجہ معیشت مانع ذوق عبادات است، و تصرف عقل در تدبیر حصول آن محروم کسب علم و حکمت، و توجہ ریح از تشویش اینہا بر جمع سر منزل جمعیت“

با خشک و تر ماندہ لیل و نہار قانع شو، جمعیت دل مفت انگار
آن دولت جاوید کہ خلدش نامند رزقیت کہ بے تردد آید بکنار
یہ حقیقت عام مشاہدہ ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی قوت کا اندازہ
مکالیف شرعیہ کی برداشت سے ہوتا ہے، اور قوت عقل کی شہادت بقدر
اکتساب علم و حکمت سے ملتی ہے، اور روح کی قوت کی دلیل اس کی ہمت
پرواز میں فضائے وحدت کی طرف عروج میں ہے۔ ان تینوں قوتوں کی اصل
اعتدال غذا ہے، غذا جسم کو تقویت دیتی ہے جس سے وہ اعمال پر قادر ہوتا
ہے، اور عقل کو مدد ملتی ہے کہ وہ کمال حاصل کرنے کی کاوش میں مصروف
ہے جو اس کی ہستی کا غشاء ہے۔ اور روح میں قوت پرواز فضائے محبت
ذوالجلال میں پیدا ہوتی ہے، اگر اسباب غذا منفقود ہوں تو ظاہر ہے، کہ
جہاں تک عبادات کا تعلق ہے۔

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

بیدل

نہ تو ذوق عبادت پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو عبادت کا ہے، اور جب بھوک پیاس سے حواسِ خمسہ ہی میں خلل واقع ہو تو عقل کو علم و حکمت کی کب سوجھ سکتی ہے۔ اس لئے عقل ان کے کسبِ محروم ہو جائے گی، اور جب تشویشِ دل میں پریشانی پیدا کرے گی تو روح کو بھی جمعیتِ خاطر حاصل نہ ہوگی۔

تذکروں میں بیدل کی تنومندی کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ تیس سیر کا عصا اس کے ہاتھ میں پر گاہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دل و دماغ کی صحت کا اندازہ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر سے ہو سکتا ہے جس کا شاہد اس کا کلام ہے۔ اس کی تحقیق کی داد دینی چاہئے جو وہ نکات میں بیان کرتا ہے کہ ”ریاضت“ سعیِ جسد و عقل و روح ہے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال شرط ہے۔

”ریاضت صفائی باطن می آرد بشرط اعتدال
وضع بر قوی می گمارد با فراط کمال“

ریاضت سے صفائی باطن ہوتی ہے اگر اعتدال ملحوظ رکھا جائے اور اگر اسے رہبانیت کی حد تک پہنچا یا جائے تو قوت کمزور ہوتے جائیں گے۔ غرض ریاضت تو یہ ہے کہ موادِ فاسدہ کی اصلاح کی جائے نہ کہ اجزاءِ صالح کو فاسد کرنا۔ آئینہ سے زنگ لکڑی دور کرنا ہے نہ کہ مشقِ عقل سے آئینہ کے وجود کو دور کرنا۔ مشہور روایت ساکھی منی گوتم بدھ کی ہے کہ اس نے اس حد تک مجاہدہ حاکم اور ریاضت شاقہ کی کہ ایک مٹہ اٹھواں رو گیا۔ آخر اس پر وہی کچھ منکشف ہوا جو بیدل بیان کرتا ہے، اس لئے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ ریاضت جو اعتدال سے تجاوز کرے بے فائدہ ہی نہیں نقصان دہ بھی ہے۔ شاگرد تو منی کے مجاہدہ پر گرویدہ ہو رہے تھے جب دیکھا کہ منی نے کھانا پینا ترک کیا ہوا ہے تو عقیدت مند رہے جب منی

نے پھر کھانا پینا شروع کر دیا اور جسم پر گوشت پوست میں تروتازگی پیدا ہونے لگی تو بدظن ہو کر کنارہ کیا۔

ان نکات میں بیدل بھی اپنی وارداتِ قلب بیان کرتا ہے چہار عنصر میں اس نے واقعات بھی لکھے ہیں۔ اور یہ نکتہ تو آپ زر سے لکھنا چاہئے کہ بھوک کی شدت سے صفر بڑھ جاتا ہے اور صفر اسے سودا، صاحبِ ریاضت او ہام میں عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے، سودائی بھی اسی عالم میں یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ معیارِ صداقت صرف کتابِ کائنات ہے، لاریب فیہ، اس لئے اشیاءِ محسوسہ معینہ کی صورتوں کے سوا اور کچھ نظر آئے تو سمجھو کہ ”ہمہ سودا است“۔

کائنات اور کائنات کی اشیاء کو جیسی کہ وہ ہوں ان کی اصل صورت سے مشاہدہ کرنا اور اسی نظم و نظام میں مشاہدہ کرنا جیسا کہ کائنات میں کار فرما ہے، صحیح تصور ذہن میں کائنات کا پیدا کرنا ہے، یہ جاوہ معرفت پر پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد ان تصورات میں حقائق کی تلاش تذکر و تفکر سے شروع ہو جاتی ہے، یہی جستجوئے حق اصل عبادت ہے اور عبادت کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

انبیاءِ عمرے نفس ہادر تردد سوختند

کیں حقیقت غافلان شاید بنجود محرم شوند

انبیاء علیہم السلام تمام عمر اسی تردد میں گھلتے رہے کہ عوام جو حقیقت سے نافل کا لالچاں ہیں شاید اپنے آپ سے محرم ہوں ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“

در عبادت ہاست یکسر عرض ترکیب سجود

تا دریں صورت دے سوئے گریباں خم شوند

عبادت میں بھی قیام و رکوع و سجود ہے۔ اور سجود غایت عبادت ہے۔ اس کی غرض بھی یہی ہے کہ اسی صورت میں جھک کر اپنے گریباں میں منڈالیں

بیدل

اور فکر کریں کہ ہم کیا ہیں۔

سعی ناموس کرم معروف این شغل ست بس
کایں خراں بیروں جہند از غولی و آدم شود
آیہ کریمہ ”لقد کو منابنی آدم“ شاہد ہے کہ بنی آدم کو تمام مخلوقات میں
سے خلعت مکرم پہنایا گیا۔ اور اس لئے آدمی اشرف المخلوقات ہوا۔ اور
خلیفہ فی الارض اور مسجود ملائک ہے ایک حیوان اگرچہ ناطق ہے۔ اس لئے
اگر یہ خود ہی اپنے ثنوف اور شرافت سے بے خبر رہے تو کالانعام بلکمان سے
بھی گیا گزرا۔ انبیاء اسی کوشش میں ہمیشہ رہے کہ لوگ اس حقیقت سے
واقف ہوں یعنی خود شناس ہوں، جب خود شناس ہوں گے تو انسانیت
کے صحیح مقام سے واقف ہو کر ”سنحرکم ما فی السموات وما فی الارض
جمیعا منہ، ان فی ذلک الایت لقوم یتفکرون“ کے مصداق بھی
ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ آفاق میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ مادیات ہیں، انہی
کو ہم اپنے ذہن میں تصورات کی صورت میں لاتے ہیں۔ گویا یہی عالم خارجی
ہمارے قلب میں عالم مثال ہے جس میں مادی کثافت لطافت سے
بدل چکی ہے۔ اب ہم خارج کو نہیں دیکھتے، بلکہ تذکر و تفکر اسی عالم
مثال میں کرتے ہیں۔ جادہ تحقیق پر یہ دوسرا قدم ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ خارج میں ہے وہ کچھ ہمارے
قلب میں ہے۔ اس لئے بقول بیدل

”ظاہر این جا باطن است و باطن این جا ظاہر است“

ہمیں تلاش حق میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ”سخن“ کے
تحت بیدل نے جو کچھ لکھا ہے جس کا حوالہ ہم ”چہار عنصر“ کے تحت دے
چکے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک شے ہم سے ہم کلام

بیدل

ہو رہی ہے اور انہی تصویری حروف میں اپنے حقائق ہم پر واضح کر رہی ہے۔ عارف
رومی بھی کہتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل
اتنا تو سوچنا چاہئے کہ آج تک جو حقائق دریافت یا منکشف ہوئے
ہیں وہ کیسے ہوتے اگر اشیاء خود ہی ہم سے ہم کلام نہ ہوتیں جب بالا راہہ بیداری
میں ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو بحالت خواب ہمارے حواس ظاہری معطل
اور ارادہ سلب ہو جاتا ہے یہی تصویری حروف یا مثالی صورتیں ہمارے
دوبرو ہماری توجہ کو جذب کرتی ہیں۔ غرض یہی ہے۔

”کایں خراں بیروں جہند از غولی و آدم شوند“

ہم لکھ چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی کی معرفت ہوتی ہے، اس کی حقیقت خواہ
خارج میں کہو یا باطن میں ایک ہی ہے، جب عارف سالک پر یہ حقیقت علماً
و عملاً منکشف ہوتی ہے تو خواہ زبان سے ”انا الحق“ نہ کہے وہ خود حقیقت
مجسم ہوتا ہے یہ مسئلہ وحدت وجود دقیق ہے، مزید تشریح جہاں تک ممکن ہے
غزلیات کے تحت کی جائے گی۔

چشم خود میں زحمت اندیشہ باطل نبرد
محرم یلی بہ آب شوق بر محمل نبرد

جواہل نظر خود شناس ہے وہ حق شناس ہے۔ اس لئے باطل کا خیال
اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا جو مجنوں یلی کا محرم ہے وہ محمل کو نہیں دیکھتا۔
جو حقیقت پرست ہے وہ صورت یا بت پرست نہیں ہوتا۔

سیر معنی از خم و پیچ عبارت فارغ ست
قاصد ملک تقدس رنج آب و گل نبرد

جواہل علم و حکمت معانی سے واقف ہے وہ حرف و صوت سے بے نیاز
ہو جاتا ہے، ”قاصد ملک تقدس“ یعنی روح آب و گل سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

بیدل

مصری اور ایرانی اور ہندی اور یونانی نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور روح دو علاحدہ علاحدہ اشیاء ہیں۔ اور یہ کہ روح مادی صورتوں میں چکر کاٹتی رہتی ہے جسے ”تناسخ“ کہتے ہیں۔ بیدل اور تمام علماء اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حقیقت ایک ہی ہے البتہ صورتیں مختلف ہیں۔ اور مادہ محض صورت ہے۔ اور صورتیں محض عوارض ہیں جو ہر آن بدلتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں لیکن حقیقت تغیرات سے پاک ہے۔ اس کی تائید میں بیدل نکات میں کہتا ہے کہ :-

”آئینہ از لسنخہ دل فہم کنی اگر ہمہ نقطہ ایست چوں مردمک طوفان
از جانی برد، و ہرچہ از خارج جمع غائی ہر چند دفتر است در چشم
کشودن چوں مرثہ برہم می خورد“

جو کچھ لسنخہ دل کے مطالعہ سے تیرے فہم میں آئے اگرچہ وہ بقدر ایک نقطہ ہی کیوں نہ ہو وہ آنکھ کی پتلی کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے گا طوفان گر یہ اسے متزلزل نہیں کر سکتا۔ اور یہ جو کچھ تو خارج سے جمع کرے گا خواہ وہ دفتر ہی کیوں نہ ہو آنکھ کی بھپک میں محو ہو جائے گا۔ اس موضوع پر بیدل نے لطیف شعر لکھے ہیں۔ غریبات کے تحت ان کا حوالہ دیا جائے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھو تو ایک دنیا اور اس کی رنگینی مشاہدہ ہوگی لیکن آنکھ بند کرو تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔ البتہ جو روح دل پر ثبت ہے وہ ہمیشہ پیش نظر رہے گا خواہ بیداری ہو یا خواب۔



محیط اعظم

مولانا ظہوری کا شاہکار ”ساقی نامہ“ ہے، بیدل کی مثنوی کا موضوع بھی یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے یہ مثنوی مولانا ظہوری کے جواب میں ہی لکھی، مثنوی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ :-

”اما بعد ایں میخانہ حقائق است نہ ساقی نامہ اشعار ظہوری، آئینہ پرداز دقائق است نہ زنگار فروش خار بے شعوری“

مفہوم تو یہ ہے کہ اس مثنوی کو مولانا ظہوری کے ساقی نامہ پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔ یہ میخانہ حقائق ہے، اور جو کچھ نکتہ آفرینی اس میں کی گئی ہے، وہ بات ظہوری کے ساقی نامہ میں نہیں۔

اصطلاح تصوف میں ”ساقی“ سے مراد ذات حق تعالیٰ ہے۔ یہ اصطلاح آیہ کریم ”و سقہم ربہم شرباً طہوراً“ سے اخذ کی گئی ہے۔ بیدل نے میخانہ عشق الہی کو آٹھ دوروں میں تقسیم کیا ہے، ”دور اول“ میں ”جوش اظہار بزم وجود“ کے تحت بزم قدم کا بیان کیا ہے۔ یہ مقام ”لا تعین“ جیسا پہلے تھا اب بھی ہے۔ ”الان لکما کان“ اس بزم قدم میں ”مئے بود بے نشہ کیف و کم“ یعنی ظہور اسماء و صفات نہ ہوا تھا۔

منزہ ز اندیشہ حادثات میرا ز درد و غبار و صفات
 ”دور ثانی“ میں ”جام تقسیم گلستان شہود“ کے تحت بقول خواجہ حافظ
 ”گل آدم بسرشتند ذبہ پیمانہ ز دند“ آدم کی مٹی کو اسی مے سے گوندھا گیا۔
 نصیب ازیں مے با آدم رسید ز حبیب خمار عدم سر کشید
 بیدل نے ایک بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ :-

اگر گندمش راہ زن شد چہ باک کہ مست و ناز خطا ہا ست پاک
 کسی را کہ پیر مغال بر گزید ز عصیاں گلے جز ہدایت پخید
 بود و صف مستان ظلوم و جہول کہ کردند سر جوش مستی قبول
 یعنی اگر شجر ممنوعہ کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ تو یہ ایک ایسی خطا تھی کہ
 جب آدم متنبہ ہوا تو توبہ بھی کی اور وہ قبول بھی ہوئی۔ اولاد آدم بلاشبہ
 خطا کار واقع ہوئی ہے۔ لیکن اسی خطا میں اسے راہ صواب بھی نظر آتی ہے۔
 جو شخص مست ہوا سے ظلوم و جہول کہو تو بجا ہے لیکن اسی ظلم و جہل سے
 احساس عدل و علم و عدل بھی آدم کو ہوا۔ بہر حال پیر مغال یعنی حق تعالیٰ
 نے جب اسے کل مخلوقات میں سے انتخاب فرمایا۔ اور کل کائنات میں
 امتیاز بخشا یہاں تک کہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کے حضور جھکوا اور جو ذرا
 اکڑا راندہ درگاہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ملائکہ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں ہر وقت
 مشغول ہیں اور یہ کہ آدم مفسد اور خونریز بھی ہے۔ مگر ایک خاص بات آدم
 میں ہے کہ ان تمام برائیوں اور گناہوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شخصیت
 ممتاز ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ

انساں کہ فلک ہا ست سرافگند او در حیرت او گم است دانندہ او
 دارد خاصیت کہ در خارج و ذہن ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او
 اور قرآن کا ارشاد بھی ہے کہ ”سخر لکم ما فی السموات وما فی
 الارض جمیعاً منہ“ ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون ”تمام کائنات

محیط اعظم

۱۳۳

آدم کے لئے مسخر کی گئی ہے۔ یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ تمام مخلوقات اس کے تابع فرمان ہے، یہ وہ موضوع ہے جو بیدل کا خاص ہے۔ اس پر مفصل بحث مناسب مقام پر کی جائے گی، اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم نے ”رموزِ خودی“ میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے اور ”اسرارِ بخودی“ میں یہی نکتہ ہے جس کی رنگینی کو بیدل نے نمایاں کیا ہے۔

یہ دور آدم سے اولادِ آدم میں گردش کرتا رہا۔ اس بزم میں جو نمایاں طور پر سرخوش مستی تھے وہ انبیاء تھے اور ان کے خدیوہ ان کے متبعین بھی اس فیض سے مالا مال ہو گئے۔ حضرت نوح کی نسبت بیدل لکھتا ہے :-

ازاں بادہ چوں نوح شد کامیاب
جہاں دید نقش ز موج شراب
جب اس شراب سے نوح کامیاب ہوا تو موج شراب میں جہاں ایک
نقش نظر آیا۔

بدورش طبائع چناں گشت مست
کہ از بخودی رنگ صہبا شکست
اس کے اپنے دور میں لوگ اس حد تک بدست اور بخود ہوئے کہ
”رنگ صہبا شکست“ طراب بھی حیران ہو کر رہ گئی۔

شکستن تحیر بجائی رساند کہ در جام وینا صدائی نماند
یہ شکستگی اس حیران کن درجہ تک پہنچ گئی کہ جام اور وینا میں آواز
تک نہ چھوڑی۔

زہمپ نہ جہل خلقی در آب فرورفت چوں دردے در شراب
قوم نوح نے جہالت کے پیانہ میں شراب اُنڈیل کر پی۔ پانی میں
اس طرح غرق ہوئے جس طرح تلمیٹ شراب کے پیالہ کی تہ میں بیٹھ جاتی ہے۔

براں قوم شد موج طوفان ہوا کہ در آب آرام گیر و غبار
 قوم نوح کی بدستی کی یہ کیفیت تھی کہ طوفان کی موجیں اس کے سر پر
 سوار ہو گئیں، جس طرح پانی میں غبار یا خاک تہ پر بیٹھ کر قرار لیتی ہے
 اسی طرح جب تک عالم آب ان کے سر سے نہ گزر گیا وہ بھی عین سے نہ
 بیٹھے۔

بہر سر ز بس بادہ مستی گماشت کس از عالم آب سر بزداشت
 چونکہ ہر ایک فرد قوم کے سر پر شراب کا نشہ پورے زور پر تھا کسی کو
 عالم آب سے ابھرنے کی ہوش نہ تھی، ان اشعار میں بیدل نے ”عالم آب“
 میں لطف پیدا کیا ہے۔ اور طوفان نوح سے خوب مناسبت پیدا کی ہے۔
 بطوفان حیرت فزائی خطیر ہماں کشتی مے شدش دستگیر
 حضرت نوح اس طوفان سے کشتی کے ذریعہ بچے، اس شعر میں بھی
 عالم آب کو عبور کرنے کا ذریعہ ”کشتی مے“ بتایا ہے، اسی طرح بیدل تمام
 انبیاء کا ذکر کرتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کے خاص خاص حالات میں اسی
 شراب طہور کی بادہ پیائی کے ساتھ مناسبت واضح کرتا ہے۔ یہ دور آنحضرت
 پر ختم ہوا۔

جہاں را بسر جوش عرفاں سلبد ز بدستی خمر غفلت رہاند
 تمام دنیا جہاں کے لوگوں کو شراب معرفت پلا کر اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا،
 خمر غفلت کی بدستی سے نجات دلائی، چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ”شراب وفا
 یافت در جام صدق“ اسی طرح فاروق اعظم ”عمر یافت کام از مے عدل و
 داد بر آفاق چوں استوا خط نہاد“ عثمان ذی النورین ”ز سر جوش خمر حیا
 گشت مست“ اور اسد اللہ ”علی گشت صہبائی علم“
 تیسرے دور کے ضمن میں منصور صلاح کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں بیدل
 نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ حد اعتدال سے نہ بڑھنا چاہئے۔ عدل وہ صراط مستقیم

ہے جو سیدھی جنت کو جاتی ہے۔ اس کے دو کنارے افراط و تفریط ہیں اور
جوان میں اُلجھا وہ جہنم میں گر تلے۔

بہ منصور آں باوہ بے مثال چو یک قطرہ افزہ و دا از اعتدال
بر آورد از موج مستی زباں زلفش برآمد انا الحق زباں
مئے فیض در رنگ اصلی بجاست ولے ظرف تمکین مستان بجاست
یہی باوہ وحدت منصور نے بھی پیانگرا یک گھونٹ زیادہ پی گیا نتیجہ یہ
ہوا کہ ضبط نہ رہا، اس کے ظرف استعداد میں اسی گھونٹ کی سمائی نہ تھی،
مستی میں زبان سے ”انا الحق“ نکلا، اس میں کچھ کلام نہیں کہ شراب تو اپنے
اصلی رنگ میں ہی ہے اور شراب حقیقت ہی ہے۔ لیکن وہ تمکنت جو
مستوں کے حال کے مناسب ہے وہ منصور کے ظرف میں نہ تھی۔ اس کی
مثال ایسی ہے کہ :-

گہر داشت بر جام اصلی نظر نیفتاد چشش بجامِ دگر
”گہر“ کے معنی موتی بھی ہیں اور اصل اور اصالت بھی ہیں، یعنی موتی
نے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق ”زیک قطرہ می داو تسکین خویش“
ایک قطرہ پر قناعت کی اور موتی بن گیا۔ اس نے دوسرے جام کی خواہش
ہی نہ کی، لیکن :-

ہماں جام چوں شد نصیب جباب ببالید از ذوق عیش شراب
باظہار جام دگر لب کشاد چو گل ساغر خود ہم از دست داد
یہی ایک گھونٹ شراب جباب نے بھی پیا۔ نشہ کی ترنگ میں اتنا
پھولا کہ ایک اور جام طلب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گل کی طرح جو اپنے جامہ میں
پھولانہ سما سکا اس کا ساغر بھی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گیا۔ اس شعر میں
”لب کشاد“ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضبطِ نفس جس سے جباب کی ہستی برقرار ہے نہ
رہا، پھوٹے ٹمنہ سے زیادہ کی طلب کی تو خود پھوٹ کر رہ گیا، اور اپنی

بیدل

ہستی فنا کر بیٹھا۔

حریفے کہ باشد تنک حوصلہ نزدیک نہ پیر معاش گد
غالب نے بھی منصور کو تنک ظرف قرار دیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرف فی منصور نہیں
جہاں کی طرح منصور اور اسی قبیل کے لوگ جو بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں
اگر پیر مغاں کا نگلہ کریں کہ ہم کو بقدر طلب نہیں دیتا تو یہ ان لوگوں کی کوتاہ
اندیشی ہے۔

بہ قسمت کسے گر قناعت کند چرا ساغر عیش خود بشکند
ساتی قسمت جو کچھ دیتا ہے وہ عین صواب ہے۔ اس لئے اگر ہر ایک شخص
اسی پر صبر و شکر کرے تو اس کا ساغر عیش زندگی بھر ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن جو
قناعت نہیں کرتے خراب حال ہوتے ہیں، اس لئے جتنی ظرف میں وسعت ہو
اسی مقدار سے بادہ بھی طلب کرنا چاہئے۔ کہ ہرچہ ساتی مار نخت عین الطاف
است۔

محمد زفیض محیط قدم گرفتے ہزاران قدح دمدم
وے بود فارغ ز کیف خمار ز شوق شہود ازل بمقرار
کہ من رنگ این بادہ نشناختم بہ تحقیق جامش نہ پرداختم
ان اشعار میں اشارہ آنحضرتؐ کی ایک صحیح حدیث کی طرف ہے کہ آپؐ نے
فرمایا ”ما عرفناک حق معرفتک“ اس حدیث میں عبودیت اور عبدیت کا
حقیقی تقاضا بھی نمایاں ہے اور ساتھ ہی طلب علم بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی
شخص یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اس کو کسی شے کا علم ”کما حقہ“ حاصل ہے۔
ہر ایک شے میں لا محدود امکانات پوشیدہ ہیں، جن کو ”الغیب“ کہتے ہیں۔
آنحضرتؐ کی دعا بھی یہی تھی کہ ”رب زدنی علما“ اے میرے پروردگار میرا علم

زیادہ کر باوجود اس امر کے کہ اس بحرِ بیکراں سے ”گرفتہ ہزاراں قدح و مہدم“
 لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ ”انا عبد اللہ“ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ منصور کو یہ بات
 کہاں نصیب تھی، ایک قطرہ سے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور بے اختیار
 ”انا الحق“ کا نعرہ لگایا، آنحضرتؐ کے بارہ میں بیدل نے یہ نکتہ بھی بیان
 کیا ہے کہ :-

حریفے کہ شد میکش خم ذات چہ ساں مست گرد و ز جام صفات
 غالب نے اسی خیال کو اور لطیف انداز میں ادا کیا ہے :-
 سر پئے خم پہ چاہئے ہنگام بے خودی رد سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
 یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مست ئے ذات چاہئے
 آنحضرتؐ ”خمانہ ذات میں مقیم تھے، اور اصلی رنگ میں شراب حقیقت
 اسی مقام و عدت میں ملتی ہے۔ منصور صفات کی تجلیات میں محبوب تھا۔
 آنحضرتؐ اس مقام سے گزر چکے تھے۔

گرا نہ ساغر ذرہ گیر شراب چہ اظہار مستی کند آفتاب
 اگر آفتاب ساغر ذرہ سے شراب پیئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نشہ کا اثر
 اس پر کچھ نہ ہوگا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ، آنحضرتؐ آفتاب ”سراجاً
 منیلاً“ ہیں۔ آپ ساغر صفات سے نہیں بلکہ جام ذات سے پیتے ہیں۔ عہدِ
 اکبری کا ایک محقق کہتا ہے کہ :-

”موسى ز ہوش رفت ز یک پر تو صفات
 تو عین ذات می نگری در تبسے“

(قاضی جمال دہلوی)

بیدل کہتا ہے کہ :-

”چو شد طالب صاف و حد کلیم بر آورد پائے ادب از کلیم“
 ”ز دیر مغاں لب ترانی شنید کہ ہر کام نتواند ایں سے چشید“

بیدل

جب حضرت موسیٰ نے التجا کی ”رب ارنی“ اے میرے پروردگار مجھے اپنا آپ دکھا، جواب ملا کہ ”لن ترانی“ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت موسیٰ کا سوال بقول بیدل ادب کے خلاف تھا۔ ایک غزل نعتیہ میں میرا ایک شعر ہے۔

یقین ہے آتی نہ ہرگز سوال کی نوبت

کلیم تجھ سے اگر ہم کلام ہو جاتا

اسی بحث کے ضمن میں بیدل استعداد پر لکھتا ہے کہ :-

بباطن مئے عشق وحدت صفاست بظاہر فروغش تفاوت نماست

نماید چو خورشید در خانہ رو ز شمعے فزوں نیست اوار او

ولیکن بصراست صاحب جلال بود لازم ظرف نقص و کمال

بود سرق از ذرہ تا آفتاب کجا ساغر بحر و جام حساب

انہ روئے حقیقت عشق وحدت کی شراب صاف ہے لیکن بقدر

ظرف اس کا نشہ مختلف ہے، حقیقت کی مثال آفتاب جیسی ہے کہ اگر کسی خانہ

کے روزن دیوار سے اس کی روشنی داخل ہو تو شمع کی روشنی سے زیادہ نہ

ہوگی لیکن صحرا میں آفتاب اپنی پوری شان جلال میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس لئے

نقص و کمال یا کمی بیشی کا اندازہ ظرف کی وسعت سے ہی ہو سکتا ہے ایک گھر

کی چار دیواری میں اسی سورج کی روشنی شمع سے زیادہ نہیں مگر صحرا میں اس کی

وسعت کے لحاظ سے اس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح ذرہ

اور آفتاب میں تفاوت ہے، بحر کے پیالہ میں سمندر سمایا ہوا ہے اور ساغر حساب

میں ایک قطرہ سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

بفرعون جام جہالت رسید کہ چشمش بجز رنگ غفلت نہ دید

فرعون نے یہی شراب جام جہالت میں پی۔ جہالت کا نشہ غفلت

کے سوا اور کیا ہوتا۔

ہمہ درد شد بادہ ناب او می جلوہ شد پردہ خواب او
 شراب تو از روئے حقیقت صاف ہی تھی مگر یہ خالص شراب ”درد“ یعنی
 ”پلمھٹ اس کے جام جہالت میں دکھائی دی اس لئے وہ ہوش کھو بیٹھا اور
 خواب غفلت میں مدہوش ہو گیا۔

مگر خوابش از ہوش گیر و دیسل
 شکستند بر فرق او خم نیسل

دستور ہے کہ سوئے آدمی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے چہرہ پر
 پانی کے چھینٹے دیتے ہیں، اس خیال سے کہ فرعون کے ہوش و حواس
 بجا ہوں اور وہ بیدار ہو اس کے سر پر ”نیل“ کا ٹسکا توڑا گیا، نیل کے ساتھ
 ”خم“ نے اس شعر میں لطف پیدا کر دیا ہے مطلب تو یہ ہے کہ وہ نیل میں
 غرق ہو گیا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں، کہ اس کے حواس خم
 ایک ہی موج دریا کے تھپیر طے نے درست کر دیئے اور چلا اٹھا کہ میں
 موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ چہا ر عنصر میں بیدل نے لکھا ہے کہ
 کسی نے ایک اہل دل سے دریافت کیا کہ منصور اور فرعون دونوں ایک
 ہی خنخانہ کے پینے والے تھے، اور دونوں نے دعویٰ بھی ایک جیسا کیا۔
 منصور نے ”انا الحق“ اور فرعون نے ”انا ربکم الاعلیٰ“ کہا۔ اس کی وجہ
 کیا ہے کہ ایک مقبول اور دوسرا مردود ہوا جواب دیا کہ منصور اہل تحقیق تھا،
 کسی حالت میں بھی اپنے دعوئے سے دستبردار نہ ہوا یہاں تک کہ دار پر
 ٹسکایا گیا۔ مگر فرعون کو دنیوی جاہ و حشمت نے مغرور بنا دیا، اس کے سر میں
 جو ہوا سمائی ہوئی تھی پانی کی ایک لہر نے بلبہ کی طرح توڑ پھوڑ کر کمال دئی،
 اور بے اختیار چیخ اٹھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا۔ اگر اسے
 اپنے دعویٰ پر یقین ہوتا تو منصور کی طرح اسی پر قائم رہتا۔
 ز افعال و آثار چیں شد خلاف و گرنہ ز یک خم بود درد و صاف

بیدل

اگرچہ شراب صاف ہو یا پلچھٹ ایک ہی خم میں ہوتی ہے لیکن افعال اور آثار کے لحاظ سے سایہ اور نور کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے ورنہ ”بود سایہ در جلوہ ہمرنگ نور“ نور بھی اسی طرح جلوہ فروز ہے جیسے سایہ ظاہر ہے۔ لیکن اہل نظر کی آنکھیں ”گم است این یکے در ظہور دگر“ جہاں ظلمت چھائی ہوئی ہو وہاں نور گم ہے اور جہاں نور کا ظہور ہو وہاں ظلمت کا نور ہے۔

بیدل نے اس مثنوی ”محیط اعظم“ میں حقائق کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے، سردست ہمیں اس مثنوی کے موضوع سے بحث نہیں، یہ موضوع اس کا اپنا خاص ہے اور اس کے کلام نشر و نظم میں یہی کار فرما ہے، بیدل کی تصانیف کے مذکور میں ہم ہر ایک تصنیف سے سردست روشناس کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر پر مفصل بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔

اس مثنوی میں بیدل نے موضوع کی رعایت کی وجہ سے ساقی اور خرابات اور خراباتیاں اور خم و مینا و جام وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ ”سردبیراں“ ”در حدیث دیگرال“ میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس پر بحث کریں تو ایک دفتر چاہئے۔ ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں، بیدل ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ہندوستان میں ایک تھامہ راجہ، اس نے اپنی مملکت کے طول و عرض میں اعلان کر دیا کہ جو بھی کسی علم و ہنر میں اہل کمال ہے، دربار میں حاضر ہو کر اپنے کمال کا اظہار کرے اور منہ مانگا صلہ پائے۔ اس دعوت عام پر ملک کے بالکمال آنا شروع ہوئے۔

بہ بزمش ز اہل ہنر ہر کہ بود ز اسرار دل نسخہ و انمود

راجہ کے دربار میں ہر ایک اہل ہنر نے جو بھی تھا ”دل“ کے اسرار کھول کر رکھ دیئے۔ اس شعر میں الفاظ ”اسرار دل“ تمام حکایت کا اصل موضوع ہے۔ یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اہل علم و ہنر کے پاس جو کچھ

بھی ہوتا ہے وہ اس کے اپنے دل میں ایک راز کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے، جب تک وہ خود ہی تحریر و تقریر میں اس کا اظہار نہ کرے یہ راز کسی پر منکشف نہیں ہو سکتا۔ اس حکایت کے نتیجہ پر بیدل نے جو بحث کی ہے وہ مناسب مقام پر بیان کی جائے گی۔

بہ طبع ہنر پرورش بے حجاب زمے نشہ ظاہر شد، از گوہر آب
عیان شد بحشم طراوت نظر ز گل نگہت، از لالہ داغ جگر

اگرچہ ہر ایک اہل کمال کا ہنر اس کے دل ہی میں پوشیدہ تھا مگر جب اس نے یہ پردہ اٹھا دیا تو اس کے ہنر کا اظہار لوگوں پر اسی طرح ہوا جس طرح شراب پینے کے بعد ہی اس کا نشہ ظاہر ہوتا ہے، یا موتی قعر دریا سے نکل کر ہی اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ پھول جب کھلتا ہے تو اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور لالہ کا داغ جو پہلے جگر میں پوشیدہ تھا منظر عام پر آ جاتا ہے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شے ”فعل“ میں نہیں آ سکتی جب تک ”فعل“ بالقوہ“ موجود نہ ہو، اگر ہنر اہل کمال کے دل میں موجود نہ ہوتا تو اس کا اظہار بھی نہ ہوتا۔

ازاں جملہ بازیگری شوخ و شنگ چو گردوں طلسم دو عالم بچنگ
ز جیب قریب نگہ سرکشید بساطی پی دام نظارہ چید
بمیداں افسوں گرمی پانہلو یکے اسپ چو میں بشعر عرضہ داد

انہی با کمال لوگوں میں ایک بازیگر بھی تھا۔ ہر دو عالم ایک طلسمی کارخانہ ہے مگر آسمان شعبہ باز کے دست تصرف سے باہر نہیں ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ خود آسمان ہی تھا جو بازیگر کی صورت میں نمودار ہوا۔ فارسی شاعری آریاذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ عام آریائی عقیدہ ہے کہ اجرام سماوی کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اس لئے ان میں جوش یا علم نجوم کو حاصل ہمت حاصل ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کرۂ عرض پر ہو رہا ہے وہ سیارگان کی

گردش کا اثر ہے۔ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط سیر دست زیر بحث نہیں۔ لیکن آریائی شاعری میں اس نے مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس لئے بیدل بھی عام روزمرہ اور محاورہ زبان استعمال کر رہا ہے۔ اس چالاک شعبدہ باز نے اپنے تھیلہ سے جس کو فریب نظر کہنا چاہئے دام نظارہ نکال کر بچھا دیا۔ جادو غمری کے میدان میں قدم رکھتے ہی راجہ کے حضور ایک لکڑی کا گھوڑا پیش کیا۔ اور کہا۔

ہر آں کو برا میں سپ گرد سوار کند سیر افلاک اندیشہ وار
جو بھی اس گھوڑے پر سوار ہو گا وہ اس تیزی سے تمام افلاک کی سیر کر سکتا ہے جس سرعت سے خیال دوڑتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ راستہ میں گرد و غبار کی کلفت بھی نہ ہوگی۔ ”بود سیر او، بچو سیر نگاہ“ اس کی سیر نظر کی سیر کی طرح ہوگی۔ ان اشعار میں بیدل نے ”سرعت اندیشہ“ اور ”سیر نگاہ“ کو ہر ایک شے سے زیادہ تیز رفتار بتایا ہے، زمانہ حال کے حکماء کا نظریہ یہ ہے کہ ”روشنی“ سب سے زیادہ تیز رفتار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ”انسانی دل“ ہی سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ خیال اور بنگاہ اسی کی رفتار اور روش ہے۔

راجہ نے جب گھوڑے کی یہ تعریف سنی تو بے اختیار گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بازی کرنے متنبہ کر دیا تھا کہ گھوڑا سخت مٹہ زور ہے۔

نبا شد عنانش بفرماں کس کہ مشکل بود ضبط موج نفس
یہ نہیں ہو سکتا کہ لگام کے اشارے پر چلے۔ ایسا ہی ہے جیسا انسانی سانس خود بخود چل رہا ہے، روکے سے رکتا نہیں، اور اگر رکے تو دم ہوا ہو جائے۔
غرض راجہ سوار ہوا اور گھوڑا فوراً

باوج فلک گشت جولان نما چو شبنم برآمد برنگ ہوا
آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اب راجہ کے اوسان بجانہ رہے۔

بہ ہیت چناں خسرو از خویش رفت
کہ از بے خودی یک قدم بیش رفت
راجہ ایک بخودی کے عالم میں اپنے آپ میں نہ رہا بلکہ یہ کہنا چاہئے
کہ رکتا کیا ایک قدم اپنے آپ سے اور آگے بڑھ گیا۔
زحیرت ہم آغوش و ہم ہلاک
بفتاد چوں سایہ بر روئے خاک

اب راجہ پر یہ وہم غالب ہوا کہ میں گرا کہ گرا، اس وہم سے ہمکنار
ہونا تھا کہ سایہ کی طرح زمین پر آ رہا، تھوڑی دیر بعد جب آنکھ کھلی تو ایک
لحوق و دق جنگل میں اپنے آپ کو پڑا پایا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے پیاس کا
غلبہ ہوا ادھر ادھر دوڑ دھوپ تین شبانہ روز رہی مگر پانی نہ ملا، آخر دور
سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا، جب حجاب غبار دور ہوا تو ایک حسینہ بے پردہ
نمودار ہوئی۔

خرامے چو سیلاب غارت فروش نگہ وحشت دامنِ الفت بدوش
جس طرح سیلاب بڑھتا ہوا ہر ایک شے کو جو راستہ میں پڑے یہاں لے
جاتا ہے اسی طرح اس کا خرام غارت فروش تھا۔ نگاہ اگرچہ رمیدہ تھی مگر
”دامِ الفت بدوش“ یہ صفت اضداد ہے کہ رمیدہ نگاہ جو غزاں وحشی
کی ہوتی ہے الفت کی بھی دعوت دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آنچورہ آب
اور ٹوکری میں روٹی بھی تھی، راجہ بھوکا اور پیاسا تو تھا ہی، دوڑ کر سامنے
آیا۔ اور کمزوری کی وجہ سے اس پر پیکی کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے
راجہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو راجہ اور راجپوت نظر آتے ہو اور میں شودر ذات
میرا پیشہ کناسی ہے، یعنی جاروب کشی ہے۔

غذا ہائے ماہم باشد حلال بقوم دگر نیست غیر از وبال
ہماری خوراک تو ہمارے لئے حلال ہے۔ اگر تمہیں دوس تو تمہارا

بیدل

دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔

راجہ کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اگر چھتری دھرم کا پاس کرتا تو ہلاک ہو جاتا۔ اس لئے کہا کہ دھرم بھرم کی باتیں چھوڑو۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر دیتی ہوں کہ:

ترازیں ہلاکت رہا نم اگر در آرنی بعقد خودم چوں گہر
مجھے اپنے عقد نکاح میں لے آئیے۔ راجہ بیچارہ مرتا کیا نہ کرتا، ناچار قبول کیا، ردی ٹکھائی، پانی پیا، ذرا آسودہ ہوا تو وہ صنم غارت گر ہوش راجہ کو اپنے گھر پر لائی۔ اپنے لوگوں کو راجہ کے حسب و نسب سے آگاہ کیا، جب ان کو معلوم ہوا کہ راجہ اپنا جنم کا دھرم چھوڑ کر ان کی برادری میں شامل ہونا چاہتا ہے تو:

بدستور سر رشتہ دین خویش یہ بستند عقدش بائیں خویش
اپنے دھرم کی رسم اور رواج کے مطابق راجہ کا بیاہ اس دوشیزہ سے رچایا۔
زنج بازی چرخ نیرنگ ساز گرفتار زانغاں شد این شاہباز
یہ بھی دنوں کا پھیر ہے کہ یہ شاہباز کوؤں کے پنجہ میں پھنس گیا۔
مباد اضطرا آفت حال کس کہ آتش بضعف است محتاج خس
اضطرابی حالت کی یہی کیفیت ہے کہ آگ اس وقت تک نہیں بھڑکتی جب تک خار و خس کی مدد نہ ملے، اس لئے جب گھاس پھوس نہ ملے آگ زور میں نہیں آتی۔ اسی ضعف کی وجہ سے آگ "خس" کی محتاج ہے۔ "خس" ہر ایک حقیر و ذلیل شے کو کہتے ہیں۔

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج

احتیاج است احتیاج است احتیاج

راجہ اب بالکل چو ہڑا تھا۔ اور اسی طرح دس سال کا عرصہ گذر گیا۔
شدے بے طلب بچو گل دیہار بہر سال فرزند نو آشکار

جس طرح بہار کے موسم میں گل خود رو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح راجہ کے ہاں ہر ایک سال بیٹا نیا پیدا ہوتا رہا۔

گرہ ہاں فزوں شد بدام دلش
کہ شدہ گہرزاں صدف حاصلش

اس کے دل پر ایک ایک کر کے گرہ پڑتی گئی جس سے اس کی وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اس لئے اس صدف یعنی زوجہ سے دس موتی حاصل ہوئے۔ راجہ اب اپنی راجگی اور تخت و تاج کو بالکل بھول چکا تھا۔

قضا راز چرخ سراپا ستیز
برآں سرزمین قحط شد فتنہ ریز

اتفاق سے اس سرزمین پر قحط نمودار ہوا۔ بیدل نے قحط کی سختی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

قحط کی شدت نے راجہ کو مجبور کیا کہ اپنے اہل و خیال کے ساتھ کسی اور جگہ تلاش نان میں جائے۔ ادھر ادھر بہت پھرے ایک ہفتہ کے بعد ایک جنگل میں گزر رہا۔ بھوک سے سب تنگ آچکے تھے۔ آخر سب نے یہ سوچا کہ روٹی تو ملنے سے رہی اس کی سختی کیوں برداشت کی جائے، اس لئے سب نے خود کشی کی ٹھان لی۔ ادھر ادھر سے لکڑیوں کا انبار جمع کیا، راجہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جگر گوشہ اگنی کی بھینٹ ہوں، اس لئے سب سے پہلے خود آگ میں داخل ہوا۔ مٹا اس نے اپنے سامنے اپنا تخت دیکھا اور وہی دربار اور وہی اہالیان دربار کھڑے دیکھے، راجہ حیران تھا کہ

چہ بود ایں کہ یک عمر در کوہ و دشت
خرد پرده کز روئے کارش کشود

دراغوش بیطاعتی ہا گزشت
دو ساعت فزوں دور محنت نبود

میدل

ایک عمر میں کوہ و صحرا میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ حکومت اور اختیار جو پہلے حاصل تھا اک دم جاتا رہا، اور میں کمزور و ناتواں بیچ ذات کے آدمی کی طرح بسر کرتا رہا۔ یہ تمام دس سال کا عرصہ اور اس عرصہ میں جو کچھ محنت و مشقت کی دو گھڑی سے زیادہ نہ تھی، راجہ نے اپنی سرگزشت تو کسی سے بیان نہ کی، اب وہ بازی گر بھی موجود نہ تھا کہ اس کی حقیقت اس سے دریافت کرتا۔ لیکن رہ رہ کر وہ ”تمنا“ اور وہ ”آرزو“ جو دل میں اُبھرنے کے لئے جوش مارتی تھی اور اب ایک حسرت و یاس میں مبتدل ہو رہی تھی، چین سے بیٹھنے نہ دیتی، اس لئے راجہ نے پھر صحرا نوردی کی ٹھان لی، کہ ممکن ہے کہ اس مقام کا شراغ مل جائے جہاں دس سال بسر کئے۔ اسی طرح بہت عرصہ اسی جستجو میں گزر گیا۔ قنارا ایک جنگل میں گزر ہوا تو یہ ماحول کچھ شناسا معلوم ہوا۔ واقعات گزشتہ کی یاد تازہ ہو گئی اور آگے بڑھا تو ”ہماں شہر کناس شد جلوہ گر“ وہی خاکروبوں کی بستی نظر پڑی جہاں اہل و عیال کے ساتھ دس سال گزارے تھے، اب راجہ اپنے گھر پر آیا۔ اُمید تو یہ تھی کہ فرزند و زن سے ملاقات ہوگی مگر دیکھا وہاں صفِ ماتم بھی ہوئی ہے۔ فرزند و زن تو نظر نہ آئے مگر لواحقین گریہ و زاری کر رہے ہیں، راجہ نے دریافت کیا کہ تمہاری چیخ و پکار کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کئی سال کا عرصہ ہوا۔

جوانی جو خوشید عالی نژاد دریں دشت از پیشگیہ افتاد
ایک جوان جس کا چہرہ سورج کی طرح جوت مارتا تھا اس جنگل میں آ نکلا۔ اور ہم میں رہائش اختیار کی، شادی بیاہ کیا، بال بچے ہوئے اور اچھی بڑی زندگی جیسی ہم سب کی ہے وہ بھی بسر کرتا رہا۔ قحط پڑ گیا اور وہ اہل و عیال کے ساتھ روزگار کی تلاش میں کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ ملا کہ کہاں گیا، راجہ نے ان کی دلجوئی کی اور بہت سامان بھی

دیا، پھر اپنے لشکر کے ساتھ اپنی راجدھانی کو لوٹا۔ اب یہ تو یقین ہو گیا کہ دس سال کا عرصہ خواب میں نہیں گزرا تھا بلکہ حقیقت ثابت ہے۔ لیکن ہر چند غور کیا مگر یہ گتھی سلجھ نہ سکی کہ دس سال ایک مقام کا عرصہ اس کی اپنی راجدھانی کی دو گھڑی کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر ایک ”رشی“ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا۔ ”رشی“ نے کہا :

کہ اے ماندہ از مرکزِ اسل دور	نداری خبر از طلسمِ ظہور
بر دستِ دراز واکرہ اند	بر مژِ ظہور آشنا کردہ اند
فسوں گر نبود آں فریبِ آفریں	دل انگیزت نقشِ ہدایت کمیں
دل آئینہ ہستی عالم است	وگر نہ وجود و عدم مبہم است
دل آور و مرآت تحقیق ذات	ازیں نسخہ زو جوشِ حرفِ صفات
بتقیدِ دل آفتِ زندگی است	ز تحریکِ ل موجِ پابندگی است
طلسمِ جہاں گرد ویرانہ است	عمارتِ در و عکسِ ایں خانہ است
مکانہا ہما ز دل آمد پدید	جہت ہا ازیں بے جہت سرکشید
چہ ذہن و چہ خارجِ خیال و دست	چہ اصل و چہ فرع از نہال و دست
گمانہا ہمہ نقشِ تکوین و دست	یقین یک گل از باغِ تسکین و دست
مشتو غافل از باغِ نیزنگ دل	کہ علم و عیان نیست جز رنگِ دل
نظارہ ترا گر چہ دل و در براست	بمعنی تو لفظی و دل و فقر است
بیکے فہم خود کن تو خود کیستی	ازاں پردہ دل بڑن نیستی
دلت ہر چہ اندیشد اندر خیال	بود جملہ منقوش لوحِ مثال
گل و گلشن دل مثالِ است و بس	خیالِ آنچہ بیند خیالِ است و بس
دریں دائرہ ذہنِ خارج کی است	تفاوت اگر ہست جز وہم نیست
تعلق بہارِ فریبِ دل است	تو ہم گلِ ناشکیبِ دل است
وگر نہ ندارد بہارِ شہود	بغیر از توا ز خود گلے در وجود

بیدل

دریں بحر طوفاں غیر تو نیست دریں کوچہ جز گرد سیر تو نیست
خیال تعلق دریں خاکداں بود عرض اسباب ہم و گماں
خیالت چورنگ تنزل گزید نہ تخت بخاک نہ لذت کشید
پے سوختن تمانہ بستی کمر نشد صورت راحت جلوہ گر
برستن ز او ہام اُمید و بیم عیاں شد کہ ہر جانی خویشی مقیم
رشی جی نے ”گیان“ کی باتیں راجہ سے کیں کہ ”راجن تو اپنے اصل کے
مرکزی مقام سے دور افتادہ ہے۔ تجھے اس سرشتی یعنی ظہور کی حقیقت
معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ جو تجھ پر گزرا اس کی غرض و غایت اتنی ہی تھی کہ
تجھے ظہور کے اسرار سے آگاہی ہو۔ وہ باز یگر جس نے یہ سب شعبہ بازی
کی دراصل تیرا اپنا ہی دل ہے جس نے یہ کرشمے دکھائے، دل ایک آئینہ کی
مثال ہے جس میں کائنات کی ہستی منعکس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو وجود و
عدم اور ہستی اور نیستی بے معنی بات ہو جاتی، اسی آئینہ دل میں ذات مختلف
صورتوں میں جلوہ گر ہوئی، ان صورتوں کو صفات سے موسوم کیا گیا جیسے
معانی حروف میں منکشف ہوتے ہیں۔ ذات تو حقیقت واحدہ مجردہ ہے۔
اس کی ہستی کا احساس ناممکن تھا اگر وہ صفات کی صورتوں میں رد نہ
ہوتی۔ اور یہ نمائش تیرے آئینہ دل میں ہی ہو رہی ہے۔ زندگی سے وابستگی
بھی حقیقت میں دل کے تعلق نے پیدا کر رکھی ہے۔ اور اس زندگی کی پابندگی
بھی دل کی تحریک ہی ہے۔ یہ طلسم جہاں جس کی میر تو کر چکا ہے اور کر رہا ہے
اصل میں ایک ویرانہ کا غبار ہے۔ اسی آب و گل سے تو اپنے خانہ دل کی تعمیر
کر رہا ہے۔ دل نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ جہات سے منزہ ہے لیکن تمام جہات
اور زمان و مکان اسی کے پیدا کردہ ہیں اور تمام کائنات جس میں مکان و
زمان ہیں دل ہی میں سمائے ہوئے ہیں، دل سے باہر عدم ہیں۔ یعنی خارج از دل
ان کا وجود نہیں، خواہ یہ ذہنی امور ہوں یا خارجی حالات ہوں سب دل کے

خیالات ہیں) (یہ شجر دل ہی ہے خواہ اس کی جڑیں ہوں یا شاخیں یا پتے۔
خواہ گمان دوہم یا یقین ہو سب دل کے نقوش ہیں البتہ یقین سے دل کو ایک
گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے مگر یہ بھی دل ہی کی ایک کیفیت ایسی ہی ہے جیسے
گمان، دل ایک باغ ہے جس میں طرح طرح کی نیرنگی تو مشاہدہ کرتا ہے خواہ یہ
علمی صورت ہو یا ذہنی امر یا خارج میں اعیان ہو دل ہی کے رنگ میں رنگین
ہیں۔ یعنی ان کا وجود دل ہی میں ہے دل سے باہر متصور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے
اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ دل بظاہر تیرے اندر ہے مگر
حقیقت یہ ہے کہ تو صرف ایک لفظ کی صورت ہے دل معانی کا دفتر ہے۔
انسانی دل کی حقیقت ہی دل ہے۔ مولوی معنوی کہتے ہیں کہ :

ای برادر تو ہمیں اندیشہ مابقی تو استخوان دریشہ

اب تجھے خود سوچنا چاہئے کہ تو خود کیا ہے؟ تو خود دل کے اندر ہی ہے۔
اس پردہ دل سے تو باہر نہیں ہے۔ یہ دل کی قابلیت ہے کہ جو کچھ خیال کرتا
ہے اس کی مثالی صورت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یہ گل اور گلشن سب مثالی صورتیں
ہیں، جو کچھ خیال چاہتا ہے ایک خیالی صورت بنا لیتا ہے۔ اس دائرہ کائنات
یا تیرے دائرہ دل سے خارج ایک ”ذہن“ ہے، اسی ذہن کے تصورات یہ
کائنات ہے اور اسی کائنات کے نقوش تیرے دل پر ثبت ہیں۔ دراصل ایک
”دل“ ہے۔ اس لئے ذہنی اور خارجی امور یا عالم غیب و شہادت میں کچھ
فرق نہیں غیب میں بھی وہی کچھ ہے جو شہادت میں ہے ہمیں اگر کچھ تفاوت نظر
آتا ہے تو یہ کرشمہ ”دوہم“ ہے، ”دوہم“ پر بیدل نے مثنوی طلسم حیرت میں مفصل
بحث کی ہے اور اسی کے تحت ہم بھی اس پر بحث کریں گے۔ آیہ کریمہ
قرآن بھی اس کی تائید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تفاوت نہیں
ہے۔ یہ تعلق جو ذہن اور خارج میں ہے اور جو علاحدہ علاحدہ نظر آتا ہے ایک
فریب نظر ہے، تو خود بھی دل ہی کا ایک گل ناشگفتہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے

بیدل

کہ بہارِ شہود میں تیرے سوا اور کوئی گل نہیں۔ اس طوفانی بحر میں تیرا غیر موجود ہی نہیں، تو اپنے دل ہی میں سیر کر رہا ہے۔ یہ تعلق کا خیال اس زمین دل میں صرف وہم و گمان کا کرشمہ ہے۔ زمین پست اور آسمان بلند نظر آ رہا ہے۔ جب تیری نظر پستی کی طرف گئی، تو تخت کی بلندی سے خاک مذلت پر گرا۔ اور اس تعلق کا نقش ایسا گہرا ہے کہ تو ابھی تک اسی سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھ رہا ہے، بلکہ اس کو غنیمت شمار کرتا ہے، جب تک تو آگ میں جلنے کیلئے کمر بستہ نہ ہو، تمام کلفت اور پریشانی کا بھی خاتمہ نہ ہو، اور پھر سے تخت راحت پر متمکن نہ ہو۔ جب تو ”امینہ و بیم“ سے کنارہ کش ہو، تو تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ تو اپنی اصلی جگہ پر ہی مقیم ہے، نہ کہیں گیا اور نہ کہیں سے آیا۔

ہم نے ان ابیات کی ترجمانی تو کی ہے مگر یہ فلسفہ دقیق ہے۔ چونکہ بیدل نے اور مقامات پر اس کی تشریح کی ہے اس لئے سر دست یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ تمام کائنات ایک واحد دل کے تصورات ہیں۔ یہ مذہب اپنی تصوف کا ہے اور گزشتہ صدی میں ”بشپ بارکلی“ نے اس فلسفہ یا نظریہ پر مدلل بحث کی ہے، یونانی فلسفہ ”سوفسطہ“ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم خیال ہی ہے۔ لیکن اسلامی تصوف یہ ہے جسے مولانا جامی نے اس رباعی میں بیان کیا ہے۔

سوفسطائی کہ از خرد بے خبر است گوید عالم خیالے سر بسر است
آرے عالم ہمیں خیال است وے جاوید درو حقیقے جلوہ گراست
جہاں تک اس عالم صورت یا محسوسات کا تعلق ہے یہ خیالات یا تصورات یا بقول بیدل یہ صرف صورتیں ہی ہیں۔

دلت ہرچہ اندیشد اندر خیال بود جملہ منقوش لوح مثال
لیکن انہی صورتوں میں حقیقت رونما ہو رہی ہے۔ جس طرح حروف

میں معانی یہ ”حجاب صور“ (من وراء حجاب) ہی ہے جس میں اہل ذکر و فکر حقیقت کی تلاش کرتے ہیں جو ”الغیب“ ہے۔ اور ناممکن ہے کہ بشر کو حقیقت مجرودہ کا احساس ہو جب تک وہ کسی صورت میں رونما نہ ہو۔

ان ابیات میں ”رشی“ کی زبانی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ انسان کو سوچنا چاہئے کہ وہ خود کیا ہے؟ ”انسان“ اور اس کی حقیقت پر بھی بیدل نے چہار عنصر اور دیگر تصانیف میں مفصل بحث کی ہے۔ بیدل کا نظریہ کائنات اور ہستی ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ ان ابیات میں بیدل یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ ”دفتر دل“ کا ایک لفظ یا صحیفہ فطرت کی ایک آیت انسان ہے۔ آیات بے شمار ہیں، لیکن انسان کو یہ تفصیل حاصل ہے ”علمہ البیان“ وہ ان آیات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور اس کو ان کا فہم بھی حاصل ہے اور ان کو بیان بھی کرتا ہے۔

بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ وہ غنی عن العالمین ہے، تخلیق انسان کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنے مرتبہ سے واقف ہو۔ چنانچہ مزامیر نے اور لٹنور اور چنگ وغیرہ کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک رات میں ہستی کی گتھی سلجھانے کی فکر میں غلطال تھا کہ :

دریں حالت از چنگم آمد بگوش نوائی کز دآب شد رنگ ہوش
اس حالت استغراق میں چنگ کی آواز میرے کانوں میں آئی، یہ نوا
کیا تھی ہوش و حواس فرو ہو گئے۔

کہ اے سر اسر نقش دیوانگی ہمہ پردہ ساز بیگانگی
کہ تو بھی عجیب دیوانہ ہے بلکہ مجسم دیوانہ ہے جو اپنے ہی ساز سے اتنا
بیگانہ ہے کہ غیر اور ”غیریت“ کی نغمہ سرائی کرتا ہے۔

چو آئینہ چنگ داری بہ پیش مشو غافل از صورت حال خویش

بیدل

چنگ آئینہ ہے اور اس میں تیری ہی صورت ہے اور تیری ہی آرزو
تیرے ہی دم اور ہاتھ سے نکل رہی ہے۔

توئی قبلہ خود چو محرم شومی تو مخراب خویشی اگر ختم شومی
اگر تو اس راز سے واقف ہو تو معلوم ہو گا کہ تو اپنا آپ ”قبلہ“ ہے،
آئینہ میں تیرے روبرو تو ہی ہے اور ذرا تفکر سے کام لے اور جھک کر اپنے
اندر نظر کرے تو تو ہی اپنا آپ مخراب ہے۔

ساتویں دور کے شروع میں بیدل لکھتا ہے:
دریں گنبد بے در آسماں ز بیگانہ تا چند جوئی نشان
یہ آسماں ایک گنبد ہے جس کا کوئی دروازہ آمد و رفت کا نہیں، اور
تو اس گنبد میں موجود ہے اس لئے سوچنا چاہئے کہ اگر اس گنبد کا کوئی
دروازہ ہوتا اور کھلا ہوتا تو تیرا غیر باہر سے آتا یا اندر سے باہر جاتا اگر
کوئی اس خانہ بے در میں پکیں ہے تو تو ہی ہے اس لئے کسی بیگانہ کا نشان
تجھے یہاں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔

بچشم تو نقش سوائی تو نیست بگوش تو غیر از صدائی تو نیست
تو جو بھی نقش دیکھ رہا ہے وہ تیرا ہی تصور ہے۔ دیکھنے والی تیری ہی
آنکھ ہے۔ اس گنبد میں تیری ہی آواز گونج رہی ہے۔

بوہم و گماں بر چہ پیچیدہ چرا خویش را غیر فہیدہ
وجہ کیا ہے کہ تو وہم و گمان میں اُلجھا ہوا ہے۔ اور اپنے آپ کو اپنا
غیر سمجھ رہا ہے۔

گمان عدم، وہم ہستی، زلت خمار از تو سر جوش مستی زلت
یہ عدم اور ہستی کا وہم و گمان جو تجھے اضمحلال اور ایک دوسرے کا غیر
دکھلا رہا ہے۔ یہ بھی نقش عدم و ہستی تیرا ہی تصور اور تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔
یہ خمار جو دوسر کا موجب بنا ہوا ہے۔ یہ بھی تیری اپنی ذات کا نتیجہ ہے اور

مستی کا جوش بھی تیری ذات ہی کا کرشمہ ہے۔

زجائے وگرنیست ایں گفتگو توئی منشاءِ غفلت و جست و جو

حقیقت یہ ہے کہ تیرے دل میں جو ایک ترپ ہے کہ تو را از ہستی معلوم کرے یا اس طرف سے بالکل غافل ہے تو یہ غفلت اور یہ جست و جو غرض ہر ایک حال کا مقصد خود تو ہی ہے۔ یعنی اگر تلاش در پیش ہے تو جس شے کی تلاش ہے وہ تو ہے، اس لئے تو اپنی حقیقت کا فہم حاصل کر۔

یکے، پچو خم در گریبان خویش نظر کن بہ میں جوش طوفان خویش
نکبھی خم یعنی ٹٹکے کی طرح اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ اور اپنے ہی
طوفان کا جوش دیکھ، اگر شراب ہے تو ٹٹکے کے اندر ہے اور اگر شراب
جوش مارتی ہے تو اسی ٹٹکے کے اندر، اس لئے خم بھی تو اور شراب اور نشہ
بھی تیرے ہی اندر ہے۔

زخاموشی تست عالم خموش زخاموش تو ایں بزم دارِ دُخروش
جب تک تو زندہ ہے تمام کائنات زندہ ہے تو خاموش ہو اتو جہاں تک
تیری ذات کا تعلق ہے تمام عالم عدم ہے۔

طلسمِ جہاں پردہ ساز تست تہی از خود پر ز آواز تست
یہ جہاں ایک طلسمی کارخانہ ہے، یہ سمجھ کر کہ تیرے ہی ساز و جود کا
پردہ ہے۔ تیرے ہی چھیڑنے سے اس میں سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ ورنہ یہ عالم
ظہنور کی طرح خود کھوکھلا اور اندر سے خالی ہے۔ آوازیں اور نغمات تو ہی
پیدا کر رہا ہے۔

چہ داماندہ در غم ایں آں طلسم خیالی ست نقشِ جہاں
تو اس جہاں میں سرگرداں کیوں ہو رہا ہے، یہ نقشِ عالم سب ایک
”دلِ اعظم“ کے تصورات ہیں، سورج کی طرح تو اپنی ہی کرنوں کے خط پر
گردش کر رہا ہے۔ اسی طرح تیرا استہ تیرا ہی خط شعاعی ہے اور منزل بھی

بیدل

تیرا اپنا آپ ہے جب تو اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے گا تو رازِ ہستی بھی تجھ پر کھل جائے گا کہ تیرے ہی دم سے ظہورِ عالم ہے۔ بیدل کا نظریہ حیات یہ ہے کہ منشاءِ فطرت ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ اور جب خود شناس ہو جائے گا تو اس پر ”الغیب“ یعنی ان امکانات کا انکشاف ہو گا جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہیں، اور اس علم کے بعد اس پر اپنے حقیقی مقام یا منزل کا انکشاف بھی ہو گا۔ انسان گمراہ کن وہم میں اُبھا ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اغیار کا محتاج سمجھتا ہے حالانکہ جس چیز کی طلب وہ غیر سے کرتا ہے وہ اس کے اپنے پاس ہے۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گھڑی لال

گرہ کھول نہیں جانتے اس بدیہ کنگال

خواجہ حافظ بھی یہی کہتا ہے کہ

سب لہا دل طلب جامِ جم از مامی کرد

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تنہا می کرد

گو ہری کز صدف کوں مکاں بیڑوں بود

طلب از گم شد گال لب دریا می کرد

بیدل کہتا ہے کہ

رخ خود در آئینہ خود بہیں

دریں بزمِ مستی ہمیں ست بس

تبا شد نمودار جز نقش تو

بہ نیک بد خود نظر می کنی

تو گر نیستی نیست این جا کسے

کہ از وہم ہم وہم خواہد نمود

دراں کوش تا گردی آگاہ خویش

یکے در پس زانے خود نشیں

تماشائے ہستی ہمیں ست بس

در آئینہ عالم رنگ و بو

چو نظارہ خیر و شر می کنی

منور عشوہ برس و ناکسے

ز تحقیق عالم چہ خواہد کشود

مکن صید غیر از کمیں گاہ خویش

کہ با خود بیک لحظہ پرداختن

توان کار ہر دو جہاں ساختن

انسان اپنی انفرادی حیثیت کا جائزہ لے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ”آپ مرے جگ پر لو“ اگر وہ خود جہاں میں نہ ہو تو جہاں تک اس کی انفرادی زندگی کا تعلق ہے جہاں عدم ہے، تو جو کائنات یا ہستی عام کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لے کہ خواہ مخواہ در و سر مول لے رہا ہے۔ تیرے سوا جو کچھ بھی ہے سب موم ہوم ہے۔ وہم کا انکشاف آخر وہم ہی ہوگا۔ ”باطل از باطل بروید حق ز حق“ تجھے وہم وہم ہیں ابھار رہا ہے۔ تو غرض تحقیق اس طرح گھات میں بیٹھا ہوا ہے جس طرح شکاری شکار کے لئے ”تو غیر“ کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ تجھے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ خود آگاہ ہو۔ اگر ایک ساعت بھی ”باخود“ ہوگا تو دو جہانوں کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

جب ”میاں مٹھو“ کو پڑھانا منظور ہوتا ہے تو آئینہ اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اور پڑھانے والا آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر چند الفاظ کہتا ہے۔ طوطا آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ لیکن اتنا شعور نہیں ہوتا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے، وہ اتنا سمجھتا ہے اس کا ”مگر ہم جنس بول رہا ہے۔ تو یہ بولی وہ خود بولنے لگتا ہے، حافظ کہتا ہے کہ :

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اسی ضمن میں ”وجی“ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ لیکن سر دست یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ آئینہ تیرا اپنا قلب ہے، اور اسی آئینہ میں تو اپنا آپ ہی دیکھ رہا ہے، لیکن غلط فہمی سے سمجھتا ہے کہ تو غیر کو دیکھ رہا ہے غیر کی آواز سن رہا ہے، حالانکہ جسے تو محسوسات کہتا ہے وہ تیرے ہی حواس کا احساس ہے غرض تیرے ہی دل یا قلب میں کل کائنات سمائی ہوئی ہے تو ہستی کا مشاہدہ اپنے دل سے باہر نہیں کرتا لیکن یہ عجیب طلسمی کارخانہ دل ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ تجھ سے باہر ہے،

بیدل

حالانکہ جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے وہ تیرے ہی دل میں ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ غیب و شہادت یا ظاہر و باطن اعتباری اور نسبتی امور ہیں مثلاً ہم اجرام سماوی کو بہت دور اپنے سر پر بلند دیکھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں، کہ ہم پستی میں رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی سیارہ میں ہوں تو ہم زمین کو بھی اتنی دور دیکھیں گے جتنا یہ سیارہ زمین سے بلند نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں وہ خود اشیا نہیں ہیں۔ بلکہ اشیا کی ”ظل“ ہیں جن کو ہم ”صورت“ سے موسوم کرتے ہیں، یہ عالم صورت یہی رنگ و بو ہی ہے۔ یہ وہ صورتیں جو ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں، باصرہ میں رنگ اور روپ اور سامعہ میں آوازیں اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے صرف صورتوں کا مجموعہ ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں اور ہمارے حواس صورتوں کے سوا کچھ محسوس کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہم کو ایک اور ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اشياء محض صورتیں ہی نہیں ان صورتوں میں حقائق بھی رونما ہو رہے ہیں۔ ان حقائق کا انکشاف ہمارے قلب پر ہوتا ہے۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ سیر دست سوال صرف یہ ہے کہ ”حق“ کا انکشاف ہم پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیا معیار ہے جس پر حق و باطل پرکھا جاسکتا ہے؟ اس لئے بحث تحقیق پر آرہی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ:-

بدیوان ہستی سخن ہا بسے است ازاں جملہ یک حرف تحقیق نیست
لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور باتیں بنانے والے
بھی بہت ہیں، حرف تحقیق کسی سے نہ سنو گے۔

ازاں نقش کار جہاں ابتر است کہ آثار تقلید یک دیگر است
دنیا کے کاموں میں خرابی کی وجہ یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی
تقلید کرتے ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔

زبس درس تقلید شد آشکار نشد، سچ کس واقف از اصل کار
جس کی بات سنو وہ کچھ اپنی تحقیق اپنا مشاہدہ اپنا تجربہ بیان نہیں کرتا اور
اگر کرتا ہے تو لوگوں کو اپنی بات ہی منوانا چاہتا ہے مقلدین اس کو مل جاتے
ہیں اور وہ اس کی باتوں پر فریفتہ اور دوسروں کو فریفتہ کرتے ہیں، اصل
حقیقت سے واقفیت تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے اگر ہم علی وجہ بصیرت
اس کی باتوں کو وزن کریں۔ لوگ اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور جس
شخصیت کی تقلید کرتے ہیں اس کو خدائی درجہ دیتے ہیں۔ ایسے معبود لوگوں
نے بہت بنا رکھے ہیں اور ان میں اختلاف اور شرانگیز تفرقہ بھی ہے۔ یہ کہنا
کچھ بے جا نہیں کہ اسی تقلید کا کرشمہ ہے کہ عالم انسانی میں فتنہ و فساد برپا
ہے، اگر ان پر حق کا انکشاف ہوتا تو سب امن سے زندگی بسر کرتے۔
اس لئے کہ حق میں اختلاف نہیں۔

بخارا ز دماغ یکے شد بلند رسانید و ہمیش بگردوں کند
ایک شخص کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ
حق یہی ہے، اب وہ آسمان سے باتیں کرنے لگا، کہ اسے آسمان سے الہام
ہو رہا ہے۔

یکے فکر جمع کتب می کنند ز اوراق کسب جب می کند
بعض اشخاص کتابیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ کتابوں میں مصنفین کے
خیالات ہی تحریر ہوتے ہیں، یہ پڑھتا ہے اور تقلید انہیں سچ یقین کرتا ہے،
اس لئے یہی کتابوں کے اوراق اس کے ذہن پر پردہ کا کام دیتے ہیں، وہ
خود نہیں سوچتا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ وہ
انہیں اس حد تک صحیح یقین کرتا ہے کہ اپنا زور طبع ان کی تائید پر صرف
کرتا ہے، اس طرح اکثر کتابوں کی شرح لکھی گئی۔

یکے شد مہندس بگفت و شنید یکے ساغر فیلسوفی چشید

بیدل

ریاضی دان تو چند آدمی گزرے ہیں۔ انہی کی کتابوں کو رٹ کر
لوگ ریاضی دان مشہور ہو جاتے ہیں، ابوالفضل کے دفتر پر طرہ کر
لوگ منشی فاضل بن جاتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ پڑھ کر لوگ
فلسفی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدرسوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

یکے خاک را گفت تمکین شعار یکے گفت گردوں نداد قرار
پہلے حکماء کا یہ نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور تمام اجرام سماوی
اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ آج یہ نظریہ باطل ہو گیا۔ ایک مدت
دراذت تک۔

بوہم دگماں جمعے از پیرواں نکردند جز کسب تصدیق آں
لوگ اسی نظریہ کو صحیح یقین کرتے رہے اور اسی مفروضہ کو صحیح قرار دیکر
کائنات کی گتھی سلجھاتے رہے، اور دلوں کو تسکین دیتے رہے کہ ہم کو کائنات
کا راز معلوم ہو گیا۔ لیکن اب عرصہ میں تحقیق و تصدیق کی زحمت ہی گوارا
نہ کی۔

ندیدند از عقل جہل الکتاب
کہ ہست از چہ رہا بس سکون و شتاب
کسی نے کوشش نہ کی کہ پہلے یہ تو تحقیق کرے کہ ”حرکت“ اور ”سکون“
کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اگر کبھی کچھ عقل سے کام لیا تو جہل ہی
کسب کیا۔

دے کر حقیقت بیاں می کند حوالہ بفہم کساں می کند
اگر کوئی ان اسباب کو بیان بھی کرتا ہے تو حوالہ متقدمین کے اقوال
ہی کا دیتا ہے۔

کہ آں بحر دانش چنیں گفتہ است
در معرفت این چنیں سفتہ است

کہ فلاں بحر العلوم نے یہ اور وہ فرمایا ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ معرفت کے آبدار موتی اسی نے جمع کئے۔ یہ سلک مروارید اسی نے تیار کی۔

کسے تکیہ بر فہم مردم کند کہ چوں جہل راہ خرد گم کند
بیدل کہتا ہے کہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہی شخص دوسروں کی عقل کا سہارا
لیتا ہے جو خود عقل سے بے بہرہ ہے۔ یعنی جاہل ہے۔ اس لئے تقلید اور
جہالت لازم و ملزوم ہے۔

قیاس و گماں خصم دانائی است سراپائی تقلید رسوائی است
تحقیق اور شے ہے اور قیاس اور گماں اور چیز ہے۔ آخر الذکر یعنی قیاس و
گمان عقل کی دشمن ہیں اور تقلید عقل ہی کی رسوائی ہے۔

دے کا متحاں آشکارا شود مقلد بہ تحقیق رسوا شود
مقلد کی شناخت یہ ہے کہ جب اس کے علم کا امتحان کیا جائے تو
جاہل ہی ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں بیدل نے پاک حکایت لکھی ہے کہ
فضولے بایں کار آگہاں بلاں سخن بود گرم بیاں
ایک فضول بیہودہ گواہی تحقیق کی طرح باتیں بنا رہا تھا۔ کہ میں نے
اکثر دریا کا سفر اس طرح کیا ہے جس طرح بادل کرتا ہے تجارت پیشہ ہوں
اور اسی ذریعہ سے کشتی کی طرح کئی دریاؤں سے عبور کر چکاں۔

زمن معنی بحر پوشیدہ نیست دریں نسخہ حرفے نفیہ نیست
مجھے بحر کے تمام حالات کا علم ہے اور کوئی ایسی بات بھی تو نہیں جو
میں نہیں سمجھتا۔ جو لوگ ساحل پر رہتے ہیں انھیں سمجھاؤں تو کیسے سمجھاؤں
کہ انھوں نے کبھی سمندر کو دیکھا تک نہیں۔

یکے گفت زیں جملہ سیر و سفر زباہی اثر بردہ باشی مگر
حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے اتنی سیر و سفر میں مچھلی تو
ضرور دیکھی ہوگی۔

بیدل

کہ چوں دیدہ و آب دارد وطن ز داغ است پیموں دش پیرہن
 پچھلی کی مشابہت صورت آنکھ سے ہے دونوں پانی میں ڈوبی رہتی ہیں اس
 تشبیہ نے شعر میں لطف پیدا کر دیا کہ آنکھ کی طرح پانی میں اس کا وطن ہے اور
 اس کا لباس تمام داغدار دل کی طرح ہے۔ اس یا وہ گونے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا سوال
 ہے۔ اس تمام سفر میں یہی پچھلی تو میری غذا تھی، سائل نے جب دیکھا کہ آپ اس قدر
 عتاب فرما رہے ہیں تو کہا کہ حضور میں پچھلی اور اس کے حالات سے بالکل ناواقف
 ہوں۔ اگر سوال کیا تو خفا نہ ہوں۔ اگر کچھ بیان فرمائیں تو میں قیاس کر لوں گا۔ کہ
 پچھلی کی کیا شکل و صورت ہوتی ہے۔ اس بیہودہ گونے کہا کہ ہوشمند پچھلی وہی ہے
 جس کے سر پر اونٹ کی طرح دو سینک ہوتے ہیں۔ ”بہیں باشترو ما ہی ایجاد کن“
 اونٹ دیکھ لو اور اس پر پچھلی کو قیاس کر لو۔ تمام حاضرین تہقہہ مار کر ہنسے اور
 سمجھ گئے کہ ”چو ما ہی شتر نیز کم دیدہ است“ کہ پچھلی تو دیکھی نہیں اونٹ بھی نہیں
 دیکھا۔ بیدل کہتا ہے کہ

چہ لانی بحرف کساں خامہ وار صریحے ز تحقیق خود ہم برآر

لوگوں کی باتیں سن کر وہی لوگوں سے باتیں کرنا اور اس پر فخر کرنا کہ میں صاحب علم
 ہوں یا مجھے لوگ عالم سمجھ کر عزت کریں، نہایت ناواقف بات ہے قلم حروف تو لکھتا ہے
 مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ حروف شناسی قلم کو حاصل نہیں۔ اس لئے شایان انسانیت یہی
 ہے کہ تو اپنی تحقیق اگر کچھ ہے بیان کرے۔ اس موضوع پر مولانا رومیؒ نے بھی لطیف بحث
 کی ہے کہ بعض لوگ اہل اللہ کی سی باتیں کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح
 شکاری جانوروں کی بولیاں بولتے ہیں۔ جانور اپنے ہم جنس کی بولی سن آتا ہے
 اور جال میں پھنس جاتا ہے اسی طرح یہ ریاکار فریبی لوگوں کو پھانس لیتے ہیں وہ تو
 سمجھتے ہیں کہ حضرت مقربان میں سے ہیں مگر کیا معلوم کہ نرے باتوں ہی ہیں عقل کے
 اندھے اور گانٹھ کے پورے اکثر پھنس جاتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس نباید داد در ہر دست دست
 اکثر آدمی آدم صورت شیطان ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کے ہاتھ پر بیت نہ کرنی چاہئے۔

عرفان

مثنوی ”عرفان“ کے گیارہ ہزار ابیات ہیں، اس مثنوی کے اختتام پر
بیدل نے تاریخ تصنیف کہی ہے کہ

وضع ابیات این خیال نمود جز خطے چند در خیال نمود
یک ہر گاہ در شمار آمد بر زبان یازدہ ہزار آمد
کرد تاریخ او نیاز ارقلم ہدیہ ذوالجلال والاکرام

۱۱ ۲۴ ۱۱

اس مثنوی میں بیدل نے داؤد تحقیق دی ہے۔

علم تحقیق می کسند تلقین کہ در آئینہ ظہور یقین
تا بہ افشائی رسد اسرار محو گیر از تحقیق آثار

علم تحقیق یہ ہے کہ کسی امر، کسی شے، کسی واقعہ کے بارہ میں یقین نہیں
ہو سکتا جب تک وہ ”اسرار“ یعنی پوشیدہ ہے۔

جب تک وہ کسی صورت میں رہتا ہے تو نہ ہو جیسے ہمارے حواس
محسوس کریں، اس حالت پوشیدگی میں وہ ”ہیولی“ سے تعبیر ہوتا ہے،
اور جب تک محسوس و مکشوف نہ ہو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جہاں تک ہمارے
علم یقین کا تعلق ہے بمنزلہ عدم ہے۔

بیدل

اعتبار طبیعت بیرنگ از ہیولی شد اشتہار آہنگ

یہ ”طبیعت بیرنگ“ ہے جو ہیولی کے نام سے اصطلاح میں مشہور ہے۔ ہر ایک شے کی ”طبیعت“ خود بیرنگ ہے، اور جب تک کوئی شے کسی رنگ روپ میں محسوس نہ ہو اس کا انکشاف ہم پر نہیں ہو سکتا، یہی ”طبیعت بیرنگ“ جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کیل ہے ہیولی کے نام سے تعبیر ہوتی ہے اور اس کی موجودگی کا احساس اس صورت سے ہوتا ہے جس میں وہ رونما ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت محض اشارہ ہے جو ہیولی کی ہستی کی طرف ہے، یا جیسا کہ بیدل نے اور مقام پر کہا ہے۔ حروف یا ”کسوت عبارت“ ہے جس میں معانی پوشیدہ ہیں۔ اصل شے یہی ”ہیولی“ ہے، ایک غزل کا مطلع ہے کہ

یک دودم ہنگامہ تشویش مہر و کیسنہ بود

ہرچہ دیدم یہاں خانہ آئینہ بود

زندگی ایک دودم ہی ہے، یہی سانس ایک آتا اور وہی دوسرا جاتا ہے، اس لئے زندگی بھر ”مہر و کیسنہ“ نے پریشان رکھا، یعنی مہر و کیسنہ ہی ہے جس سے رشتہ تعلقات اس دنیوی زندگی میں انسان کا اپنے ہم جنس انسانوں سے بلکہ کائنات کی اشیاء سے ہے کہ کسی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے اور کسی شے سے نفرت ہوتی ہے۔ لیکن جب میں نے بغور دیکھا تو یہ جذبات مہر و کیسنہ آئینہ دل پر صورتوں کا نقش ہی تھے، اور زندگی کے ساتھ محو ہو گئے، آئینہ میں کوئی صورت مستقل نہیں ہوتی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے کہ

ہیچ شکلی بے ہیولی قابل صورت نہ شد

آدمی ہم پیش ازاں کا دم شود بوزینہ بود

”ہیولا“ کی موجودگی مقدم ہے اور جب تک یہ نہ ہو کوئی شکل منصور نہیں ہو سکتی، اس لئے صورت آدم کا ”ہیولا“ ”بوزنہ“ تھا، کہ اسی سے ارتقا کرتا ہوا آدم انسانی صورت میں آیا۔ لیکن بندر کی صورت تو محسوس ہوتی ہے،

اس لئے یہ ابتدائی ہیولا نہیں ہے۔ بندر کا ہیولا بھی کچھ اور ہونا چاہئے جو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہی ہوگی، پہلی کڑی حسب ارشاد قرآن ”نفس واحدہ“ ہے جو ”طین“ سے ارتقاء کرتا ہوا آخر انسان بنا۔ اسی طرح اس شہادت کی رو سے انسانی ہیولا اس صورت کا ہوگا جو ”خلق جدید“ میں رونما ہوگی، اس کا صحیح تصور ہم موجودہ حالت میں نہیں کر سکتے، لیکن جس طرح بندر انسان کے بہت مشابہ ہے اسی طرح انسان کے مشابہ وہ صورت ہوگی جو ”خلق جدید“ میں متوقع ہے۔

فکر ہر جا رموز تخم شگافت جز ہیولائے برگ و بار نیافت
درخت کا ”ہیولا“ بیج ہے، اہل فکر جب درخت کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان پر واضح ہوتا ہے کہ درخت کے پتے اور پھل وغیرہ کی اصل یا ہیولا وہی بیج ہی ہے جس میں ارتقاء درخت کرتا ہے۔

برگ و بر نیز گاہ پیدائی می کند تخم را ہیولائی
یہ قانون فطرت ہے — کہ پیدائش میں کوئی شے چونکہ باطل نہیں اور ذات باری تعالیٰ حق ہے اور حق سے حق ہی پیدا ہوتا ہے، یا ظل از باطل بروید حق ز حق، اس لئے کوئی شے جو ایک دفعہ خلق ہوئی معدوم نہیں ہوتی۔ یعنی کسی شے کا ”بیج ناس“ نہیں۔ اس لئے بھی ہر ایک شے اپنے وجود میں کامل ہے، بیدل کہتا ہے کہ

بیج موجودے بعرض شوق ناقص جلوہ میست
ذره ہم در رقص مو ہو میکہ دارد کاملست

ہر ایک شے جو موجود ہے اپنے ظہور یا جلوہ میں ناقص نہیں ہے، ذرہ بھی اپنی فطرت کا اظہار رقص میں کرتا ہے اگرچہ یہ موہوم ہی ہے مگر کامل ہے۔

اس لیے کوئی شے خواہ ارتقاء کے بے شمار مرحلے طے کر چکی ہے ہر ایک

بیدل

ارتقائی مرحلہ کی شہادت بھی موجود ہے، یہی ”بیج“ نشوونما پا کر درخت بنا، لیکن بیج ناس نہیں ہوا وہی پھر پھل میں ظاہر ہوا۔

آب گاہ لطافت است ہوا بچوں ہوا از فسدن آب بنا
پانی کی اصل ہوا ہے، دونوں کی مختلف صورتیں حرارت کی کمی بیشی سے ظہور میں آئیں، پانی کو حرارت دی جائے تو لطیف ہو کر بخارات اور پھر ہوا کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے جب ہوا میں حرارت ایک خاص درجہ تک کم ہو تو وہ پانی بن جاتا ہے۔

جلوہ بر جلوہ آنچہ پیدا شد آں یکے صورت آں ہیولا شد
ایک صورت سے دوسری صورت جلوہ نما ہوتی ہے، پہلی ”ہیولا“ اور دوسری اسی کی صورت ہے۔

اسم آخر با شتہار آمد کہ ہیولا بروئے کار آمد
”ہیولا“ اسم ”اقل“ ہے اور جب اس کا ظہور ہوا تو یہ اسم ”آخر“ کا منظر ہے۔

بیدل پیدائش میں ہر ایک شے کو اسما و صفات سے تعبیر کرتا ہے، کہ سب مظاہر قدرت انہی اسما و صفات کے ہیں۔

صور جسم ہائے امکانی دارد این آئینہ بعریانی
ملکات یعنی جو کچھ بھی موجود ہے یا موجود ہو سکتا ہے ان کی مادی صورتیں انہی اسما و صفات کی آئینہ دار ہیں اور یہی بے حجابانہ منکشف ہو رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ

نقش پیدا و آئینہ محبوب بخفا گشت ازین سبب منسوب
آئینہ میں صورت منعکس ہو تو صورت تو مشاہدہ ہو رہی ہے مگر آئینہ کو اس صورت نے چھپا لیا، آئینہ غیب ہے اور صورت ظاہر۔
اس لئے ”خفی“ بالغیب سے یہ حقیقت موسوم ہوئی اور یہی ”ہیولا“ ہے۔

ایں ہیولانہ عرض و لئے طول است
چوں طبعیت وجود معقول است

یہ ہیولانہ نہیں جس کا عرض و طول ہوتا ہے، عرض و طول اس میں نہیں جس طرح ”طبعیت“ معقول فی الذہن شے ہے اسی طرح اس کی موجدگی یا ہستی ایک ذہنی امر ہے اور حقیقت یہی اور اصل شے ہے، طویل بحث کے بعد بیدل ان طبقات کو جو کرہ ارض پر مشاہدہ ہو رہے ہیں بطور شہادت پیش کرتا ہے، ہم نے چند اشعار کا انتخاب کیا ہے، مقصد تو اتنا ہے کہ قارئین بیدل سے روشناس ہوں۔

کرہ ارض پر سلسلہ موجودات کی آخری کڑی ”انسان“ ہے۔ بیدل انسانی صورت کا ہیولانہ تلاش کے بعد پیش کرتا ہے، کہ ادنیٰ طبقہ جمادات کا ہے اور پھر نباتات اور اس کے بعد حیوانات کا اعلیٰ اور بلند تر طبقہ ہے آخری طبقہ میں ”انسان“ ایک ممتاز ہستی مشاہدہ ہوتی ہے۔ اس کا ہیولانہ طبقہ جمادات میں ہے اور اسی طبقہ میں وہ خاص خاص صورتوں میں ظاہر ہوا جس کی شہادت موجود ہے۔ بیدل کی تحقیق سمجھنے کے لئے یا موضوع زیر بحث کے فہم کے لئے ”ہیولا“ کے بعد ”علم“ کا فہم مقدم ہے جو انسان کی امتیازی خوبی ہے۔

”علم“ کے بارہ میں بیدل کہتا ہے :

چلیت علم؛ اصل قدرتیچوں تلک جمعیت ظہور و بطوں
علم کیا ہے؟ حقیقت قدرت الہیہ ہے جہاں چہ و چند و چوں کام نہیں
آتے۔ کائنات خارجی اور ذہنی تصورات میں عین مطابقت کا نام ہے۔

حسن مرآت عالم و معلوم نور تمیز حاکم و محکوم
علم آئینہ ہے جس میں ہر ایک حسن و خوبی خواہ عالم میں ہے یا معلوم میں
رو نما ہوتی ہے۔ اور مختلف طبقات ہستی کے نشیب و فراز اور اعلیٰ و ادنیٰ
میں امتیاز اسی نور علم کی روشنی میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

بیدل

تا نگیری ز علم خامہ بدست صورت پہنچ چیز نتوان بست
یہ علم ہے جو مصوّر ہے اور ہر ایک شے کی صورت ہو ہو کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔
غیر علم آنچہ کردہ اندر قم نیست جز جہل و جہل جملہ عدم
علم کی ضد جہالت ہے اور جہالت کا مفہوم عدم ہی ہے کہ کسی شے سے
انسان روشناس نہیں ہو سکتا اس لئے غیر علم جو کچھ بھی ہے محض جہل ہے اور
جہل عدم کے ہم معنی ہے۔

نزد اہل حقیقت ایجاد پہنچ چیزے بغیر علم نزاو
جواہل نظر محقق ہیں ان کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ کوئی شے علم کے بغیر
ایجاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ کائنات جو عالم ایجاد ہے اس کی اصل وہی
”قدرت بیچوں“ یعنی علم ہے۔ بعض حکماء کا یہ نظریہ ہے کہ علم مادہ کی پیداوار
ہے۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ مادی کائنات علم نے ایجاد کی ہے۔ کیونکہ یہ
حقیقت ناقابل انکار ہے کہ کوئی ایجاد بغیر علم ممکن ہی نہیں۔

ہرچہ بینی ز مفرد و ترکیب دارد از علم جو ہر ترتیب
خواہ کوئی شے مفرد ہو یا مرکب اس کی ترتیب علم ہی سے ہے۔ بیدل
نے مادی کائنات کے نظام اور اشیاء کی ترکیب و ترتیب کی شہادت پیش
کی ہے کہ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ”جو ہر ترتیب“ یعنی اس کی اصل علم ہے،
اس حد تک بحث نظری تھی جس کی تصدیق تجربہ اور مشاہدہ سے ہو سکتی ہے۔
یہ مجمل بحث ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ابیات میں کرتا ہے۔

غافل از عالم جماد مباحث کہ نہا نہادیں محل شدہ فاش
کہ ارض پر تین مادی طبقات ہیں، ایک جمادات دوسرا نباتات
تیسرا حیوانات، تینوں کی حقیقت ایک ہی ہے، مادہ صرف صورتیں ہیں
جو ہم اپنے حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں، حقیقت ایک پوشیدہ شے ہے،
حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے جو الغیب ہے احساس اسی حالت میں

ممکن ہے جب وہ کسی صورت میں رونما ہو، جس کو اصطلاح میں ”مجاز“ کہتے ہیں، یہ حقیقت زیر بحث ہم پر منکشف نہ ہوتی اگر وہ کسی صورت میں رونما نہ ہوتی، یہ صورت مادی ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ
 باخفا حقیقت، بافتشا مجاز بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز
 حقیقت پوشیدہ یعنی کسی صورت میں رونما نہ ہو تو ”الغیب“ یا باطن سے تعبیر ہوتی ہے، اور جب کسی صورت میں ظاہر ہو مجاز سے موسوم ہے۔ جب ظاہر صورتوں میں رونما ہو جو ہم محسوس کرتے ہیں تو ”عالم“ اس کا نام ہے اسے ”تشبیہ“ کہتے ہیں یا عالم ”امثال“ اور اگر تنزیہ یا غیب ہو تو ”راز“ کہلاتا ہے۔

عقول و نقوش از دلش تازباں

موالید و عنصر زباں تابیاں

معقولات اور محسوسات یا تصورات جو دل پر ثبت ہیں اور خیالات کی صورت میں دل سے زبان پر آتے ہیں۔ موالید یعنی جمادات و نباتات و حیوانات اور وہ عناصر جن سے ان کی ترکیب ہوتی ہے اصل میں ایک ہی مختلف قسم کی صورتیں ہیں۔ بلکہ نہ صرف زبان بلکہ ان کا بیان جو زبان ادا کرتی ہے جسے ”کلام“ کہتے ہیں۔ یہ بھی اسی کی ایک صورت ہے۔ بیدل کے حکیمانہ تفکر کی بلندی کا اندازہ اسی شعر سے ہو سکتا ہے۔ ”بیان“ کیا ہے؟ خیالات کی ترجمانی حرف و صوت کی ”صورت“ میں، خیالات کیا ہیں؟ نقوش یا تصورات جو کائنات خارجی کے مشاہدہ سے بذریعہ حواس دل پر ثبت ہوتے ہیں یا پیدا ہوتے ہیں، کائنات کیا ہے۔ صورتیں، یا نقوش ہیں جن میں ”حقیقت“ رونما ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہو کہ یہ ”حقیقت“ متکلم ہے اور ہم مخاطب، تصویری زبان میں ہم پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم گفتگو میں اپنا

بیدل

مافی الضمیر اپنے مخاطب پر اپنی مادری زبان میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ”بیان“ کے سلسلہ کی پہلی کڑی یہ حقیقت مجروحہ ہے۔ جو کائنات کی صورتوں اور پھران صورتوں کے نقوش اور خیالات کی شکل میں ہمارے دل میں پیدا ہو کر زبان پر آتے ہیں۔ اس لئے حقیقت ایک ہی ہے اگرچہ صورتیں یا اشارات مختلف ہیں۔ حروف اشارات ہی ہیں۔

تامل بمعدن، نفس در نباتات، بھواں صدا دور انسان لغات
جب ہم کسی سوچ میں ہوں تو خاموش ہوتے ہیں مگر دل ہی دل میں باتیں کرتے ہیں، اسی طرح یہ کلام حقیقت معدنیات یا طبقہ جمادات میں خاموش ہے، اور یہی نباتات میں ”سانس“ کی صورت اختیار کرتا ہے، جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو سانس کی آمد و رفت اور حرکت زبان سے آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ صوت حروف کی صورت اختیار کرتی ہے، نباتات میں زبان نہیں مگر سانس ہے، سانس زندگی کے آثار میں سے بھی ہے۔ طبقہ حیوانات میں سانس اور زبان دونوں ہیں اس لئے ان میں آوازیں ہیں، مگر حروف نہیں، انسان میں یہ تینوں باتیں ہیں اور اس کی زبانوں اور بولیوں نے ”لغات مرتبہ کی۔ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

آں نغمہ بے نشانے پردہ راز کانسان زانوئے اوست مخرج پرداز
در آئینہ جماد موج رنگست در طبع نبات، بھواں آواز
حقیقت تو غیب الغیب ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں تشریح کی ہے کہ خارجی صورت آخر انسان ہے (خلق الانسان علیہ البیان) یہی اس کا بیان بھی ہے اور بیان کر رہا ہے، یہی جمادات کے آئینہ میں رنگوں کی صورت میں موج مار رہی ہے، یہی نباتات میں ”بو“ یعنی سانس لے رہی ہے، اور یہی حیوانات میں آواز دے رہی ہے۔

الغرض ”غافل از عالم جماد مباحث“ ہم سمجھتے ہیں کہ جمادات پتھر اور

مٹی کی چیزیں بے شعور مُردہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ یہ غفلت ہم آیات الہیہ سے برتتے ہیں۔ ان کا مطالعہ عقلاً نہیں کرتے، یہ اشیاء بھی ہم سے ہم کلام ہو رہی ہیں۔ لیکن بوجہ غفلت ہم ان کی نہیں سنتے، مولانا روم فرماتے ہیں۔

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل

اہل دل جو اہل علم و حکمت ہیں وہ طبقہ جمادات کی باتیں سنتے ہیں، ہمیں اشیاء کے خواص کا علم ہی کیسے ہو سکتا تھا اگر یہ اشیاء اپنے حقائق اپنی فطری زبان کے ذریعہ ہم پر واضح نہ کرتیں، ہماری تمام مادی ترقیات انہی مادی اشیاء کے خواص و حقائق کے علم سے وابستہ ہیں۔ بیدل کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ”حقیقت مجردہ“ ہے، یہ کلمہ الہیہ ہے، ناممکن ہے کہ اللہ کسی سے ہم کلام ہو۔ یعنی حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے، جب یہ کسی صورت میں رونما ہوتی ہے تو اس کی ”ہستی“ کا شعور ہمیں ہوتا ہے، لسان قرآن میں یہ صورت ایک تو ”وحی“ ہے جس میں غلطی کا احتمال بہ تعلق فہم بھی نہیں ہے۔ دوسری ”من وراء حجاب“ یعنی اشیاء کی صورتوں کے پردہ میں اور یہ بذریعہ تذکر و تفکر اہل علم پر عقلاً ہوتا ہے۔

زین تعین کہ وقف اجار ہست جوش اسرار علم بسیار ہست
اگرچہ طبقہ جمادات میں اشیاء کی صورتیں متعین ہیں اور ایک ہی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہیں اور ان میں زندگی کے آثار بظاہر نمایاں نہیں مگر ”حضرت علم“ کے اسرار ان میں بھی جوش مارتے ہیں۔

سیر اشکال گر ہوائے کسے است خفت و ثقل طول و عرض بس است
اگر کسی کو خواہش ہو کہ ان جمادی اشیاء کی شکلوں کا جائزہ لے تو کم و بیش ان میں وزن اور طول و عرض تو مشاہدہ ہو رہا ہے۔

آنچہ زین ہا بہ پردہ مکشوف است
اکثرے بر خواص موقوف است

بیدل

ان شکلوں کے پردہ میں جو کچھ ہم پر منکشف ہو رہا ہے زیادہ تر ان اشیاء کے خواص ہی ہیں۔

باوجود جوارح مفقود موجدہامی زندہ خواص وجود جمادات میں حیوانات کی طرح دست و پا و اعضا نہیں لیکن ”وجود“ کے خواص ان سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔

جہل عام است در طبیعت سنگ کہ نصیبے ندارد از فرہنگ پتھروں پر عام جہالت طاری ہوتی ہے۔ جاہل انسان بھی پتھر ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی گیا گزرا، اس لئے کہ کسی امر کو شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے جیسا کہ انسان کرتا ہے (علمہ البیان) ”بیان“ کسی شے کے خواص یا حالات کو تفصیل کے ساتھ واضح کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی سے علم کا نشو و نما ہوتا ہے، جہاں بیان یا قوت گویائی نہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر سکے وہاں جہل مسلط ہے۔

صفحہ میں جافسردگی رقم است نقش قدرت ہنوز در عدم است اس صفحہ ہستی جمادات پر افسردگی چھائی ہوئی ہے، وہ نقوش جو نباتات و حیوانات میں صاف صاف ممیز مشاہدہ ہوتے ہیں ان کا وجود جمادات میں بمنزلہ عدم ہے۔

اس موضوع پر بیدل نے طویل بحث کی ہے، ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں۔

نام اجار خاص فلزات است کہ زانوار علمش آیات است پتھروں کی بے شمار قسمیں ہیں، ان میں سے ایک خاص قسم کا نام ”فلزات“ ہے، جو علم کے نور کی نشانیاں ہیں، یعنی ان میں نور علم کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد چاندی اور سونا اور فولاد اور الماس کے خواص پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

ذہب از معنی است نشاہ پذیر خاصہ در اعتبار اسم بصیر
 "نشہ" بھی غیر محسوس شے ہے، معنی بھی، الفاظ محسوس ہوتے ہیں،
 مطلب شعر یہ ہے کہ سونا میں معنی کا نشہ ہے، یعنی بے معنی شے نہیں۔ "اسم بصیر"
 کے خواص اس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

گر ز خاصیتش خبر گیری بہرہ قوت بصر گیری
 اگر تو اس کی خاصیت سے واقف ہو تو قوت بصر کی حقیقت منکشف
 ہوگی، یہ حقیقت تو ہر ایک ڈاکٹر اور حکیم کو معلوم ہے کہ سونا امراض چشم
 بالخصوص ضعف بصر کے لئے بہت مفید ہے۔

سیم دارد سپردہ قوت دل رفع حاجات و حل ہر مشکل
 چاندی کی پوشیدہ خاصیت یہ ہے کہ دل کو تقویت دیتی ہے اور سونا
 چاندی ویسے بھی ہر ایک مشکل کا حل اور ہر ایک حاجت رفع کرتا ہے۔

اے زر تو خدانہ ولیکن بخدا

ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

از زر و سیم نزد اہل نظر نیست پنہاں خواص شمس و قمر
 اہل نظر جانتے ہیں کہ سونے میں سورج اور چاندی میں چاند کے
 خواص موجود ہیں، یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے کہ زمین اور چاند ابتداء
 میں ایک سورج کا جزو تھے اور یہ کہ سیم و زر وغیرہ دھاتیں سورج ہی سے
 ان کے حصہ میں آئی ہیں اور یہ کہ شمس و قمر کے خواص زمین میں بھی ہیں۔
 غالباً بیدل کا اشارہ اس "طلم" سے ہے جو بعض حضرات چاندی اور سونے
 سے باندھتے ہیں۔ اور لگن اور گھڑی اور مہورت وغیرہ یا سعد یا نحس
 ساعت میں گنڈے تعویذ بناتے ہیں۔

ہم چناں روشن از ظہور حدید اعتبارات نفع و باس شاید
 اس شعر میں قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے

بیدل

حدید کو نازل فرمایا جس میں نفع اور باس شدید ہے، لوہا بہت مفید دھات ہے اور جنگ میں بہت کارآمد ہے۔

زیں نسق درجواہرا حجار علم دار و ظہور بے تکرار
می فرائد زاقصنائے اثر حجر سرمہ نیز نور بصر
اسی طرح جواہرات میں ”علم“ کا ظہور ہو رہا ہے، ایک سنگ سرمہ ہے، لوگ آنکھوں میں لگاتے ہیں، سرمہ کا فطری اثر ہے کہ نور بصر زیادہ کرتا ہے یہ سمجھنا چاہئے کہ ”اسم بصیر“ کا ظہور سنگ سرمہ کے اثر میں ہوا ہے۔
توتیا است ہم بریں تاثیر بمددکاری نظر توفیر
اسی اثر و تاثیر کی وجہ سے اسے ”توتیا“ کہتے ہیں کہ نظر کی تیزی میں مدد دیتا ہے۔

ہر یک بایں جابرنگے از آثار میدہد عرض جوہر اسرار
اسی طرح ہر ایک پتھر اپنے اپنے خواص کا اظہار مختلف پیرایہ اور صورتوں میں کر رہا ہے جو ان میں پوشیدہ ہیں۔

گشتہ در عالم ظہور عیاں بلباس خواص قدرت شاں
عالم ہستی میں ان کی قوتیں ان کے خواص کے لباس میں ظاہر ہو رہی ہیں۔
اثر قدرت اند خاصیات بے خبر نگذری ازیں درجات
یہ اسی ”قدرت بیچوں“ کا اثر ہے جو خواص اشیاء سے تعبیر ہوتا ہے، ان میں بھی درجات ہیں، ان سے بے خبر نہ رہنا چاہئے۔ ارشاد قرآن ہے کہ کتنی آیات ارض و سموات میں ہیں لوگ یونہی ان پر سے گزر جاتے ہیں اور (وہ تو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں) یہ منہ پھیر لیتے ہیں یہی غافل لوگ ہیں۔

اولیں نشاء ظہور ایں جاست ابجد درس گاہ نور ایں جاست
طبقہ جمادات میں اسماء و صفات کا ظہور اول اسی میں ہوا ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ مکتب علم و حکمت کی ابجد خوانی کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

جمادات میں وہ جذبات بھی ہیں جنہیں ہم محبت و نفرت سے موسوم کرتے ہیں، بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

یعنی ایں جانقاب شوق درید میل آہن ربا بجزب حدید
آہن ربا یعنی مقناطیس اور لوہے کو دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ شوق میں لوہا خود بخود بے حجابانہ بے تکلف کھچا جا رہا ہے۔

قدرت افشائے معنی دارد کایں کشش درظہور می آرد
یہ اسی قدرت بچوں کا کرشمہ ہے وہی اس معنی کو واضح کر رہی ہے کہ یہ کشش کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔

نہ حدید است پیش خود مختار کہ بجزب و قابود خود دار
لوہا خود مختار نہیں ہے۔ اس کا اختیار آہن ربا کے سامنے سلب ہو جاتا ہے وہ بے اختیار کھچا چلا جاتا ہے، انسان میں بھی جذب محبت جب عشق کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی اپنی قوت ارادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ حسن کے حضور بے اختیار ہو کر رہ جاتا ہے جذبہ وفا کے ساتھ خودداری لوہے میں باقی نہیں رہتی۔

نہ در آہن ربا تغافل ناز کہ بر آہن روش نگرود باز
حسن کا تقاضہ ”تغافل ناز“ ہے۔ مگر آہن میں خود مختاری اور خودداری نہیں تو آہن ربا میں ”تغافل ناز“ بھی نہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوہا تو کھچا چلا جائے اور آہن ربا کھچا رہے، اور منہ پھیرے۔

آن بجزب اختیار داؤزدست ایں بہ تسلیم ناتوانی مست
جذبہ الفت میں لوہے نے تو اپنا اختیار ہاتھ سے دیدیا اور آہن ربا بھی سر تسلیم خم کر رہا ہے اور بیچارہ اسی میں مست ہے۔

درجنوں زار عشق علیے ہست کہ بہ فہم کسے ندارد دست
اس جنون محبت میں بھی حضرت علم ہی کا رہا ہے کہ جو فہم و ادراک

بیدل

سے بالاتر ہے، کنہ حقیقت نامعلوم ہے، جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے اس کے تاثرات ہی ہیں جو اس کی ہستی کا پتہ بتاتے ہیں۔

اس کے بعد بیدل جذبہ نفرت پر بحث کرتا ہے کہ دیکھو پارہ آگ سے دور بھاگتا ہے، گویا ان میں بغض کا رفرما ہے۔

پس بہ طبع جماد افسردہ نتواں بست تہمت مُردہ
نتیجہ واضح ہے کہ اگرچہ جمادات افسردہ نظر آتی ہے مگر اس پر مُردہ کا حکم نافذ نہیں کیا جاسکتا، یہ مُردہ نہیں، مُردنی کی تہمت سے بری ہے۔
ایں اثر ہائے آگہی درجات نیست بید ستگاہ ساز حیات
یہ خواص اور ان کے تاثرات درجات علم ہی ہیں اور زندگی کے ساز و سامان کے بغیر نہیں ہو سکتے۔

علم ہیں جانود رفع حجاب اول از آہن آخرا ز سیاب
علم نے اس مقام پر پردہ اٹھا دیا اول آہن اور آہن ربا کے حالات میں اور آخر آتش اور سیاب کی صفات میں۔
عقل کز آگہی قلم برداشت بغض و حب نام ایں صفات نہاد
عقل نے جب شعور کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کرنا چاہا تو ان صفات کا نام بغض و حب رکھ دیا۔

انس و وحشت و دیعت از لیست جوہر ایں صفات لم یز لیست
حب و بغض، انس و وحشت، اُلفت و نفرت جذبات ازل سے ہر ایک شے کی فطرت میں و دیعت ہیں۔ ان صفات کی اصل یا حقیقت ایسی ہے کہ کبھی زائل یا تبدیل و تحویل نہیں ہوتی۔

اس طویل بحث کے بعد جسے ہم نے بالاختصار ادا کیا ہے بیدل مسئلہ ارتقاء کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس کی تائید میں طبقہ نباتات سے شہادت پیش کرتا ہے کہ جمادات کا ارتقاء نباتات میں مشاہدہ ہوتا ہے بعض پتھر

جن کو ”سنگِ شجر“ کہتے ہیں نباتات کی شکلیں ان میں نظر آتی ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اس عالمِ ایجاد کی اصل ہوا ہے، جو ”جوہر لطیف“ ہے، اسے اصطلاحِ تصوف میں ”نفسِ رحمانی“ کہتے ہیں، جمادات نے ایک سانس لیا تو دوسرا سانس نباتات کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حکمتِ ایجاد عالمِ من و ما یعنی آں جوہر لطیف ہوا
دم دیگر نفس بقدرتِ راند صبح ہنگامہ نبات دماند
اس کے بعد یہ بحث ہے کہ طبقہ جمادات میں جو خواص و حقائق ادنیٰ درجہ میں مشاہدہ ہوتے ہیں وہی نباتات میں بدرجہ اعلیٰ نظر آتے ہیں۔ خود جمادات میں افسردگی کے درجات ہیں اس طبقہ میں جو اعلیٰ اجزاء ہیں ان میں افسردگی کم اور کمتر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ارتقائی سلسلہ کی آخری کڑی نباتات کے ادنیٰ درجہ سے آکر مل جاتی ہے، نباتات میں بھی وہی خواص اور جذبات ہیں جو ادنیٰ درجہ کی حالت میں جمادات میں مشاہدہ ہوتے ہیں۔

ریشہ ناتواں دریں عالم می شکافد دماغ سنگِ ازہم
نباتات کا ریشہ کتنا کمزور ہوتا ہے اور پتھر کتنا سخت اور وزنی ہوتا ہے مگر نباتی ریشہ پتھر کو توڑ کر نکل آتا ہے۔ پہاڑوں پر روئیدگی اسی طرح مشاہدہ ہوتی ہے۔

دانہ تا شود نمو مائل سربروں می کشد ز صد من گل
ایک دانہ کی کیا بساط ہے مگر جب نشوونما کی طرف مائل ہوتا ہے تو سو من مٹی سے باہر سر نکالتا ہے۔

بظہور خواص نفع و ضرر قدرت آئینہ شاخ تا بہ ثمر
درخت کا پتہ پتہ، شاخ سے ثمر تک اس کا ہر ایک جز و اپنے نفع و ضرر سے واقف ہے اور حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کے لئے جس قوت کی ضرورت

بیدل

ہے وہ درخت اور اس کے پتوں اور شاخوں اور پھلوں میں صاف صاف کارفرما ہوتی مشاہدہ ہو رہی ہے۔

گر ہمہ نیم گام رہ سپرست ریشہ را بر حرام خود نظر است
اگر درخت کا ریشہ ایک آدھ قدم بڑھتا ہے تو اس کی نظر اپنی رفتار پر ہے۔ وہ غلط قدم نہیں اٹھاتا۔

ہمہ سوائیا ز شمع نمود ہمہ جا روشن احتیاط وجود
ہر ایک طرف اس کا نشوونما مناسبت کے ساتھ ہو رہا ہے، شمع کی روشنی ہر ایک طرف یکساں پڑتی ہے اسی طرح درخت بڑھتا ہے تو ہر ایک طرف ایک خاص مناسبت سے ایک جیسا پھیلتا ہے، ہر ایک جگہ یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اپنے وجود کی حفاظت کر رہا ہے۔

خواہ در باغ خواہ در بیشہ سوئے آتش نمی رود ریشہ
خواہ باغ میں ہو یا جنگل میں ریشہ درخت آگ کی طرف نہیں جائیگا۔
آگ اور لکڑی میں بیرہے، اس لئے وہ اپنے دشمن جان کو خوب جانتا ہے اور اس سے دور ہی رہتا ہے۔

یک ہر جاست، آب ٹل است بقرار تلاش حاصل اوست
لیکن وہ کسی جگہ سو پانی اس کی طرف مائل ہوتا ہے، بغیر جدوجہد تلاش وہ اسے خود بخود حاصل کر لیتا ہے، پانی نباتات کی زندگی ہے اس لئے وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ میرا مایہ حیات ہے۔

احتراز و رجوع آتش و آب نیست بے دانش خطا و صواب
اس کا آگ سے بچنا اور پانی کی طرف رجوع کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اسے خطا و صواب کا شعور ہے، وہ جانتا ہے کہ آگ کی طرف جانا خطا ہے اور پانی کی طرف رجوع کرنا صحیح ہے۔

قدرت و اختیار فطرت شان ظاہر است از تمیز سود و زیان

نباتات کی طاقت اور اختیار اسی سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے نفع و ضرر، نقصان اور فائدہ میں تمیز کرتی ہے اور نفع کی خواہش اور ضرر رساں اشیاء سے بچتی ہے۔

بار ورنخل ہا بعلم تر اند کہ ز تنبیہ قابل اثر اند
ذی خرد را بفہم دور اندیش ہر قدر علم بیش عبرت بیش
نخل ہا کایں سبق شناختہ اند از نباتات بیش تافہ اند

جس طرح عالم انسانی میں بھی علم و شعور کے درجات ہیں بعض جاہل اور بعض عالم اور جہالت و علم کے بھی مراتب ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں۔ تربیت سے یہی بعض درخت پھل عمدہ اور زیادہ دیتے ہیں۔ اور ان پر تنبیہ و زجر و توبیخ اور بدنی سزا کا بھی اثر ہوتا ہے۔ بیدل اس کی مثالیں پیش کرتا ہے کہ اگر کوئی درخت پھل نہ دے یا کم دے تو اس درخت کے پاس آکر کہو کہ اگر تو نے اب کے موسم میں خاطر خواہ پھل نہ دیا تو تجھے کاٹ دیا جائے گا اور مناسب ہے کہ کلہاڑی کی ایک دو ضربات بھی لگائی جائیں، دوسرا شخص بیچ بچاؤ کرتا ہوا کہے کہ اب درگزر کرو، اس طرح درخت پھل کثرت سے دیگا۔ اگر کسی درخت کے پاس آکر کہو کہ مجھے تیرا پتہ یا چھلکا فلاں مرض کے لئے فلاں روز یا ساعت درکار ہے تو اس میں مرض کے ازالہ کی خاصیت پیدا ہو جائے گی۔

زیں مراتب چمن طراز جہات رنگ ہا چیدہ از مزاج نبات
جہات کے چمن آرائی کرنے والے نے نباتات کے مزاج سے طرح طرح کے رنگوں سے ہر طرف ایک آرائش و زیبائش کا سامان فراہم کر رکھا ہے۔

نار و دودے کہ در دل کہسار نعل و یا قوت کردہ بود بخار
برق زدا از مزاج لالہ و گل جلوہ گر شد ز سبز و سنبل

بیدل

وہی آگ اور دھواں جو پہاڑوں کے دل سے اُٹھتا ہے اور جس نے لعل
یا قوت کی صورت اختیار کی وہ لالہ و گل کے مزاج میں ایک برقی رو ہے
جو سبزہ و سنبل کی شکل میں نمودار ہوئی۔ لعل و یا قوت طبقہ جمادات کی
چیزیں ہیں ان میں جو بات ہے وہی لالہ و گل میں ہے یہی آگ دونوں طبقوں
میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے، کوئلہ اور ہیرا ایک ہی شے ہے
جسے ”کاربن“ کہتے ہیں۔ کوئلہ کو زیادہ حرارت آفتاب پہنچی جل گیا اور
یا قوت کو مناسب حرارت ملی۔ دھواں پیچ و خم کھاتا ہوا پھیلتا ہے اسی
طرح سبزہ و سنبل پھیلتے ہیں۔

نرگستاں بخامہ تقدیر داد پرواز دستگاہ بصیر
نباتات کو جمادات سے ہی مناسبت نہیں بلکہ حیوانات سے بھی
ہے۔ نرگس کی شکل آنکھ کی ہے، خامہ تقدیر نے یہ صورت انسان اور
نرگس میں ایک ہی جیسی کھینچی ہے۔ اسم ”بصیر“ کا ظہور نرگس میں ہوا
ایک رباعی ہے۔

گر بہ تحقیق اس بہارت نظریست ہر سبزہ زبان شرح و بسط و گریست
در پردہ گوش گل و چشم نرگس آرائش کار گاہ سمع و بصریست

لالہ ہم طرح بنیشے انداخت

چشم واکردہ مردمک پرداخت

لالہ نے بھی بنیانی کی شکل و صورت کی بنیاد رکھ دی، آنکھ کھولی اور
آنکھ کی پتلی بھی مشابہ ہو رہی ہے، لالہ کی صورت آنکھ کی طرح گول ہے اور
جیسے آنکھ میں پتلی سیاہ ہوتی ہے ایسا ہی لالہ میں داغ ہے۔

تاہیا کند سمیع آغوش پنبہ غنچہ برگرفت از گوش

اسم ”سمیع“ کا تاکہ ظہور ہوا اور نباتات کو اپنے آغوش میں غنچہ کے کان
سے روئی نکال دی، تاکہ وہ ہمہ تن گوش ہو اور بھلتا مانع شنوائی ہے دور ہو جائے۔

غنجہ کی صورت بھی گوش و آغوش کی ہے۔

ہر گلے را کہ فہم چشم انگاشت
صورت گوش نیز در برداشت
شکل و صورت، صحت و امراض و جذبات و احساسات طبقہ نباتات میں
بھی پائے جاتے ہیں۔

تا زرمز حیا شوی محرم گذر از فہم پنجد مریم
”پنجد مریم“ ایک بوٹی ہے جس کو ”لاجوتی“ اور بعض شرم بوٹی کہتے
ہیں، اگر اس کو ہاتھ سے چھوئیں تو فوراً مڑ جاتی ہے، اس کے بعد ہاتھ اٹھالیں
تو اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے، گویا اس بوٹی کو حیا دامن گیر ہے کہ نامحرم
غیر سے اپنے آپ کو چھپاتی ہے۔

کاں تخیر نہال شرم نشاں ہمہ چشم است و سر پسر مژگاں
اس بوٹی کی پتیوں پر ہلکے ہلکے نرم کانٹے سے ہوتے ہیں جو مژگاں کی
صورت میں، یہ عجیب بوٹی شرم کا مجسمہ ہے۔

گر نظر سولیش افگنی از دور خویش را دزد و کند مستور
اگر اس پر نظر دور سے پڑے تو اپنے آپ کو چھپاتی ہے۔
برگ برش ز سایہ اغیار چوں مژہ برنگہ تندنا چار
اس کی پتی پتی نامحرم کے سایہ سے حیا کرتی ہے اور مژگاں کی طرح
نگاہ پر چادر ڈالتی ہے۔

بے گمان معنی بصیریں جاست کہ سراپاں پرودہ دار حیاست
بلاشبہ اسم بصیر کی یہ منظر ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک پرودہ دار حیثیت ہے۔
حاصل الامر جہان نباتات علم دارد ہزار رنگ آیات
علم ہی ہے جو نباتات میں مناسب صورت میں کار فرما ہے۔
حکم اسماء دریں تجلی زار داد پیش از جہاد عرض بخار
حقیقت میں یہ اسماء الہیہ کا ظہور ہے جو اس کائنات میں جلوہ فرما ہیں۔

بیدل

جمادات سے پہلے ”بخارات“ تھے یا ہوائیں (تھیں، ”علمِ کیمیا“ کے عالم جانتے ہیں کہ یہی ہوائیں یا ”غاز“ ہی جمادات کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

فبط انفاس بال چند کشاد شوخی رنگ بویروں افتاد
یہ ”غاز“ جب ”فبط“ ہوئیں تو رنگ و بو کی شوخی بھی نباتات میں ظاہر ہوئی، ان ہواؤں کو انگریزی میں ہائی ڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، کاربن کہتے ہیں، یہ زندگی کی مدد ہیں، نباتات کی زندگی انہی سے ہے۔
ایں زماں سحر می طراز عشق علم ناز می فرازد عشق
جب اس حقیقت نے جو جمادات سے نباتات میں ارتقائی حالتیں ظاہر ہوئی تو ”عشق“ نے جادو پھونکا، اور اپنا جھنڈا بلند کیا۔

گرمی سعی آن بخاراکنوں خواند بر شعلہ، صعود فصول
بخارات تو بلند ہوتے ہیں ان میں جو حرارت ان کی حرکت طبعی نے پیدا کی تھی اتنی بڑھی کہ شعلہ کی صورت میں نمودار ہوئی جو چمک دمک کے بعد سرد پڑ گیا اور پستی کی طرف مائل ہوا۔

خامہ فطرت یقین تقریر کرد روح نباتات تحریر
خامہ فطرت نے جو نقش بھی کھینچ رکھا ہے وہ یقینی تقریر ہے۔ اس کا نام ”روح نباتات“ لکھ دیا۔

ہر طرف شکل ہا معائنہ شد دست دیا و جوارح آئینہ شد
طبقہ نباتات میں ہر طرف شکلیں نظر آنے لگیں، ہاتھ اور پاؤں اور دیگر اعضاء بھی صاف صاف دکھائی دینے لگے طبقہ نباتات میں دست و پا و جوارح نہیں ہیں۔ ان اعضاء کا کچھ فطری کام بھی ہے، نباتات میں یہی کام یہ کرتے ہیں۔

انگل قامت باقتدار کشید شاخ ہا دست بر ہوا بازید

درخت سیدھے کھڑے ہو گئے اور ایک وقار کے ساتھ سراونچا کیہ شانوں
نے ہوا میں اپنا ہاتھ بڑھایا۔

صورت دست و پا و چشم و زباں ہمہ زیں جلوہ سرکشید عیاں
ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان کی صورتیں اس میں جلوہ نما ہوئیں۔
لیکن تصویر کامل اس جا نیست جز ہیولی از شخص پیدا نیست
لیکن یہ صورتیں اور شکلیں ایسی کامل نہیں ہیں جیسی کہ حیوانات میں مشاہدہ
ہوتی ہیں، اس طبقہ نباتات میں ابھی تک ”ہیولی“ نے وہ صورت پیدا نہ کی جو
طبقہ حیوانات میں ہے۔

جوف پیدائش دریں اعضا تمام باید تصرفات ہوا
اس کے اعضا میں جوف پیدائش ہوا تاکہ ہوا کی جگہ نکل آئے اور اس کے
تصرف سے وہ کیفیت پیدا ہو جو طبقہ حیوانات کے جسم اور ہڈیوں وغیرہ
میں ہے۔

ہرچہ زیں صورت و شمائل است
باد در دست و پائے در گل است
ان صورتوں اور شکلوں میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ”باد در
دست“ ہوا تو ہاتھ میں اور پاؤں کیچڑ میں، ہوا شانوں اور پتوں سے لگا کر
گزر جاتی ہے، ”باد در دست“ محاورہ ہے، چونکہ ہاتھ میں ہوا بند نہیں رہ
سکتی اس لئے محاورہ میں مراد بے فائدہ کوشش ہے۔ اور ”باد در گل“ کے معنی
پابندی، جو آزادی کے منافی ہے، جمادات میں حرکت نہیں مگر نباتات میں
ہے اور وہ باد در دست اور پائے در گل کے ساتھ محدود ہے۔

دست خالی چہ بے بجام کند پائے در گل چہاں خرام کند
ہاتھ خالی شراب کو پیالہ میں کیسے انڈیل سکتا ہے، یعنی اس نشہ سے
محروم ہے جو ہاتھ کی حرکت میں ہے، پابند کس طرح چل پھر سکتا ہے۔

بیدل

سعی دست تہی دریں گلزار مگر آتش زند بخود چو چنار
اس گلزار میں خالی ہاتھ پاؤں مارنا اپنے آپ میں چنار کی طرح آگ لگانا
ہے۔ چنار اور آگ میں خاص مناسبت ہے، اس درخت کے مزاج میں اتنی
حرارت ہے کہ اگرچہ سرد ممالک میں پیدا ہوتا ہے مگر اس پر برف گرتی ہے تو
پانی ہو کر بہہ جاتی ہے۔

از موالید ہر چہ گشت رقم بود مشق عبارت آدم
ان طبقات جمادات و نباتات کا بیان جو ہم نے کیا ہے تو غرض یہ تھی کہ
آدم کی ابتدائی تاریخ لکھی جائے۔

حکمت ایں است آں نقوش خیال
شخص ایں جاست مابقی تمثال
جس طرح آئینہ میں کسی شخصیت کا عکس صورت ہوتا ہے اسی طرح شخصیت
تو آدم ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس آئینہ کائنات میں ”تمثال“ ہے۔ یعنی اس آئینہ
میں جہلک انسان کی شخصیت یا وجود ہی کی نظر آتی ہے ان طبقات میں حقیقت
تو صرف وہی ہے جو حقیقت انسانی ہے باقی جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ سب
صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت رونما ہو رہی ہے، اور یہی حقیقت وجود انسانی
میں بدرجہ اتم جلو نما ہوئی۔

برزیاں نام آدم آمد در نظر ہر دو عالم آمد
میری زبان پر آدم کا نام آتے ہی دو جہان میری نظروں میں پھر گئے،
جو کچھ ان دونوں جہانوں میں ہے اس کا خلاصہ آدم ہے۔ یا یوں کہو کہ آدم
کے دم سے دو عالم ہیں۔ ان کی پیدائش کا منشا اور حکمت آدم ہے، (لولاک
لما خلقت الافلاک)

زیر کفہ خاک از دو عالم بیش اعتدال حقیقی آمد پیش
آدم خاکی میں دو عالم سے بڑھ کر حقیقی اعتدال پایا جاتا ہے۔

ہر کجا اعتدال جلوہ گر است
کف و موج و محیط یک گہراست

جہاں کہیں اعتدال جلوہ نما ہے وہاں کثرت و وحدت میں محو ہو جاتی ہے۔ دریا ہو یا کف ہو یا موج سب اپنی اصل وحدت میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ ”اعتدال“ کی کمی بیشی ہے کہ کثرت کی نمائش ہو رہی ہے، علماء کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات میں حرارت کی ایک خاص مقدار سرگرم عمل ہے۔ یہ مقدار کم و بیش نہیں ہوتی، لیکن اس کی تقسیم میں کمی بیشی کثرت پیدا کرتی ہے، پانی، برف، بخارات، ہوا مختلف اشیاء ہیں، مگر ان کی اصل حرارت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہو رہی ہے، حرارت کمتر درجہ پر برف اور ذرا زیادہ درجہ پر پانی اور اس سے اور زیادہ ہو تو بخارات اور آخر ہوا کی صورت۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں ”اعتدال“ ہی مشاہدہ ہوتا ہے اگر میزانِ عدل (اس عالمِ تضاد میں توازن قائم نہ رکھتی تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو گیا ہوتا۔ آدمِ خلاصہ موجودات ہے، اس کے وجود میں یہی فطری اعتدال بدرجہ کمال نظر آتا ہے اور اسی عدل کی وجہ سے کہ

جسمِ اصلی ہمیں کفِ خال است کہ محیط رموزِ افلاک است
جسمِ انسانی تو مٹھی بھر مٹی ہی ہے مگر تمام رموزِ حکمت اور کائنات
کی پیدائش کے مقصد پر یہی آدمِ خالی حاوی ہے۔
”عرفان“ میں بیدل لکھتا ہے کہ جب میں نے تحقیق کی تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان است
نہاں در ہر کفِ خاک کے جہاں است

بیدل

یعنی اصل ہر شے کی ”حیات“ ہے، مادہ تو محض صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت ”حیات“ رہ نما ہو رہی ہے۔ صورتیں متغیر اور تبدیل اور فنا ہوتی رہتی ہیں اور حیات انہی بہتر سے بہتر صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور بہترین صورت انسانی ہے، اس لئے زندگی اسی صورت میں اپنی ممکن ارتقائی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہے، اور یہ کہ انسان اگرچہ بظاہر بلحاظ جسم و جسد حقیر معلوم ہوتا ہے مگر کل کائنات اس کے قلب میں سمائی ہوئی ہے۔

مرجع خلق، منبع اشکال مرکز علم و مصدر اعمال

تمام کائنات کی پیدائش کا رجوع اسی آدم کی طرف ہے، یہ خود خلاق ہے، تمام شکلوں کا سرچشمہ یہی ہے، اشیاء کی صورتیں اور ان کے تصورات اسی میں محسوس اور متصور ہوتے ہیں۔ علم کا مرکز بھی یہی ہے اور علم کے مناسب اعمال کا صدور بھی اسی سے ہوتا ہے۔

پس نہ ترکیب تا جہان بسیط جسم و علم یک آدم است محیط

کائنات تو مادی جسم ہے اس میں علم کا رفرما ہے، لیکن علم کا مشاہدہ انسان ہی میں ہوتا ہے، علم سے خالی کوئی شے نہیں جیسا کہ ہم مثنوی ”طلسم حیرت“ کے تحت بیان کریں گے، لیکن انسان مرکز علم ہے، اور اس کا عمل وہ تصرف ہے جو وہ کائنات میں کرتا ہے، بیدل کا ایک شعر ہے۔

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

مرکب اور مفرد غرض کوئی شے ہو جسم و علم کی تعریف میں ہی آتی ہے

اور ان تمام پر انسان محیط ہے، اس شعر میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے

کہ آدم کو خلعت خلافت عطا ہوا تو اس لئے کہ ”جسم و علم“ میں تمام

کائنات کی اشیاء اور ہر ایک طبقہ ہستی سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ طاہوت

بنی اسرائیل میں سب سے چھوٹے قبیلہ ”بنیمن“ کے سب سے چھوٹے

خاندان کا سب سے چھوٹا فرد تھا، مگر ”جسم و علم“ میں ہر ایک قبیلہ کے ہر ایک خاندان کے افراد سے بڑھ کر تھا۔ اس لئے سموئیل نبی نے اسی کو بادشاہ بنایا اور وجہ بھی بتائی کہ جسم و علم میں سب سے بڑھ کر ہے۔

مثنوی عرفان کے ابیات گیارہ ہزار ہیں۔ ہم نے صرف ایک موضوع پر چند اشعار کا اقتباس کیا ہے، بیدل کا خاص موضوع تو یہی ہے مگر ضمناً وہ بہت کچھ بیان کرتا ہے، بطور نمونہ ہم صرف ان اشعار کو درج کرتے ہیں جو اس محقق بے بدل نے اختلاف عقائد پر لکھے ہیں۔

اے دلت کارخانہ نیرنگ غنچہ ات گل فروش چندی رنگ
تیرا دل کارخانہ نیرنگ ہے، اس کارخانہ میں تو نت نئی ایجاد کرتا رہتا ہے، تیرا غنچہ دل کتنی رنگینیوں کی گل فروش کر رہا ہے، شاعرانہ تخیل اور زبان کی حسن و خوبی ایسی باتیں ہیں جس پر ہم نے ابھی ترکب کچھ نہیں لکھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو بات اس کے الفاظ اور ان کی بندش اور تشبیہات وغیرہ میں ہے اس کی ترجمانی اگر کی جائے تو شعر کا خون کرنا ہے، بطور نمونہ ہم چند اشعار مناسب مقام پر پیش کریں گے مگر اس کتاب کا اصل مقصد یہ نہیں، ہم صرف بیدل کے حکیمانہ تفکر اور تحقیق کی داد دے رہے ہیں۔

ہیچ گل زیں بہار رنگ نہ بست کہ براہ شعور سنگ نہ بست
جو بھی خیال یا تصور دل میں پیدا ہوتا ہے اگرچہ بہار فطرت کا حسین رنگین پھول ہی ہوتا ہے لیکن اس کے حسن اور رنگینی کے مشاہدہ میں سنگ راہ اور امور بھی ہیں، کہ پائے شعور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے، غرض ظہور تو یہ ہے کہ ہر ایک شے کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھا جائے یعنی مشاہدہ حق ہو۔
اصل ہر حق و باطل است یکے جاوہ بسیار و منزل است یکے
جسے ہم حق و باطل سے تعبیر کرتے ہیں ان کی اصل ایک ہی ہے منزل

بیدل

مقصود تو ایک ہی ہے اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے شمار راستے ہیں، یعنی مذاہب بہت ہیں اور سب کی منزل حق تک پہنچنا ہے۔

ایں ہمہ جادہ است منزل نیست
لیک رہو تمیز و تابل نیست

یہ تمام مذاہب راستے ہیں، منزل نہیں ہے۔ غلط فہمی سے لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کو منزل مقصود سمجھ رکھا ہے، اور ان میں اتنا شعور نہیں کہ جاؤ و منزل میں فرق کر سکیں۔

اگر ایں عبرت تناسخ خام درجہاں ظہور بودے نام
قوم دیگر ہم از وقوع خیال می شد آئینہ داراں مثال
راستہ گزرگاہ ہوتا ہے، لفظ ”عبرت“ نہایت موزوں اور مناسب
واقع ہوا ہے، اگر ”تناسخ“ ہی صحیح ”منزل“ اس جہان ظہور میں ہوتی تو
حقیقت تو بدل نہیں سکتی ہر ایک قوم کا یہی عقیدہ ہوتا کیونکہ ”حق“ ایک
ہی ہے، ہر ایک قوم کے آئینہ عقائد سے یہی صورت تناسخ کی جھلک کھائی
دیتی۔

زین نہال آنچہ برا فراشتہ اند در زین ہائے ہند کاشتہ اند
اس آواگونی و ہرم کے درخت سے جو کچھ خوشہ چینی ممکن ہے اس کے
لیے خاک سیاہ ہند ہی موزوں و مناسب ہے، آریہ ہند و تناسخ کے قائل
ہیں، کہ ہر ایک روح ”چوراسی“ جو نہیں بجو گئی ہے۔

از گروہے دگر بریں آثار نیست آگاہ خفتہ تا بیدار
لیکن دوسری قوموں کا یہ عقیدہ نہیں، ان قوموں میں خواہ جاہل
ہو یا عالم اس مذہب سے ناواقف ہیں۔

نہ نصاریٰ است زین مقام آگاہ نہ خیال یہود دارد راہ
مسیحی اس مقام سے یا اس راستہ یا مذہب سے واقف ہی نہیں اور

یہود کا خیال بھی اس راہ کی طرف منتقل نہیں ہوا۔
 درمزاج یہود اگر ساریست حکم توراتیہ یک قلم جاریست
 ان کے دل و دماغ پر توراتہ کے احکام چھائے ہوئے ہیں، ان کے
 خیالات اور جذبات اور احساسات کا سرچشمہ ان کی یہی مقدس کتاب ہے
 جس سے وہ سب کچھ اخذ کرتے ہیں۔

وزنصارے نمی شود مشہود جز خیالے کہ عیسیٰ فرمود
 نصارے کے عقاید میں بھی وہی بات مشاہدہ ہوتی ہے جو ان کے
 حضرت عیسیٰ کے ارشادات ہیں۔

ہر یکے را ز درس کامل خویش سبق علم بردیست بہ پیش
 جو کچھ ان کے پیغمبر یا رشی منی یعنی کامل انسان نے ان کو درس دیا
 اسی سے سبق علم ازبر کیا۔

تا عقاید حجاب را ندید برہمن کعبہ را بخواب ندید
 ”العلم حجاب الاکبر“ علم سب سے بڑھ کر حجاب ہے جب عقاید
 نے پر وہ علم کو پھاڑ کر اس کی تار و پود الگ کر دی تو حالت یہ ہوئی، کہ
 اب کوئی برہمن کعبہ کو خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔

تا مسلمان مدارج دیں نہ آند بے نیاز از خیال کاشی ماند
 مسلمانوں نے جب اپنے دین کے مدارج ذہن نشین کئے تو ”کاشی“ کا
 خیال تک ان کے دل میں نہیں آتا، ”کاشی“ ہندوؤں کا مقدس تیرتھ ہے
 جیسا مسلمانوں کا کعبہ۔

قصص انبیائی فرقائی بیدیاں راست محض نادانی
 قرآن میں انبیاء کے قصے مذکور ہیں جس سے ویدوں کے ماننے والے
 محض جاہل ہیں۔

حالت دیوتائی شاستری مسلمیں را گواہ بخبری

بیدل

اسی طرح شاستروں میں جو دیوی اور دیوتاؤں کے افسانے ہیں مسلمان اس سے بے خبر ہیں۔

زریں حقیقت بزمِ مرہِ اسلام نرسانید پیک علمِ پیام
قاصدِ علم جو اللہ کا پیغام لے کر آیا یعنی آں حضرت نے مسلمانوں کو
ان مذاہب مختلفہ کا پیام دیا۔

نسخِ درامتِ محمدیست بزمِ مقبول جائے مرتدنیست
عقیدہ تناسخِ امتِ محمدیہ میں نہیں ہے مقبول بارگاہِ الہی کی بزم
میں کسی مرتد کو اجازت نہیں کہ داخل ہو۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ ”علم“ اور شے ہے اور ”عقیدہ“ اور
چیز ہے۔

بیچ گل زریں بہار رنگ نہ بست
گرہ براہِ شعور سنگ نہ بست

علم کا سنگِ راہ عقیدہ ہے۔ عقیدہ لفظ ”عقد“ سے مشتق ہے،
قوتِ فکریہ کو یہی شے جکڑ بند میں رکھتی ہے، اور اسی کا کرشمہ ہے کہ اچھے
بھلے انسان کو جاہل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہزار علمی شواہد اور دلائل عقلیہ
پیش کرو مگر جس عقیدہ کی زنجیروں میں اہلِ مذاہب جکڑے ہوئے ہیں اجازت
نہیں دیتا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں، یہی حقیقت قرآن کی اس
آیت میں واضح کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

الطَّيِّبَاتِ وَيَحْرِمَ عَلَيْهِمُ النِّجَاسَاتِ وَيُضَعِّعْ عَنْهُمْ أَمْرَهُمْ

وَالْأَغْلَالِ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ - (۹ : ۹)

لوگوں نے وہ اشیاء جو فطرتاً پاکیزہ ہیں عقائد کے تحت حرام بنا رکھی
ہیں۔ اور امر و نہی یعنی قوانین بھی ایسے وضع کر رکھے ہیں جن میں یہی عقائد

کار فرما ہیں۔ یہ پیغمبر طیبات کو حلال اور خباثت کو حرام قرار دیتا ہے اور جن رسوم کے طوق ان کی گردنوں کا بار ہیں اور جس رواج کی زنجیروں کے بوجھ کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں، یہ رسول توڑ پھوڑ کر ان کو سبکدوش کرتا ہے۔ عموماً بحث مباحثہ میں لوگ اپنے اپنے عقائد کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، گویا یہ حقیقت ثابتہ ہیں، غرض عقیدہ نہایت مکروہ شے ہے۔

کانِ وفا جو ہر کرم بنیاد

ہمہ را وعدہ قیامت داد

وہ وفا جو ہر اور کرم بنیاد یعنی آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو ان کے اعمال کی سزا و جزا اور مغفرت کا وعدہ بروز قیامت دیا۔

بر مسلمان ز فکر دور اندیش

اگر آید قیامت آید پیش

مسلمانوں کے ذہن میں بھی قیامت کا نقشہ اتنا گہرا ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے ظہور میں آتا ہے ان کی فکر دور اندیش اس میں قیامت کا جلوہ ہی دیکھتی ہے۔

مومنوں را ظہور این آیات نبود جز بموقف عرفات

ہر ایک مسلمان کا اس پر ایمان ہے کہ سزا و جزا عرصہ قیامت ہی میں ملے گی۔

گر مکافاتے از عمل بیند خویش را ہم در آن محل بیند

اگر اسی دنیا میں اپنے اعمال ناشائستہ کی سزا انھیں ملتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت قائم ہے اور ہم اللہ کے حضور اعمال کے جوابدہ ہیں۔

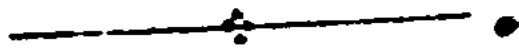
علم مارا بحکم رحمت و سرود مبتلائے خیال و ہم نہ کرد

رحمۃ اللعالمین کے ارشاد کے مطابق جو علم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس نے ہمیں توہمات کی بھول بھلیوں سے بچا لیا۔

بیدل

اہل اسلام از ہر کجا زادند
زین خیالات فارغ افتادند
مسلمانوں کی قومیت خواہ کچھ ہو خواہ کسی ملک میں رہائش ہو انکی
جنم بھومی خواہ کہیں ہو ان تو ہمت سے بے نیاز ہیں۔

بیدل نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اور تنازع کی چند
مثالیں بھی بیان کی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عقیدہ جب قومی ہو
اور ہزار ہا سال سے پختہ ہو چکا ہو تو وہ ”وراثت“ میں منتقل ہوتا رہتا
ہے، اور اہل عقیدہ جیتی جاگتی دنیا میں وہی کچھ مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے
عقیدہ کے مناسب تائیدی شہادت ہوتی ہے۔ ”وراثت“ ایک مستقل
موضوع ہے۔ اس پر بحث کی گنجائش اس مقام پر نہیں۔



طلسم حیرت

مثنوی عرفان اور طلسم حیرت اور طور معرفت میں بیدل کا شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر جمع ہے۔ یہ بیدل کے شاہکار ہیں، طلسم حیرت میں اس مادی کائنات کا مذکور ہے اور اس عالم اجسام میں سے خلاصہ موجودات ”انسان“ کے وجود پر بحث کی گئی ہے، ”سلطان حقیقت“ ایک بادشاہ ہے اس کی تعریف یہ ہے۔

کہ در ملک تقدس بود شاہی معلیٰ مسندے عزت کلاہی
کہ ملک تقدس میں ایک بادشاہ تھا، اس کا تخت عالی اور
تاج عزت کلاہ تھی۔

”وجوب آباد“ بیرنگی حصارش ”تعیین با“ سپاہ بیشمارش
”وجوب آباد“ اس کے ملک مقدس کا صدر مقام تھا اور ”تعیینات“
اس کی بے شمار سپاہ تھی۔

ز تختش سطح نہ گردوں نشستے دو عالم از کلاہ او شکستے
اس کے تخت کی سطح پر نو آسمان پست تھے اور عالم (دنیا و آخرت)
اس کے تاج کی زیبائش کے آگے ماند تھے۔

یہ شہنشاہ اپنے دارالملک ”تنزیہ“ میں ”اقلیم تشبیہ“ پر فرمانروائی

بیدل

کر رہا تھا۔

بدن را مقدس تشریف جاں داد
 زمین را اعتبار آسماں داد
 اس اقلیم میں تشریف فرما ہوا تو ”بدن“ کو اس کے قدوم میں منت لزوم
 نے جاں افزائی بخشی، زمین کو آسمان کی عزت نصیب ہوئی ”بدن“ میں سنے
 تین قلعے دیکھے جو پسند فرمائے، اول ”دماغ“

حصارے دید چوں اندیشہ عالی چو بہت متطر صاحب کمالی
 یہ قلعہ خیال کی طرح بلند پرواز اور بہت کی طرح کمال کا منظر تھا۔
 بدہ منزل سواد او مزین بہر یک منزل استاد می معین
 عمارت دس منزلہ تھی اور ہر ایک منزل پر ایک ایک پہرہ دار تھا۔
 ان کے نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) سامعہ (۲) باصرہ (۳) شامہ (۴) ذائقہ (۵) لامسہ (۶)
 حس مشترک (۷) خیال (۸) فکر (۹) وہم (۱۰) حافظہ۔

ان حواس ظاہری اور قومی باطنی کی تعریف کرتے ہوئے بیدل
 نے اپنے شاعرانہ تخیل کو بلند تر مقام پر پہنچایا جہاں آج تک کسی شاعر کی رسائی
 نہیں ہوئی۔ بطور نمونہ ہم صرف (۹) ”وہم“ کا آگے چل کر ذکر کریں گے، اس قلعہ
 کو دیکھتا ہوا سلطان ”حقیقت“

ازاں منزل عنان شوق گرداند حقیقت جانب حصن جگر اند
 ”دماغ“ سے گزرتا ہوا جگر کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی، اس جگہ
 بھی آٹھ پہرہ دار دیکھے :-

(۱) غازیہ (۲) نامیہ (۳) مولد (۴) مصور (۵) جاذبہ (۶) مست (۷)
 باضمہ (۸) دافعہ۔

جگر سے ”دل“ کے قلعہ کی طرف نہضت فرما ہوا، اس میں چھ پہرہ دار

اس کے آستانہ پر کھڑے دیکھیے۔

(۱) اُمید (۲) خوف (۳) محبت (۴) عداوت (۵) فرح (۶) غم۔

یہ سب کچھ دیکھتا گیا سلطان حقیقت ان ممالک میں سے ایسا مقام انتخاب کرنا چاہتا تھا جہاں آرام فرمائے۔

پس سلطان حقیقت زیں مسالک نمود آہنگ تفتیش ممالک
مقامے زیں مقامات مجازی ندید آرام گاہ بے نیازی
ان میں سے سوائے ایک دل کے کوئی پسند نہ آیا۔

مگر معسورہ بیرنگی دل کہ جاں آنجا تواند کرد منزل
یہ بستی جو دراصل بوجہ بیرنگی اُجڑی ہوئی تھی اور جس میں ”جان“ (نفس انسانی) مقیم تھی پسند فرمائی کہ چھ پہرہ داروں سے دل کا حال دریافت کیا۔ تو خوف و عداوت و غم نے مخالف رائے دی کہ دل ایسی جگہ نہیں کہ وہاں شہنشاہ آرام فرمائے۔ محبت نے کہا کہ

محبت گفتش اے شاہ دل آرا بدل جاکن بدل جاکن بدل جا
بادشاہ نے یہ رائے پسند فرمائی۔ اور

بحکم مصلحت تہدید سر کرد
ازیں شہر آں سے مفسد را بدر کرد

سیاست کا تقاضا تھا کہ بادشاہ نے اس شہر دل سے ان مفسدوں خوف و عداوت و غم کو بدر کر دیا۔

اس کے بعد ”بدن“ کے چار حکام (۱) خون (۲) صفرا (۳) سودا (۴) بلغم کو خلعت عنایت فرمایا۔

”کرامت شد بخون تشریف گلگون“ خون کو سُرخ لباس پہنایا، ”قبائے زعفری صفرا بسر کرد“ صفرا کو زعفرانی پوشاک عنایت ہوئی جس کے دامن میں ترکستان پیچیدہ تھا۔ ”لباس عنبریں شد وقف سودا“ عنبریں لباس سودا کے

بیدل

حصہ میں آیا۔ ”سراپا سرمہ چشم تماشا، بہ بلغم خلعت برگ سمن داد،“ بلغم کو سمن کا خلعت ملا۔ لیکن ان حکام میں آخر کار نہ بنی، ہر ایک غلبہ کا خواہاں تھا، ان میں مفسدوں خوف و عداوت و غم کی بن آئی۔ یہ قصہ طویل ہے اور ہر ایک انسان کی آب بیتی ہے۔

بیدل کا نظریہ وجود یہ ہے کہ

عالم ہمہ یک جلوہ ذات احد است ایں جانہ ہیوولی نہ صورت جداست
کثرت آثار چشم واکر دن ماست ایں صفر جو نحو شد ہماں یک عداست
آنکھ کی صورت بھی صفر کی ہے، اس لئے جب کھلی ہو تو ایک عدد پر صفر کا اضافہ کرتی جاتی ہے۔ اس طرح ایک سے دس اور دس سے سو اور سو سے ہزار تالا انتہا، حقیقت وجود واحد ہے۔ لیکن یہ ”چشم واکر دن“ کا کرشمہ ہے کہ ہم کثرت مشاہدہ کرتے ہیں اب آنکھ بند کر لو، آخر ایک دن خود بخود بند ہو جائے گی تو یہ صفر بھی محو ہو جائیں گے اور وہی ایک باقی رہ جائے گا۔ (تمام اشیاء یعنی کثرت فنا ہونے والی ہے باقی صرف تیرے پروردگار ذوالجلال والاکرام کی ذات ہے) بیدل ”عقل“ پر بحث کرتے ہوئے ”وہم“ کی نسبت لکھتا ہے کہ عقل تو اشیاء کی صورتوں اور حقائق جیسے کہ ہیں مشاہدہ کرنی ہے لیکن ”وہم“ محال اندیش ہے۔

دستاں کمالات محالی خطش بطلاں احکام خیالی

خیالے را کہ در خاطر در آورد محالے کرد و از جیش بر آورد

خیال یا نقش محسوسات خارجہ کا ہمارے قلب پر ثبت ہوتا ہے، اگر ہو ہو اور من و عن اشیاء خارجی اور ہمارے ذہنی تصور میں مطابقت ہے تو یہ ”حق“ ہے۔ جس کی تصدیق عقلاً اور بدایتاً ہوتی ہے۔ مگر قوت ”واہمہ“ کا یہ کام ہے کہ اسے باطل بنا کر چھوڑتی ہے جو صحیح خیال کے احکام و آثار ہیں ان پر خط باطل کھینچ دیتی ہے۔

زمرگان نشر آزار فہمی زگیسو پیچ و تاب مار فہمی

طنین پیشہ و نا خوردہ برگوش خروش طبل و رعدش بردہ از ہوش
غبارے گربہ پیش چشم بالید گمانش چوں صدا بر کوہ پچید
فرورفتی ز طبع وحشت اندیش بکام اژدر از خمیازہ خویش

اکثر شعرا کے کلام میں یہی قوت ”واہمہ“ کا رہا ہوتی ہے۔ کسی محبوب کی مرثاں کو نشتر آزار سے تشبیہ دیتے ہیں اور گیسو کو سانپ سے کہ پیچ و خم کھا رہا ہے۔ حالانکہ مرثاں اور گیسو کو نشتر اور مار سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اندھیرے میں ہم رسی کو سانپ تصور کرتے ہوئے ڈر جاتے ہیں، ارشاد قرآن ہے کہ شعرا کا اتباع گمراہی ہے جو ہر ایک وادی میں سرگردان رہتے ہیں۔ قرآن کی نسبت کفار کہتے ہیں کہ یہ شعر و شاعری ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہم نے اس حضرت کو شاعری نہیں سکھائی۔ پتھر عقل و فکر سے کام لو۔ یعنی جو حکیمانہ ارشادات ہیں شعرا کے کلام سے بالکل مختلف ہیں۔ اگر کسی پتھر کی بھینا ہٹ سمع نوازی کرتی ہے تو کان پر کاٹنے سے پیشتر ہی حواس باختہ ہو جاتے ہیں گویا نقارہ رعد کے شور و غل سے کان کے پردے پھٹ گئے، اگر آنکھوں کے سامنے غبار اٹھے تو گمان یہ ہوتا ہے کہ پہاڑ میں آوازیں گونج رہی ہیں، اگر انگڑائی لی تو یہ وہم ہوا کہ اژدھا کے منہ میں آ رہا ہے۔

ہمانا چشم او صفیر رستم بود

کہ ہر نقشے ازودہ بر یک افزود

وہم کوئی نیا خیال تو پیدا نہیں کر سکتا، میچ خیال کی ترتیب یا اس فطری تعلق کو جو اشیاء میں ہے بدلتا ہے، اسی وہم کا کرشمہ ہے کہ انسان اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔

حقیقت وجود واحدہ ہے اور حق ہے مگر واہمہ نقش وحدت کو کثرت دکھا رہا ہے۔

بیدل اب تفصیلی بحث کرتا ہے کہ ”واہمہ“ کو قوت حافظہ سے مدد کیسے

بیدل

ملتی ہے، ”حافظہ“ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

صفائی طینت او لوح محفوظ کر و نقش دو عالم بود ملحوظ

حافظہ ”لوح محفوظ“ ہے کہ اس پر دو عالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں، یہ شعرا علیٰ حکیمانہ تفکر کا نتیجہ ہے، اور ہر ایک زمانہ کے حکماء مشرق و مغرب کا یہی موضوع رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ کائنات خارجی میں اشیاء ایک تو صورتوں کا مشاہدہ ہے جو ”محسوسات“ ہیں اور دوسرے حقائق کا جو ان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، اور یہ ”معقولات“ ہیں۔ صورتیں خارج میں ہر آن بدلتی رہتی ہیں اس موضوع پر ہم ”تجدد امثال“ کے تحت بحث کریں گے، لیکن صورتیں ہوں یا حقائق قلب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، اور خود انسان بھی انہیں محو نہیں کر سکتا، یہ خیالات (یا نقوش ہم بالارادہ اور بلا ارادہ شعور یا بلا شعور اخذ کرتے ہیں۔ ہم صرف چاند کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ اس ماحول کو بھی دیکھتے ہیں جس میں چاند واقع ہے۔ ہم ایک درخت کی شاخوں اور اس کے پتوں کو شمار نہیں کرتے مگر درخت اس کی شاخیں اور پتے بلکہ تمام باغ اور اس کی روشیں بلکہ زمین و آسمان سب کچھ ایک نظر میں دیکھ چکے ہیں اور یہ ہمارے قلب میں محفوظ ہو گیا۔ خواب میں ہم سب کچھ دیکھیں گے، اور بالارادہ و شعور بیداری میں دیکھتے ہیں۔ قوتِ حافظہ کا کام یہ ہے کہ ان نقوش کو جب ہم چاہیں بیداری میں ہمارے دیدہ تصور کے سامنے لاتی ہے اس کو اصطلاح میں ”تذکرہ“ کہتے ہیں۔ یعنی کسی نقش یا واقعہ کی یاد۔

ولیکن دروستان مراتب منقش لوحش از ملک دو کاتب

دروہم نقش تصویر خیالی ہم از وہمیش اثر ہائے محالی

اس لوح محفوظ پر دو کاتب جن کو ”کرام کاتبین“ کہنا چاہئے حروف یا نقوش لکھتے ہیں یا یہ کہو کہ ہمارے نامہ اعمال پر سیاہ و سفید، نیک و بد جو کچھ ہم کسب کرتے ہیں، لکھتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہی صحیح خیال یا نقش ہے جسے

نیکی سے تعبیر کرنا چاہئے اور یہ عقل ہے، دوسرا ”واہمہ“ ہے جو صحیح تصویر خیال میں اثر محال کی رنگینی پیدا کرتا ہے۔

محال کا تصور انسان نہیں کر سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو بھی انسان کے ذہن میں خیال پیدا ہو ”محال“ نہیں۔ مناسب اسباب کے ساتھ ”ممکن“ ہے۔ واہمہ ضرور بظاہر محال اندیش ہے، مگر ممکنات کے تصورات ہی سے محال اندیشی کرتا ہے۔ اس کی مثال قرونِ اولیٰ کے مذاہب میں ملتی ہے اور ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے افسانوں (میں اس کا ذکر

ہے۔ کسی شکل کے چار ہاتھ، اور کسی خرمنغز کے دس سر، بیل کا جسد اس کو پر لگے ہوئے ہیں۔ شیر کا چہرہ، بیل کے سم اور علیٰ ہذا القیاس، یہ اشیاء خارج میں تو فطرتاً موجود نہیں لیکن انسان نے ممکنات کے توڑ جوڑ یا ترتیب بدلنے سے ایک نئی شکل پیدا کی اور پھر خارجی اسباب سے مورتیاں بھی گھڑ لیں، حقیقت یہ ہے کہ قوتِ واہمہ بڑے کام کی چیز ہے، محال اندیش ضرور ہے مگر جب عقل کے سامنے پیش کرتی ہے تو وہ اس کو ممکن صورت میں ڈھالتی ہے، تمام اختراعات اور ایجادات میں عقل واہمہ کی ممنون ہے۔ ”بے مصلحتی نیست ظہور شیطان“

زہر رنگے تو ہم سازہ صد آہنگ محال اندیش چوں کیفیت بنگ
رنگ ایک ہو تو واہمہ اس کو سورنگوں میں دکھاتا ہے، جس طرح بھنگ کے نشہ میں انسان زمین پر رہتے ہوئے فلک کی میسر کرتا ہے یہی کیفیت واہمہ قلب میں پیدا کرتا ہے، اسی طرح

ہمانا چشم او اصف رستم بود
کہ ہر نقشے از وہ بر یک افزود

یعنی کثرت جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں چشم و ہم سے کرتے ہیں فی الحقیقت یہ وحدت ہی ہے جو کثرت کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

جسے ”علم“ کہتے ہیں وہ اشیاء ہی کی معرفت ہے اور اس تعلق کا جاننا

بیدل

جس سے اشیاء آپس میں مربوط ہیں۔ اشیاء میں تو کثرت مشاہدہ ہوتی ہے، اور اختلاف اور کثرت لازم ملزوم ہیں، بلکہ ان میں تخالف تضاد کی حد تک ہے۔ اس میں ربط ”وحدت“ ہی ہو سکتی ہے، ہمیں کسی شے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو نقطہ وحدت پر نہ لائیں۔

کثرت کا مشاہدہ تو ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ ”وحدت“ کا مشاہدہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے دو طریق ہیں، ایک استدلال عقلیہ سے اور دوسرے براہِ ہمتا۔ یہ ظاہر ہے کہ بدیہی امور میں کوئی الجھن کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا، ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ استدلال عقلیہ میں غلطی کا احتمال ہی نہیں بلکہ واجب ہے کہ انسان عقلاً غلطی کرے، کیونکہ اسی پر اس کا ذہنی ارتقا منحصر ہے۔ طبقہ حیوانات ماسویٰ انسان غلطی نہیں کرتا مگر ترقی بھی نہیں کرنا استدلال عقلیہ میں چند امور بنیادی ہیں، ”عینیت“ یعنی دو اشیاء کا مختلف زمان و مکان میں ہر ایک تفصیل میں بعینہ ایک جیسا ہونا، مماثلت اور مشابہت اور تخالف اور تضاد بہ تعلق زمان و مکان مثلاً دور و نزدیک اور تہ و بالا اور پس و پیش اور علیٰ ہذا القیاس اور علت و غیرہ، ان قوانین تحقیق کے تحت کسی شے کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نامعلوم معلوم ہوتا ہے، یہ طریق استدلال اصطلاح میں تذکر و عبرت و تدبیر و تفکر سے موسوم ہے ”عقل“ ایسے امور میں جو مابعد السببیہ سے تعبیر نہیں ہوتے اور خواہ بدیہی ہوں مدد کرتی ہے، ان امور میں اس کی تصدیق واجب ہے۔

طور معرفت

یونیورسٹی لائبریری لاہور میں قلمی نسخہ ثنوی محیط اعظم اور طور معرفت کا موجود ہے۔ یہ نسخہ اسد اللہ خان غالب کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اور اس پر غالب مرحوم کی تہر ثبت ہے۔ غالب نے دونوں ثنویوں کی تعریف میں ایک ایک شعر اپنا اس نسخہ پر لکھا ہے۔ مہر پر ۱۲۳۱ھ ثبت ہے۔

ازیں صحیفہ بزرگے طور معرفت است
کہ ذرہ ذرہ چراغاں طور معرفت است

مرجباے را کہ موجب گل کند جام جم است
آب حیواں آبجوائے از محیط اعظم است
اس سے بڑھ کر بیدل کے کلام کی تعریف و توصیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ
غالب سا بلند پایہ شاعر مداح ہے۔

طور معرفت میں بیدل نے مظاہر فطرت، قوس و قزح و شفق و کہسار و
کوہ و ابر و غیرہ پر وہ کچھ لکھا ہے کہ قلم توڑ دیا۔ اس کے بعد اور کوئی کیا لکھے گا۔ اس
ثنوی اور ثنوی طلسم حیرت کے ابیات چھ چھ ہزار ہیں۔ مگر مکمل اب دستیاب
نہیں ہوتی۔ ہم طور معرفت سے چند ابیات دربارہ قوس و قزح اور جباب کا

بیدل

انتخاب کرتے ہیں۔

زموج سبزہ و گل رنگ ہاجست
شفق تابیے زد و قوس و قزح بست
گھاس اور پھول کی سبز اور سرخ رنگینی ابھری، اس سے شفق نمودار
ہوئی اور قوس و قزح بنی۔

گرا ز وصف قزح گیرد بیاں رنگ
ببالد از زمین تا آسماں رنگ
اگر قزح کی تعریف میں بیان کسی رنگ میں کیا جائے تو زمین سے
آسمان تک رنگینی ہی چھا جائے گی۔

رگ ابر بہارستانِ نیرنگ طلسم ریشہ فردوس در چنگ
قوس و قزح کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابر بہار کی رگوں سے رنگینی
برس رہی ہے یا باغ فردوس نے جو طلسم باندھ رکھا ہے وہ اس کے قبضہ تصرف
میں ہے۔

پر طاؤس صرف رشتہ دام خیال لعل نو خط برب جام
مور کے پروں کی رنگینی اور نقش و نگار کی تحسین تو لوگ کیا کرتے ہیں،
یہ سمجھو کہ قوس و قزح نے جال پھیلا رکھا ہے جس کے تاروں میں مور کے
پر الجھ کے رہ گئے یا جام کے لب پر لعل نو خط کا تصور کرو، یعنی ایک حسین کے
سرخ لب جس پر سبزہ کا آغاز ہو جام کے لب سے ملے ہوئے ہیں جس میں بادہ
ارغوانی کا بھی ایک رنگ ہے، یہ سب رنگینیاں مل کر قوس و قزح بنی۔

کشیہ خامہ نقاش فطرت خطوط امتحاں رنگ قدرت
نقاش فطرت کے خامہ نے قدرت کی رنگینوں کو امتحاناً خطوں میں
کھینچا کہ معلوم ہو کس درجہ پر ہیں۔

نزل قطرہ از اوج افلاک اگر مینی بسوئے مرکز خاک

خدا نگ بے خطائی اس کمان است کہ تا آماجگاہ دل روان است
اگر تو یہ نظارہ دیکھ رہا ہے کہ آسمان کی بلندی سے قطرے مرکز خاک کی
طرف گر رہے ہیں تو یہ تصور کر کہ تیر ہیں جن کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ اور اسی
”دھنک“ سے یہ تیر پرواز کرتے ہوئے دل کے ہدف پر بیٹھتے ہیں۔
چند اشعار ابر، شفق اور حباب پر ملاحظہ ہوں۔

چہ ابر آئینہ ناز گل و مل بہار صد شبستان زلف و کا کل
ابر کیا ہے؟ گل و مل کی لطافت و نزاکت کا آئینہ دار ہے زلف و کا کل
کی سوشبستان کی بہار ہے، بہار کے موسم میں پھول کھلتے ہیں اور بہار ہوا اور
ابر ہو تو دور شراب کا لطف اور زیادہ ہوتا ہے۔ گھنگھور گھٹا کی زلف و کا کل سے
تشبیہ نہایت موزوں ہے۔

ولے زلفی کہ در یک جنبش باد ہزاراں دل تواند کرد ایجاد
زلف بھی وہ کہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے لہرائے تو ہزاروں دل گرفتار
ہو کر رہ جائیں۔

جنوں پیما بہ چشمے گریہ آہنگ
سیہ مستے شکستہ شیشہ در چنگ

ایک عالم وحشت میں جا رہا ہے اور آنکھ روئے پر آمادہ ہے، بدست
ایسا کہ ٹوٹا ہوا شیشہ پنجہ میں ہے۔ یہ تو الفاظ ہیں ان سے جو کیفیت ذہن میں آتی
ہے وہ کچھ اور ہے ”سیہ مست“ انتہائی بدست کو کہتے ہیں، ابر سیاہ کے ہاتھ
میں شیشہ مے تو ہے مگر ٹوٹا ہوا، سیہ مستی کا یہ کرشمہ ہے، شیشہ ٹوٹا تو بادہ گر کر
زمین پر آ رہا۔ اس پر اس جنوں زدہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

سپرے ریزش سیارہ خرمن شبستان چراغاں زیر دامن
آسمان کی طرح چھایا ہوا ہے اس کے خرمن میں سیاروں کے دانوں کا
انبار ہے مگر وہ اب چمکتے نظر نہیں آتے، ابر نے ان آسمانی چراغوں کو اپنے

بیدل

دامن کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔

چومڑگان ہجوم اشک بستہ قدح در دست وینائی شکستہ
مڑگان سیاہ کی طرح جس پر آنسوؤں کا ہجوم ہو، قبح ہاتھ میں اور
صراحی ٹوٹی ہوئی۔

ہماں دیوانہ ژولیدہ مؤہست
کہ با سودائی خوشیش ہائی مؤہست
وہی دیوانہ ہے کہ بال ژولیدہ (جٹا دھاری) اپنی وحشت میں ہاؤہو میں
مست ہے۔

گہے از برق بر آفاق خندد نگہے بر خاک سیل گریہ بندد
کبھی تو آفاق پر بجلیاں گراتا ہے ساتھ ہی رعد کی گرج سے قہقہہ بھی
لگاتا ہے کبھی زمین پر آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا ہے۔

بتیغ کوہ گاہے سینہ مالہ گہے گیرہ دشت و بنا لہ
”بتیغ کوہ“ پہاڑ کے پہلو کو کہتے ہیں، کبھی پہاڑ کے پہلوؤں سے سینہ
رگڑتا ہے اور کبھی جنگل کا راستہ لیتا ہے اور روتا ہے یعنی برستا ہے۔

نگویم ابر مستے نشہ فیلے بگردوں موج زن دریائی نیلے
وے فیلے کہ تابوشید میلش بہ بیچہ کوہ را خرطوم میلش
میں یہ نہیں کہتا کہ ابر نشہ میں مست ہاتھی ہے آسمان پر ایک دریائیل
طغیانی میں ہے مگر ہاتھی وہ کہ جب جوش میں آتا ہے تو اس کی سونڈھ پہاڑ
کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔

بہر جائیکہ شبہم رشخہ کارد مزاج عالم از خشکی بر آرد
جہاں کہیں تھوڑی سی اوس کا ترشح بھی ہوتا ہے، عالم کی طبیعت سے
خشکی دور کر دیتا ہے، شفق کے متعلق چار شعر ملاحظہ ہوں۔
چہ گویم زین شفق ہائی جہاں تاب کہ آتش ہم نمی باشد بایں آب

شفق ایک تو طلوع صبح کے بعد اور ایک غروب آفتاب کے وقت اُفق پر
ظاہر ہوتی ہے، ان کی نسبت کیا کہا جائے آگ میں بھی وہ آب یعنی چمک مک
نہیں۔

دو عالم رنگت رنگ شعلہ دود ہوا حل کر دو برگردونش اندود
عالم صبح و شام شفق کے رنگ میں رنگیں مگر رنگ دھواں جو شعلہ ہے
جسے ہوانے حل کر کے آسماں کے چہرہ پر غارہ کر دیا ہے۔
دے کایں شعلہ نیزنگ فروخت جہاں در نالہ آمد کا سماں سوخت
جس وقت یہ شعلہ نیزنگ بھڑکا جہاں سے شورا اٹا کہ آسمان جل رہا ہے۔
کہا میں بسمل ایں جا پر فشاں شد
کہ خونش رفتہ رفتہ آسماں شد

وہ کون بسمل تھا جو تڑپا کر یہاں پہنچا کہ اس کا خون رفتہ رفتہ آسمان بن گیا۔
”جباب“ پر تو سچ مچ قلم توڑ دیا ہے۔ شمع و شاعر وغیرہ پر شعراء نے بہت کچھ
لکھا ہے طور معرفت سے شفق اور شاعر اور ابر پر لٹنے مضامین جمع ہو سکتے ہیں۔
زہے وضع جباب بے سرو پا کہ حیرانی ز نقش اوست پیدا
پانی کا ببلہ کیا ہی عجیب شے ہے کہ نہ سر نہ پاؤں، اس کی شکل و صورت
سے حیرانی ہوتی ہے۔

نفس در دامن دل پاشکتہ نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ
اس کا سانس دل کے دامن میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہا، نگاہ مارے شرم
کے آنکھ سے باہر نہیں نکلتی۔

”نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ“ میں اشارہ ”دلہن“ کی شرم و حیا و حجاب
کی طرف ہے، نگاہ نے شرم کے ساتھ عقد باندھا پردہ نشین ہو گئی، ”جباب“
کی صورت آنکھ کی ہے مگر نگاہ پردہ مڑگاں سے باہر نہیں آتی۔
اگر چشم است بر غیرش نظر نیست و گر پا از خودش بیروں سفر نیست

بیدل

آنکھ ہے تو غیر پر نظر نہیں پڑتی پاؤں میں تو اپنے وجود سے باہر نہیں نکلتے۔
چوسا غریب بادشاہ عالم آب کلاہ آرائی ناز از وضع آداب
جباب ساغر کی طرح ”عالم آب“ کا بادشاہ ہے۔ بحریا دریا عالم آب
ہے، ”عالم آب“ میخانہ کو بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے جباب ساغر
ہے جس سے اس کی صورت ملتی جلتی ہے، اور بادشاہی کی مناسبت سے کلاہ
یا تاج کی شکل بھی ہے۔

جیسا چوں چشم حصن آبتیش خموشی ہم چو لب نقش نگینش
”حصن“ کے معنی قلعہ جس میں بیٹھ کر بیرونی حملے سے محفوظ ہو جاتے ہیں،
جیا کی جگہ آنکھ ہے، مگر جباب کی آنکھ ایک آہنی قلعہ ہے یہ قلعہ بھی سر بہر
ہے۔ جباب کی صورت دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہر ہے، ”مہر“ سے تخیل
”مہر بر لب“ کی طرف منتقل ہوا جو خموشی کے ہم معنی ہے، جس شے پر مہر لگا
دی جائے وہ بند ہو جاتی ہے، لب پر مہر لگنا محاورہ ہے۔ یعنی خاموش ہے۔
مطلب یہ ہے کہ جباب میں دونوں باتیں مشابہہ ہوتی ہیں ایک ”جیا“ اور
دوسری ”خاموشی“۔ جیا کا تقاضا بھی خاموشی ہے جیا کا تعلق آنکھ سے اور خاموشی
کالبوں سے۔ دونوں سر بہر ہیں۔

چوا و نتواں صفائی سینہ دادن نفس را صیقل آئینہ دادن
جباب کی طرح کسی کا کیا دل و گردہ ہے کہ سینہ صاف ہو، سانس سینہ سے
نکلتا ہے جب سینہ صاف ہو تو سانس بھی لطافت میں صاف ہوتا چاہئے۔
مگر اگر آئینہ پر سانس پھونکا جائے تو وہ مکدر ہو جاتا ہے۔ لیکن جباب کی کیفیت
ہی مختلف ہے، کہ یہی سانس اس کے آئینہ سینہ کو صاف کر رہا ہے گویا
صیقل کا کام دے رہا ہے اور کدورت رفع کر رہا ہے۔

نہفتہ از نفس آن سر بسر چشم پری در شیشہ چوں نظارہ در چشم
جباب کی صورت سر بسر آنکھ کی ہے مگر ہوا بھی ہے جو اس نے باندھ

رکھی ہے، آنکھ کا کام نظارہ ہے۔ نگاہ پرواز کرتی ہے تو کسی منظر پر پڑتی ہے اور یہ منظر حسین پری رو ہے، ان مختلف خیالات کو اس شعر میں ربط دیا گیا ہے کہ جناب دم بخود ہے سرسبز آنکھ کی صورت ہے مگر جس طرح نظارہ آنکھ میں سمایا ہوتا ہے اسی طرح اس نے شیشہ میں پری اتار رکھی ہے، آنکھ میں بھی شیشہ ہے اور اسی شیشہ پر بیرونی دنیا کا عکس پڑتا ہے تو ہم اسی عکس کو دیکھتے ہیں جسے بیرونی اشیاء کی صورتوں سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح جناب میں ہوا شیشہ کا کام دے رہی ہے، جس میں جہان رنگ خارجی کا عکس پڑتا ہے جسے ”نظارہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے، اگر مسئلہ تجد و امثال سمجھ لیا ہے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ نظارہ پری ہے مگر جناب نے اسے شیشہ میں بند کر رکھا ہے۔ یعنی جناب کے آئینہ میں بیرونی دنیا کا عکس ہے۔

نفس در آئینہ دزدیدہ ز اں رنگ
کہ اشکش سوخت آتش در داچ سنگ

بیدل کے تخیل کی لطافت اور بلندی کو کون پہنچ سکتا ہے، ہر ایک شعر کی شرح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایک کیفیت ہے جو ذہن میں آتی ہے، نثر میں ادا نہیں ہو سکتی۔ اور شعر کی خوبی ہی یہ ہے کہ نثر میں ادا نہ ہو سکے، اس شعر میں وہی ہوا یا سانس کا تخیل ہے، کتنی تشبیہات ہیں جن کے پیرایہ میں اس نے اس خیال کو واضح کیا ہے، آئینہ خود پتھر ہے، اور پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ لیکن جب پتھر آئینہ کی صورت اختیار کرتا ہے تو یہ آگ جل کر آب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، علم کیمیا کے عالم جانتے ہیں کہ پانی کے دو اجزاء دو ہوائیں ہیں ایک ہوا خود آگ ہے اور دوسری آگ کی معاون و مدد ہے، جب دونوں ایک خاص تناسب سے ملتی ہیں تو آگ کی ضد پانی بن جاتا ہے، اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ فطرت کی صفت عجیب ہے، یہی مطلب اس شعر کل ہے کہ آئینہ میں ہوا اس وضع سے دم بخود ہے کہ اس کے آنسو

بیدل

پتھر کے دل کی حرارت ٹھنڈا کر رہے ہیں۔

چراغش در کمین پاس ناموس نفس وز دیدہ ترا ز وضع فانوس
ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے لیکن یہی آگ جب چراغ کی روشنی میں ہو تو ہوا کے
جھونکے اسے بجھا دیتے ہیں، جناب کی صورت چراغ کی ہے، اور اس میں ہوا بھی
ہے گویا چراغ رہ گذر باد پر ہے اور بجھ جائے گا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے جو
جناب کی زندگی کو لاحق ہے اس نے دم سادھ لیا ہے۔ چراغ پر فانوس بھی ہوتا
ہے، جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ چراغ کو بیرونی ہوا کے حملہ سے بچائے، لیکن جناب
کے اندر تو خود ہوا ہے اور فانوس باہر ہوتا ہے اور باہر کی ہوا کے لئے روک تھام
کا کام دیتا ہے۔ اس لئے جناب نے اس خطرہ کا سد باب اس طرح کیا کہ ہوا
باندھ رکھی ہے۔

سُبک روحی و کار امتیازش تہی از خود شدن سامان سازش
سبکی جسے ہم محاورہ میں ہلکا پن کہتے ہیں ”وقار“ کی نفی ہے۔ اور جو ہاتھ
خالی ہو یا جس کے گھر میں آٹو بولتا ہو وہاں اسباب و سامان مفقود ہوتا ہے،
یہ اضداد ہیں جو بیدار نے ان تمام ابیات میں جو ہم لکھ چکے ہیں جمع کر دئے ہیں۔
سبکی سے وقار اور تہی دستی سے ساز و سامان کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ جناب میں
سائنس یا روح ہے، ”روح“ اور ”راح“ اور ”ریح“ ایک ہی لفظ ہے، جس کا
ترجمہ ہوا ہے، یہ روح کتنی سُبک یا لطیف ہے کہ جناب کی امتیازی خوبی بھی
اسی کی لطافت میں ہے، ”تہی از خود شدن“ کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں غیر کی
گنجائش کا کیا سوال ہے جبکہ وہ آپ ہی اپنے آپ سے خالی ہے، بیدل نے خودی
اور بخودی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔
مناسب مقام پر چند اشعار کا حوالہ دیا جائے گا۔ جناب کا ساز و سامان ہی
”تہی از خود شدن“ ہے۔

چناں بر آب دارد سیر تمکین کہ گوئی بیضہ مرغابست ایں

مرغابی یعنی بطخ وغیرہ پانی کے جانور ہیں اور خشکی پر رہتے ہیں، پانی میں غوطے بھی لگاتے ہیں مگر ان کے پروں کا دامن تر نہیں ہوتا، اسی طرح جناب پانی پر تمکنت کے ساتھ سیر کر رہا ہے، گویا مرغابی کا انڈا ہے۔

بہر آب از سبک ساری رواں است
تہی چوں گشت کشتی بادباں است

ہر ایک پانی پر خواہ دریا کا ہو یا بحر کا، بے تکلف پیر رہا ہے، جب اپنے آپ سے خالی ہوا تو یہی کشتی بادبان کا کام دے رہی ہے، بادباں میں ہوا بھرتی ہے تو کشتی ہوا کے زور سے تیز رو ہو جاتی ہے۔ چونکہ جناب ”از خود تہی“ ہے اس لئے یہ تو ہونی کشتی کی صورت ہوا جو اس کے اندر ہے بادباں کا کام دیتی غرض جناب کشتی بھی ہے اور بادباں بھی، اس لئے اس کی روانی کے اسباب اس کے اندر ہی موجود ہیں، غیر کا محتاج نہیں۔

باں رنگش نزاکت نقش بستہ است

اگر چشمے بہم مالد شکستہ است

اس کی نزاکت کا یہ عالم ہے، نزاکت نے یہ رنگ باندھا ہوا ہے کہ اگر آنکھ ملے تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے، فارسی میں رنگ بستن اور شکستن محاورہ ہے۔ ہم محاورہ میں رنگ جمانا اور رنگ اڑنا کہتے ہیں، نزاکت نے اپنا رنگ اس وضع سے جمار کھا ہے کہ اگر ذرا آنکھ ملے تو اڑ جائے یعنی جناب کا وجود ہی فنا ہو جائے، جناب کی صورت آنکھ کی ہے لیکن یہ تب تک ہی زندہ ہے جب تک چشم بستہ ہے، ذرا آنکھ کھلی اور یہ کہیں کا نہ رہا۔

نگاہ از ناز کی نکشودہ مرگاں قدم از عاجزی نشکستہ داماں

نگاہ نزاکت کی وجہ سے مرگاں اٹھا نہیں سکتی اور قدم ضعیف کی وجہ سے

اٹھ نہیں سکتا۔

ہوا صہبا یا غے دل شکستہ نفس روغن چراغے شعلہ جستہ

بیدل

بفانوس نفس می سوزد و بس خیلے محض می افروزد و بس
 اس نیم نفس نے جو ہوا باندھ رکھی ہے اس میں ایک نشہ ہے، خود ٹوٹے
 ہوئے پیالہ کی شکل ہے جس سے مستی ٹپکتی ہے، اس کا سانس یا یہ ہوا جو سراپا
 ہے چراغ میں تیل کا کام دیتی ہے، یہ خود چراغ کی صورت ہے مگر ”شعلہ حبسہ“ ہے،
 چراغ میں تیل ہوتا ہے اور وہی جلتا ہے، اس سے شعلہ نکلتا ہے، یہ سب کچھ حجاب
 ہی ہے، یہ سامان نور و نار بھی اسی میں ہیں، اس کے فانوس میں اسی کا سانس
 جل رہا ہے اور محض خیال کی صورت نمایاں ہو رہی ہے، اس شعر میں ”سورہ
 نور“ کی ابتدائی آیات کی طرف اشارہ ہے، کہ چراغ ہے اس میں روغن زیتون
 ہے اور اتنا صاف ہے کہ اس میں صلاحیت ہے کہ بغیر آگ دے خود بخود
 بھڑک اٹھے۔

چو صبحش در قفس غیر از نفس نیست

ولے تلخ پرزند ساز قفس نیست

صبح کو بھی نفس ہی کہا گیا ہے۔ صبح کی طرح اس کے قفس میں سانس
 کے سوا اور کچھ نہیں ہے، گویا یہ ایک پرند ہے جو پنجرہ میں بند ہے، اگر کھڑکھڑکا
 تو پنجرہ ندارد، پانی کا بلبلہ ایک قطرہ آب میں ہولے سوا اور کچھ نہیں اگر یہ
 ہوا نکل جائے تو بلبلہ ختم ہو گیا۔

معنائے چین عالم ندارد کہ تابش گشت نامے ہم ندارد
 تمام دنیا جہان میں حجاب ایک معما ہے، اسے حل کرو تو اس کا نام و
 نشان مٹ جائے گا۔

بیدل نے ابرو و شفق و حجاب و غیرہم پر جو کچھ لکھا ہے اس کا شاعرانہ تخیل
 بلاشبہ بہت بلند ہے لیکن وہ اس سے کچھ اخلاقی نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، چنانچہ
 ”حجاب“ پر اتنا لکھ کر کہتا ہے کہ

میرس از من تماشا شائے جابم کہ من ہم گر بخود اندیشم آہم

طور معرفت

۲۰۹

یہ مشاہدہ جو جناب کا میں نے کیا ہے اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا ہے کہ
میں تو جناب کی طرح نقش بر آب ہوں، میری بھی اصل اور زندگی یہی آب
ہے۔ (کل شیء حی من الماء)

شبے کز گریہ طوفاں کا ریم بود جناب آئینہ دلداریم بود
ایک رات، جب میرا گریہ طوفاں برپا کر رہا تھا جناب میں مجھے دبحوئی
کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

نفس در پردہ دل آہ می بخت
نگاہ از چشم حیراں نالہ می ریخت
دل کے پردہ میں نفس آہ بھر رہا تھا؛ نگاہ چشم حیرت زدہ سے نالہ و فغاں
کر رہی تھی۔

تار نظر اور نالہ ایک ہی روش پر چلتے ہیں، یہ گریہ و زاری جناب میں بھی
مشاہدہ ہوتی ہے، اب جناب زبان حال سے کچھ کہہ رہا ہے۔

کہ اے غافل تو خود ہم چشم مائی
ز وضع بیدلی بیدل چرائی
کہ اے بے خبر تو خود میرا ہم چشم ہے، تیری وضع بیدلی میری وضع "تہی
از خود شدن" ہے، تو دل شکستہ اور یاس کیوں ہے۔

طرب با کن گرت اشکے و آہیست

سرے بے مودریں عالم کلاہیست

خوش رہ، خوشی منا اگر اشک اور آہ کا ساز و سامان تیرے پاس ہے

جو لازمہ عشق ہے تو اس عالم میں جو "سرے بے مو" ہے وہ تاج ہے۔ سرے بے مو "وہ

سر جس پر بال نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

کے کشد بار کلاہمندی را سرے ما

ہست موئے سرا بر سرا افسر ما

بیدل

کلاہ نمدی کا بوجھ میرا سر برداشت نہیں کر سکتا، میرے اپنے سر کے بال میرے سر پر کلاہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ ان بالوں کا بوجھ بھی ناقابل برداشت ہے، قلندر کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ ”سربے مو“ بھی تو کلاہ کی صورت ہے۔
 مثنوی طور معرفت چھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ہم نے چند اشعار پیش کئے ہیں وہ بھی جستہ جستہ، مثنوی کے آخر میں ارشاد تفسیر ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ کی ہے۔

بیائے بیدل بے حاصل خویش بخود پیچیدہ اما غافل از خویش
 اسے بیدل تو کتنا اپنی حقیقت سے بے خبر ہے اگرچہ تو اپنی ذات سے اُلجھا ہوا ہے مگر اپنی خودی سے غافل ہے۔

حق از ساز تو پیدا و تو باطل
 دل از حبیب تو در جوش و تو بیدل

حق تیرے ہی ساز ہستی سے نغمہ سرا ہے اور تو اسے باطل سمجھ رہا ہے دل تیرے ہی پہلو میں ترپ رہا ہے اور تو بیدل ہے۔

بصد دل چوں صنوبر بیدلی چند سراپا حاصلی بے حاصلی چند
 صنوبر کی طرح سینکڑوں دل تیرے پہلو میں ہیں تو کب تک بیدل رہیگا۔
 تو سراپا حاصل ہے، خود مقصد ہے، کب تک بے حاصلی کا شکوہ کرتا رہیگا۔
 بوہمت صرف شد عمر گرامی تمامت کرد آخر۔ نا تمامی
 تو بہات میں تیری عمر گراں مایہ صرف ہو گئی، آخر نا تمامی نے تجھے ختم کر کے رکھ دیا۔

نہ گردت زیب دامان ہوا شد نہ رنگت با شکستے آشنا شد
 تیرے غبار ہستی نے ہوا کے دامن پر کچھ زیبائش پیدا نہیں کی نہ تیرے رنگ نے شوخی کا اظہار کھل کر کیا آدم خاکی ہے اور ہوا دھوس کا پتلا، اس میں بھی اس نے کوئی شان پیدا نہیں کی، رنگ کی شوخی اس کے کھلنے پر ظاہر ہوتی ہے

نہ داغ سرکشید از لالہ زارت
 نہ خونے ریخت رنگ نو بہارت
 تیرے لالہ زار سے کوئی داغ نہ ابھرا، اور یہی لالہ کے حسن کو دوبالا کرتا ہے
 اور نہ تیرے لہونے نو بہار کا رنگ پیدا کیا۔

اگر حسنی بدہ عرض جمالے وگر آئینہ بنما مثالے
 اگر تو حسن ہے تو جمال میں جلوہ نما ہو تو کوئی حسین صورت دکھا۔
 حسن آئینہ میں حسین صورت ہی دکھاتا ہے۔

بہر دامن چو گرد و آو یختن چند بہر رنگے چو آب آیمختن چند
 گرد و غبار کی طرح ہر ایک کے دامن کو آلودہ کرنا یا اس سے وابستہ
 رہنا کب تک، ہر ایک رنگ میں پانی کی طرح ملنا کب تک۔ اگر کسی کا دامن
 پکڑیں تو محاورہ میں اس کی دستگیری قبول کرنا ہے، یا توصل یا وسیلہ کے
 معنی ہیں، رنگ پانی ہی میں حل ہوتا ہے۔

اگر گردی بد اماں خود آویز وگر آبی برومی خوشتن ریز
 اگر تو گرد ہے تو اپنے ہی دامن سے وابستہ رہ اور اگر پانی ہے تو اسے اپنی
 آبرو بنا۔

فراموشی نیاز این د آں کن بخود پرداز و کار صد جہاں کن
 جو بھی تیرا غیر ہے، یہ ہو یا وہ بھول جا، خود شناس ہو اور سو دنیا جہاں کا
 کام سہرا انجام دے۔

شوی تا از نماز عشق محرم و غموی کن بخوں ہر دو عالم
 نماز کے لئے اول وضو شرط ہے، نماز عشق کا وضو دو عالم کے لہو سے ہوتا
 ہے، یعنی دو عالم مقصد بالذات نہیں، اس کثرت کی نفی اثبات وحدت ہے،
 تو نماز عشق سے واقف اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب دو عالم سے ہاتھ دھو کر
 یک سو ہو۔

بیدل

ز نقش غیر اگر آگاہیت نیست براہِ کفر ہم گمراہیت نیست
اگر غیر کا نقش یا تصور تیرے دل میں نہیں تو کفر کے راستہ پر چل کر بھی تو
گمراہ نہ ہو گا۔

اگر آلودہ احرامِ غیرِ ہمہ گر کعبہ باشی تنگ دیری
اگر تو نے غیر کا احرام باندھا ہوا ہے تو خواہ تو سر تاپا کعبہ بھی ہو بیت خانہ
بھی تجھ سے عار کرے گا۔

جہاں یک برق تازی نگاہست
تو گر پوشی نظر عالم سیاہست
یہ عالم یہ کائنات کیا ہے تیری اک نگاہ کی جولانی، ایک ہی نگاہ برق تاز
تمام جہان کو تیرے آغوشِ مژگاں کے احاطہ میں لے آتی ہے۔ اگر تو بند کرے تو
تمام عالم تاریک ہے، معلوم ہوا کہ یہ تیری برقِ نظر کا نور ہے جس سے یہ عالم منور
ہے۔ تو نظر بٹالے تو یہ سیاہ ہے۔

اگر نظارہ غیر است در پیش بسوز و داغ شود رآتش خویش
اگر غیر کا نظارہ تیری نگاہ کے سامنے ہے تو اپنی ہی آگ میں جل بھن کر
داغ ہوتا رہ۔

کہ نزد آگہی افروختہ است سزائی کارِ غفلت سوختہ است
عقل و شعور کے نزدیک تو چمکنا دلمنا پسندیدہ ہے مگر غفلت کے کاموں
کی سزا جلنا، پشیمان ہونا ہے۔

بہ عین قرب محرومِ حضوری
بجو خود را کہ از خود سخت دوری

تو عین قرب میں ہوتے ہوئے حضوری سے محروم ہے اپنے آپ کو ڈھونڈ
خود شناس ہو تو اپنے آپ سے بہت دور ہے، حالانکہ فی نفس الامر تو اپنی خودی
کے نزدیک تر ہے اس قرب کے ہوتے محروم ہے۔

طور معرفت

بہاں از جستجوئے خویش نوید
ہمیں نور است رہبر تا بخورشید
تو اپنی خودی کی تلاش میں لگا رہ، مایوس نہ ہو، تیری خودی اسی سولج
کی ایک کرن ہے جو نور کا سرچشمہ ہے، یہی تیری رہنمائی اس چشمہ نور تک
کرے گی۔

بکنہ خویش تا نتواں رسیدن جمال حق چہ امکانست دیدن
جب تک تو اپنی کنہ اپنی ہی حقیقت سے واقف نہ ہوگا۔ یہ کب ممکن ہے
کہ تو جمال حق کے دیدار سے مشرف ہو۔
حکیم سنائی ”حدیقہ“ میں کہتا ہے کہ
آنکہ در نفس خوزبوں باشد عارف کردگار چوں باشد
جسے اپنے ہی نفس کی معرفت نہیں وہ اپنے رب کی معرفت کیسے حاصل
کر سکتا ہے۔

خواجہ حافظ کا ارشاد بھی یہی کچھ ہے، بیدل کہتا ہے۔
دراں وادی کہ طالب نیست معلوم
طلب با جملہ موہوم امت موہوم
طالب اور مطلوب میں رابطہ طلب کا ہے۔ جب طالب ہی وادی تحقیق
میں نامعلوم ہو تو ظاہر ہے کہ طلب ایک امر موہوم ہے۔

وگرا سرار خود فہمیدہ باشی یقین نقش ذاتی دیدہ باشی
امر موہوم اور شے ہے جس سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اگر تو
”اسرار خودی“ کو سمجھ گیلے تو یقیناً تجھے نقش ذات کا مشاہدہ بھی ہوگا۔
نخست از رہ غبار خویش بردار وگرا منزل حق سر بیرون آر
اس جادۂ تحقیق خودی کو ضرور ہے کہ گرد و غبار سے صاف کر اور یہ تیرے
توہمات ہیں جو دیدہ مشاہدہ میں اڑاڑ کر خاک دھول ڈال رہے ہیں۔

جب یہ راستہ گرد و غبار سے صاف ہو جائے گا تو منزل حق بھی صاف صاف دکھائی دے گی اور تو وہاں پہنچ جائے گا۔ اوّل تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ توئی سر منزل تحقیق و عظام تنگ و پویٰ کہ ہم درتست مدغم منزل اور یہ عالم کیا ہے تو خود ہے۔ تیری خودی ہے۔ اور منزل تک دوڑ دھوپ بھی تو ہی کر رہا ہے جو تیرے وجود کا خاصہ ہے، تیرے ہی وجود کا جزو ہے۔

زمنزل تا نخواہی سر کشیدن دریں صحرا محال است آرمیدن
جب تک تو منزل پر نہیں پہنچتا تو ناممکن ہے کہ تو دشت ہستی میں ایک دم آرام سے بیٹھ سکے۔

یکے منزل دوئی را ہست ایں جا بفہم ہر کہ آگاہست ایں جا
منزل تو ایک ہی ہے مگر راستے اس کی طرف کثرت سے جاتے ہیں اس راز کو حق آگاہ حضرات ہی سمجھتے ہیں۔

زمین تا آسماں گامے ندارد رہ منزل بجز نامے ندارد
حقیقت یہ ہے کہ زمین تا آسماں ایک نگاہ کے ایک قدم کا فاصلہ بھی نہیں۔ اس لئے راستہ خواہ کوئی ہو ایک نام ہی نام ہے ورنہ موجود نہیں۔ جو کچھ ہے منزل وحدت ہی ہے۔

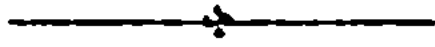
دوئی تا بست مشکل بایست رفت کہ ہر گامے دو منزل بایست رفت
جب تک دوئی یا کثرت کا تصور ذہن میں ہے تو یہ منزل نہیں بلکہ راستہ ہی راستہ ہے اور کبھی طے نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر ایک قدم دو منزلوں کی طرف اٹھے گا، اور کسی منزل تک رسائی نہ ہوگی۔

ز نام خضر تا آگاہ باشی ہمہ گر منزلی در راہ باشی
خضر کا کام تو راستہ پر رہنمائی کرنا ہے اور جب تک منزل پر نہ پہنچ جائیں خضر رہبر ہے۔ اس لئے جب تک تیرے ذہن میں خضر کا تصور ہے خواہ

تو سرتاپا منزل ہی کیوں نہ ہو، ابھی راہ میں ہے۔

نہ بندی تا بفہم خویش احرام طہید نہاست برق نبض آرام
خضر بہر حال تیرا غیر ہے، تیری خودی ہی تیرا خضر اور رہتا ہے جب تک
خود شناسی کا احرام نہ باندھے گا، یہ سمجھ کہ کعبہ مقصود کاج نصیب نہ ہوگا۔
یہ نبض مضطرب ہی رہے گی حالانکہ تجھے منزل پر اطمینان قلب حاصل ہونا
چاہئے۔

تسلی در ہمیں آرام گاہ است زمزل آنچہ بیرونست راہ است
ظاہر ہے کہ منزل سے باہر جو کچھ بھی ہے راہ ہی ہے اور راہ پر دوڑ دھوپ
ہی ہے آرام اور اطمینان تو منزل پر ہی میسر ہو سکتا ہے۔



رباعیات

رباعیات کی تعداد بھی ہزاروں ہے۔ چند رباعیات ہم بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، چند ایک ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

بیدل نخوری عشوہ اوہام ملا آفاق پر است یک از جنس خلا
جز وحدت صرف نیست در غیب شہو الا لفظ دارد و باقی لا

یہ عالم کثرت ہے، اور حطی مشاہدہ سے کثرت ہی محسوس ہوتی ہے یہ فریب نظر ہے، اسے اصطلاح میں ”مشاہدہ حسی“ کہتے ہیں، حقیقت ”وحدت صرف“ ہے خواہ ظاہر ہو یا باطن، لفظ ”الا“ میں الف تو حقیقت ہے باقی ”لا“ ہے، الف تو ثابت شدہ حقیقت ہے ”لا“ حرف نفی ہے۔ باقی ہیج۔

انساں کہ نمودش آگہی عقی را در بیچ مکان کرم نخواہد خارا
شیطان چہ کس است اندکے فہم کنید آن کس کہ شناخت ملک خود دنیارا

دنیا تو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، عقی کا تصور شعور عقلی سے ذہن میں پیدا ہوا، دنیا ہو یا عقی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو کچھ ہے رحمت کی مناسبت سے خوب ہی ہے، اس رحم و کرم کا تقاضا یہی ہے کہ کسی زمان و مکان میں کچھ بھی ایسی بات نہ ہو جو اس کے نامناسب ہے، اس لئے شیطان کا وجود جو ہمیں اس رحم و کرم سے دور رکھنا چاہتا ہے ایسے شخص کا ہی ہے جو دنیا کو اپنی

ذاتی ملکیت خیال کرتا ہے۔ شیطان اور شیطانی اعمال کا نتیجہ فتنہ و فساد اور عذاب دنیوی اور اخروی ہے۔ جو فرعون اس دنیا کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس میں تصرف بھی اسی عقیدہ کے تحت کرتا ہے وہ ہمیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے، اور خود را ندۂ درگاہ الہی ہے۔

ہر گاہ کہ غنچہ گشت و نشگفت جباب رمز حق و خلق پیچ نہ نہفت جباب
لیکن نہ شنید موج سرگشتہ ما آں حرف کہ پوست کندہ گفت جباب

جب تک جباب غنچہ کی صورت ہے اور پھول کی طرح کھلا ہوا نہیں اس کی ہستی بجائے۔ حق و خلق کی رمز بیان کر رہا ہے اور کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھتا، لیکن ہماری موج سرگشتہ یہ حالات گوش ہوش سے نہیں سنتی جو جباب پوست کندہ بیان کر رہا ہے، محاورہ میں کہتے ہیں پوست کندہ حالات بیان کرنا، جب تک کسی شے پر پوست ہے وہ مجھوب ہے، جب یہ جباب اٹھا دیا جائے تو اس شے کے اندرونی حالات منکشف ہوتے ہیں، جباب کی بیرونی جلد پھٹ جاتی ہے تو جو کچھ اس کے اندر ہے ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ صرف ہوا ہے، جب تک اس پوست کے ساتھ ہے وہ جباب سے موسوم ہوتا ہے جب پوست اتر گیا تو جباب نہ رہا اپنے اصل پانی میں محو ہو گیا۔ یہی کیفیت خلق کی ہے، حق کا اظہار تو اس وقت ہوتا ہے جب یہ سانس یا ہوا جو ہستی موسوم نے باندھ رکھی ہے مفقود ہو جائے ہر ایک شے تعینات میں محدود ہے، جب ان تعینات کی حد توڑ دی جائے تو اصل شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ہر ایک شے جو معین اور مشخص ہے محدود اور مخلوق ہے۔

آں حسن کہ آئینہ امکاں پرداخت ہر ذرہ بصد ہزار خورشید نواخت
بایں ہمہ جلوہ نور در پردہ غیب تا انساں گل نکر و خود را نشاغت
وہ محسن ازلی جب آئینہ امکان میں منعکس ہوا ہر ایک ذرہ کو لاکھ سورج کا نور عطا کیا۔ باوجود اس کے کہ ذرہ ذرہ نور ہے مگر پردہ غیب سے جب تک

بیدل

انسان کا ظہور نہ ہوا اس حسن نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ یعنی اسم و صفات الہیہ کا ظہور تو ہستی کے ہر ایک طبقہ اور ہر طبقہ کے ذرہ ذرہ میں ہے مگر علم و شعور مرتبہ انسان ہی میں ظاہر ہوا۔ یہ کہنا چاہئے کہ ماسوائے انسان جو بھی ہے اس میں علم معرفت کا اظہار نہیں ہوتا۔

گر طبع سلیم قابلِ تفہیم است انسانست آنکہ مصدر تعظیم است
 ایں کعبہ کہ مرکز سجود من و تست تمثال حضور دل ابراہیم است
 اگر تجھے طبع سلیم عطا ہوئی ہے اور تجھ میں فہم و تفہیم کی صلاحیت ہے تو سمجھ لے کہ یہ انسان ہے جو مصدر تعظیم ہے، جس سے تعظیم کا ظہور ہوتا ہے، یہ کعبہ جو میرے اور تیرے سجدہ کا مرکز ہے، کیا ہے حضرت ابراہیم کے دل کا تصوّر ہے۔

تحقیق کہ فہم آں بحیرت دال است بے پردہ بانداز مقامِ مال است
 شکلے کہ بخاک سایہ مینخوان در آب نظر کنی تمثال است

یہ رباعی بہت بلند پایہ ہے بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ

ہر کس میں جا آرز مقام و حال خود گوید خبر
 از زبانم صرف او گر بشنوی باور ممکن

ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حدِ نظر ہے، وہ جو کچھ ذات باری کی نسبت بیان کرتا ہے وہ اپنے ہی حال اور مقام کی خبر دے رہا ہے۔ اگر وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی اور ایسی ہے تو باور نہ کر، وہ برتر از خیال و قیاس و فہم ہے، البتہ جتنا کسی کا فہم بلند اور بلند تر ہے اور جو کچھ وہ ذات باری کی نسبت کہتا ہے اپنے ہی قرب کا مقام بتا رہا ہے۔ عارف کامل وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ :-

ما عرفناک حق معرفتک

اس رباعی میں ہر ایک شخص کی حدِ نظر کو ایک مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ خاک پر ہم کسی شے کا سایہ اور پانی میں اسی شے کے عکس کو مثال

کہتے ہیں۔ تمثال نسبتاً زیادہ صاف اور واضح ہے، اسی طرح جتنا کسی شخص کا ذہن بلند ہوگا اتنی ہی حقیقت زیادہ صفائی سے منکشف ہوگی، مگر یہ سایہ اور تمثال ہی ہے ذات خاک اور پانی سے باہر ہے اور وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔

آئینہ خلق طرفہ جو ہر دارد صورت دگر است عرض دیگر دارد
می گویند و حق است ما باطل محض از باطل حرف حق کہ باور دارد
لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ آئینہ میں صرف صورت ہی نظر آتی ہے اور یہ موهوم ہے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے سب ”مایا“ ہے پیچ ہے، فریب نظر ہے البتہ ایک اور ہستی حق ہے۔ اگر یہ خود باطل ہیں تو ان کا قول بھی باطل ہے، حقیقت یہ ہے کہ کائنات باطل نہیں (ربنا ما خلقت هذا باطلا)

ہر کس امرار عدل رحماں فہمید آنسوئی تخیلات اعیان فہمید
خود محتسب نیک بد خویش تنیم حق را قاضی جمال نتوان فہمید
سورہ الرحمن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ ارض و سموات کو رحمن نے خلق فرمایا تو اس میں میزان عدل رکھ دی، جس سے تجاوز کوئی شے نہیں کرتی، یہ عدل جس سے نظم و نظام عالم قائم ہے ان تصورات کے دوسری طرف ہے جو اشیاء کا ہمارے ذہن میں ہے، یہ عدل انسان قائم نہیں رکھ سکتا البتہ ”قسط“ سے کام لے سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو کچھ علم ہمیں اپنی نسبت ہے وہ کسی اور کو ہماری نسبت ویسا ہی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے اپنے اعمال نیک و بد کا احتساب جیسا ہم خود کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ قاضی جمال اکبر شاہی عہد کی مشہور شخصیت ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ اسی صورت میں عدل و انصاف سے کر سکتا ہے جب اس پر حق کا حقہ منکشف ہو اور یہ ممکن نہیں، ”حق“ کا قیاس اپنے ذہنی تصورات پر نہ کرنا چاہئے، حق ان سے

ماورئی ہے۔

آن دم کہ حقیقت قدم پیدا شد دانی چہ گو نہ کیف و کم پیدا شد
 مارا او دید ہستی آمد بوجود خودا دیدیم ما، عدم پیدا شد
 حقیقت وحدت ہے، جب اس کا ظہور ہوا، یعنی اس کا انکشاف ہم پر ہوا تو
 ”کیف و کم“ کا سوال بھی پیدا ہوا، یعنی چہ و چند و چوں میں ہم اُلجھ گئے، اس نے ہماری
 طرف دیکھا تو ہستی کا ظہور ہوا، ہم نے اپنے آپ کو دیکھا تو عدم پیدا ہوا۔ ہستی اور عدم
 دو متضامور ہیں۔ اگر ہم باحق ہیں تو موجود ہیں اور جب اس سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو
 دیکھیں تو عدم ہیں حقیقت قدیم ہے۔ حادث مخلوق ہے، نگاہ حقیقت میں تو ہستی موجود
 ہے، ہماری نگاہ میں عدم ہے۔ (لہٰذا یکن شئی ہذا کورا) اسی کے ہم معنی یہ رباعی ہے۔

امروز کہ بر خویش نظر وا کر دیم

ایجاد خیال دی و فردا کر دیم

یعنی پیش از وجود بودیم و تدیم

موجود شدیم و عدم انشا کر دیم

غالب مرحوم نے بھی اچھا کہا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

عقل آمد طومار دلائل واکرد جمعیت نسخہ یقین اجزا کرد

آرائش لفظ رنگ معنی گردند گلچینی با بہار را رسوا کرد

عقلاً کسی شے کا فہم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا تجزیہ نہ کیا جائے، اور چہ

چند و چوں یعنی عقلی استدلال سے ثابت نہ کیا جائے حقیقت تو بالبداہت ثابت

شدہ ہے، جس طرح الفاظ کی رنگینی سے معنی رنگ آلودہ ہو جاتے ہیں، اور ذہن

معنی کی طرف نہیں بلکہ لفظوں کے حسن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح عقل

فسوں سازنے دلائل کی طرف متوجہ کر دیا۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید
راستی رفت کہ ممنوں عصایم کردند

”یقین“ تو عینی شہادت سے حاصل ہوتا ہے، دلائل کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب حقیقت پوشیدہ ہو، قاضی جمال کے قیاسات سے توحق کا اظہار نہیں ہو سکتا، بہار تو گل فروش ہے، مشاہدہ کرو تو بہار کی رنگینی ان ہی میں نظر آئے گی، اگر گل چینی کرو گے تو بہار کا مشاہدہ ختم ہو جائے گا۔ گل چینی لفظی آرائش استدلال عقلیہ کی طرح ہے جب تک جمعیت ہے یقین بھی ہے، جب اس کا شیرازہ بکھرا تو پھر دلائل سے جمعیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تقلید زہرچہ رنگ می گرداند جابر صد طبع بنگ می گرداند
غلطیدن یک سنگ ازین کوہ بلند پہلوی ہزار سنگ می گرداند
پہاڑی کی بلندی سے اگر ایک پتھر زنی لڑھکتا ہوا نیچے کی طرف آئے تو راستہ میں جو بھی پتھر پڑے وہ بھی اس کے ساتھ لڑھکتا ہوا نیچے آ رہے گا، یہی کیفیت تقلید کی ہے، اگر ہم کسی شخص کا اتباع کریں اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ہم اس کا بھی اتباع کریں گے۔

کفر گیرد کاٹے ملت شود علتے رالتے علت شود
اس لئے ”ترک تقلید گیر تحقیق ایں است“، تحقیق بلندی کی طرف لے جاتی ہے، اور تقلید گڑھے میں گراتی ہے۔

ہر سانحہ کہ شد با فنانہ دلیل بیکاری خلق شہر تش راست کفیل
موسلی تا حال می شگافند دریا فرعون ہنوز می خورد غوطہ بہ نیل
کوئی واقعہ جس میں افسانوی پہلو نکلتا ہو۔ بیکار لوگ اس کی شہرت کے خود کفیل بن جاتے ہیں اور اس کا ڈھنڈورا ایسا پیٹا جاتا ہے کہ بار بار اسی کا تکرار ہوتا ہے، یہ سمجھو کہ موسلی ابھی ابھی دریا کو عصا سے پھاڑ کر جا رہے ہیں اور فرعون ابھی تک نیل میں غوطے کھا رہا ہے۔

بیدل

عالیٰ را سرگزشت رفتگاں از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست

فردوس بالاتفاق ارباب علوم آنسوی ثواب برد جست و نجوم
یعنی سعد و نحس تادر نظر است عیشت نامکن است و راحت معلوم

تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ بہشت آسمان کے باہر دوسری طرف ہے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ سعد اور فلاں نحس ہے اور اس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے، ہم تو اسی کرۂ ارض پر انہی کو دیکھ رہے ہیں اس لئے عیش نامکن اور راحت مفقود ہے، وہ تو بہشت میں ممکن ہے، ستاروں اور سیاروں اور بروج میں ان کا داخلہ اور خروج ہی کا فرق ہے اور اثر انداز ہو رہا ہے تو عیش و آرام نہ دار۔

ہر چند جہاں بے قیاس علیم یکسر بے بہرہ مساس علیم
زیں سمع و بصر فریب آتش نہ خوری عالم دگر نیست مالباس علیم
شیخ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات ”صور علیہ“ ہیں، یعنی علم حق تعالیٰ کی صورتیں ہیں، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ ”ما معلوم حقیم نہ علم حق“ یعنی عالم الغیب والشہادۃ تو ذات حق تعالیٰ ہے ہم ”معلوم“ ہیں نہ کہ خود علم، اگرچہ ہم بھی ایک جہان علم ہیں مگر علم حق تعالیٰ تک ہماری رسائی نہیں اس سے ہم نہیں کر سکتے، جو اس ظاہری سمع و بصر ذریعہ دانش ضرور ہیں مگر جو علم ان سے ہمیں حاصل ہوتا ہے اس نے حقیقی علم کی جو بھی نہیں سونگھی، یہ کہو کہ ہم اس علم پر ایک حجاب ہیں، العلم حجاب الاکبر۔

بیدل در درس گاہ رمز مطلق از آگاہی نمیتوان برد سبق
اجزاء محاط را کہ کردہ است محیط ما علم حقیم نے عالم حق
اللہ تعالیٰ کا علم ہر ایک شے پر محیط ہے۔ انسان کا علم ایسا نہیں کہ تمام کائنات کلاً و جزواً اس کے احاطہ علم میں آجائے۔ بس اتنا ہے کہ ہم علم حق

ہیں، حق کے عالم نہیں، اس رباعی میں بیدل شیخ اکبر کی تائید کرتا ہے۔

اے مُردہ انتظارِ محشر بُردن حیف است بہرِ فساناتِ خونِ خوردن
در صورتِ آفاقِ نظر کن کایں بجا ہر روز قیامت است و ہر شب مُردن
کب تک تو محشر کے انتظار میں مرے گا، اس کے بارہ میں جو کچھ فسانے بیان
کئے جاتے ہیں سن سن کر مارے غم کے گھل رہا ہے آفاق میں نظر کر کہ اس جگہ
روزِ قیامت ہے اور ہر ایک رات مرنا، نیند بھی موت کی بہن ہے، سویا اور مرا
ہو او دونوں برابر، صبح اٹھے تو سمجھو کہ حشر قائم ہوا۔

اے طالبِ جمعیت اوقاتِ مباش حرفے ز قلندرِ شبنو و فارغِ مباش
گر آگہی از مقتضیاتِ دوراں شبِ خواب کن دروزانہ تلاش
اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے ہر وقت جمعیتِ خاطر حاصل ہو تو ایک قلندر کی
بات سن اور بے فکر ہو، اگر تجھے دن اور رات کی گردش کے تقاضا کا علم ہے تو
رات لمبی تان کر سورہ اور دن کے وقت تلاشِ معاش کر، اللہ تعالیٰ نے رات
آرام کے لئے اور دن معاش کے واسطے بنایا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دن کو سونا
کہاں کی عقلِ مندی ہے۔

تا زنگیتِ مست باید بودن آزاد ہر چہ ہست باید بودن
عالمِ یکسر مقید و ہم خود است مارا بیدل پرست باید بودن
جب تک زندگی ہے مست حال رہنا چاہئے جو کچھ بھی ہے سب سے آزاد
اور بے تعلق رہنا چاہئے۔ ایک دنیا اپنے توہمات میں اُلجھی ہوئی ہے، ہمیں
تو بیدل پرست ہونا چاہئے۔ نہ دل ہونہ کسی سے اُلجھے۔

نہ قیصر جلوہ کن نہ فقور نشیں نے مست بروں آئے نہ مخمور نشیں
گر حاصلِ عزت نیست منظور ہوس از دیدہ خلق اند کے دور نشیں
تیرا باہر نکلتا خلوت نشیں ہونا قیصر و فقور کی طرح نہ ہونا چاہئے، نہ
اپنی مستی کا اظہار لوگوں پر کرے اور نہ مخمور گوشہ نشیں ہو، اگر تیری خواہش

بیدل

عزت کے حصول کی ہے تو تھوڑا خلق سے دور بیٹھ رہ۔

در ملک تعصب از خیال باطل یکسر بد افتاده خوشه های نخل
 زیں جاست کہ روز شب اندای ہمند زنداں بزبان زایدان از تہ دل
 توگوں نے کچھ باطل عقائد سے ایسی وابستگی پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے خلاف
 کچھ سننا نہیں چاہتے اور اسی کو ضرور منوانا چاہتے ہیں اسے ”تعصب“ کہتے ہیں،
 زند تو زبان سے اور زاہد تہ دل سے ایک دوسرے کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔
 ہر گاہ کشد مہر حقیقت علیے از شبنم امکاں نتواں یافت نے
 توحید بہارے و خزانے دارد یعنی ز تو خلد و از ماعدے
 آفتاب طلوع ہوتا ہے تو شبنم اس کی حرارت سے اڑ جاتی ہے اسی طرح جب
 آفتاب حقیقت کا ظہور ہوگا تو ممکنات کی شبنم میں نم باقی نہ رہے گی، توحید کی بھی
 بہار اور خزاں ہے یعنی بہار خلد دائمی بہار تو تیری ہے اور میری جانب سے خزاں
 عدم۔

اے رہو اگر ز خویش غافل باشی سرگشتہ ترا از راہ بمنزل باشی
 چوں گوہر اگر بضبط خود پردازی در دریا ہم مقیم منزل باشی
 اے سالک اگر تو اپنی خودی سے غافل خود شناس نہیں تو منزل پر پہنچ کر بھی
 تو اسی طرح سرگشتہ رہے گا جیسے ”راہ“ دور دراز ہے اور اگر گوہر کی طرح تجھے جمعیت
 حاصل ہے تو دریا میں رہتے ہوئے بھی تو ساحل پر مقیم ہے۔

حال است بمستقبل اگر و ارسی امروز شمار می چو بفردا برسی
 عقبی دور از وجود مردم دنیا است دنیا باشد دے کہ آنجا برسی
 جب تو ”کل“ تک پہنچے تو وہ حال ہی ہوگا۔ مستقبل تو اسی وقت تک
 ہے جب تک حال نہ ہو اور تیری وہاں تک رسائی نہ ہو، جب رسائی ہوگی، تو
 مستقبل حال ہوگا، اہل دنیا سے اسی طرح عقبی دور ہے لیکن جب تو عقبی میں
 پہنچے گا تو وہ دنیا ہی ہوگی۔

اے جو ہر ہوش محرم راز بر آ زندانہ ز زہد مگر پرداز بر آ
 عالم ہمہ یک مسخرہ ریش و فیش است از سلسلہ خجالت این ساز بر آ
 جو شخص ہوشمند محرم راز ہے اسے زندانہ اس ریا کاری سے باہر نکلنا چاہئے جو
 زندنائش کر رہا ہے، ایک دنیا ریش و فیش کی مسخرہ ہے، تو اس ساز و سامان خجالت
 کے سلسلہ سے باہر آ،

ہم صحبت شیخ شومقامات آموز باز اہد انس گیر طامات آموز
 اے حرص بزرگیت سر و برگ خیال چیزے ز فسو نہائے کرامات آموز
 لوگ جو پیران خانقاہ کے مرید ہوتے ہیں یاورد و وظائف میں مشغول رہتے
 ہیں اور ریاضت میں جان کھاتے ہیں تو تحت الشعور ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ
 لوگ انہیں بزرگ سمجھیں، ان کے لئے مقامات و طامات کافی نہیں، کچھ کرامات
 کا جادو بھی سیکھنا چاہئے۔

کبر و حسد کہ مردم اندوختہ اند باید فہمید از کہ آموختہ اند
 شیطان عمر سیت مردہ و مقعدیاں با ہم شمع مزارش افروختہ اند
 یہ کبر و حسد جو لوگوں نے دلوں میں جمع کر رکھا ہے چاننا چاہئے کہ کہاں سے
 سیکھا ہے شیطان تو عرصہ ہوا مر گیا۔ اس کے مریدوں نے اس کی قبر پر
 مل جل کر دیا جلا رکھا ہے۔

بیدل در معرض کمالات بیاں بر معنی ہزل نویسی نقصاں
 در انجمن قدر تعلق ہم زیں رنگ بے مصلحتے نیست ظہور شیطان
 جو شخص کلام میں اپنے کمالات کا اظہار کر رہا ہو اگر کبھی ہزل گو بھی ہو تو یہ
 کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اسی طرح شیطان کا
 ظہور بھی بے مصلحت نہیں ہے، یعنی ہزلیات شیطنت تو ہے مگر یہ بھی بے
 مصلحت نہیں۔ بیدل کے کلام میں ہزلیات کا حصہ کمتر ہے، چند اشعار ہیں
 جن میں وہ اہل مذاہب کے توہمات کا مضحکہ اڑاتا ہے، مثلاً شاہ عالمگیر کے

بیدل

عہد میں داڑھی کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے بھی کہ عہدِ اکبری میں لوگ اس سے فارغ البال تھے۔ بیدل کہتا ہے کہ ”جز پشیم نبود کہ کاہید و فرود“ آخر یہ بال ہی تھے، بڑھے تو کیا اور گھٹے تو کیا، اسی طرح زیارت قبور اور پیر پرستی کی مذمت کرتا ہے، بات یہ ہے یہ تو ہمت جن کو جز و دین سمجھا گیا ہے اسی لائق ہیں کہ ہزلیات میں ان کا مضحکہ اڑایا جائے، وہ خود ایک غزل کے مقطع میں کہتا ہے کہ آج دین تو یہی ریش و فش ہی ہے ”ملت و کیش چہ معنی دارد؟ مذہب کے بارہ میں لکھتا ہے کہ سب را ہیں، منزل سے دور، ”مذہب“ مشتق ہے ”مذہب“ سے، معنی چلنا، مذہب کے معنی ”روش“۔ یہ راہیں ہی ہیں، جو لوگوں نے اختراع کر رکھی ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اصل راہ اتنی ہی ہے جتنا مڑگاں کا باہمی فاصلہ، ذرا مڑگاں اٹھا کر دیکھو تو تمام کائنات تاحد نظر اس کے آغوش میں آرہے گی، لیکن اہل غرض نے ان راہوں کو اتنا دور و دراز اور دشوار گزار بنا رکھا ہے کہ منزل پر پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

بے قطع نفس منزل آسائش کو تارہ باقیست رفتی در پیش است
تامر دبرا غلاق نہد کردارش باید ز دم تیغ کشیدن عارش
کارے کہ تبسمش سرانجام دہد بر چین جبیں نیفلنی ز نہارش
اگر انسان اخلاق حسنہ میں اپنے اعمال ڈھالے تو مناسب نہیں کہ تلوار کا دم بھرے یا اس سے کام لے، جو کام خندہ پیشانی سے خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہو سکتا ہے وہ تیور چڑھانے سے کیوں ہو، تلوار اور تیور کی صورت ملتی جلتی ہے،

گروست رعیت زردارید ریغ از بے ثمران ثمر مدارید دریغ
تا تہمت خست نکشہ ہمت ہما اخلاق ز یکدگر مدارید دریغ
اگر خدا نے توفیق عطا فرمائی ہے اور تمہارے ہاتھ سخاوت سے کشادہ ہیں تو جو بے زر ہیں ان کو زردو، جو بے ثمر ہیں ان کو ثمر دو، ٹم کسی بار و درخت

ہی میں ہوگا۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اہل سخا سخاوت سے کام لیں اور ایثار کریں اس لئے کہ تمہاری ہمت بخل کی تہمت سے متہم نہ ہو ایک دوسرے سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے تو بہت مناسب ہے۔

بیدل وار و ز طبع اہل ہمت آثار سخا بجلوہ چندیں صورت
برنجبراں پند و محتاجاں سیم بر خورداں لطف بابرگاں خدمت
اہل جود و سخا کی طبیعت سے داد و دہش کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے جو بے خبر ہیں ان کو پند و نصیحت سے خبردار اور متنبہ کیا جاتا ہے، چھوٹوں کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہیں اور بزرگوں کی خدمت اور احترام کرتے ہیں۔

آوازِ کریم را "صلا" می خوانند سائل چودم زند دعا می خوانند
یک نغمہ شوقست چہ فقر و چہ غنا کز پردہ ہر ساز جدا می خوانند
ایک تو اہل کرم غنی ہیں دوسرے فقیر بنوا سائل، اہل کرم جب آوازِ سخا سے بلاتے ہیں تو اصطلاح میں اس کو "صلا" کہتے ہیں، فقیر کو جو کچھ ملتا ہے تو جو الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہیں اس کو دعا کہتے ہیں، اصل میں صلا اور دعا کا مفہوم ایک ہی ہے، دونوں فقر ہو یا غنا ایک نغمہ شوق ہی ہے۔
..... مگر ہر ایک ساز کے پردہ سے نچم اور مدھم سروں کی بلندی و پستی ہی کا فرق ہے، سر یا آواز بہر حال ایک ہی ہے۔

اندیشہ بخل از یقین مہجور نیست با خلق حسد ز فیض معنی دور نیست
برخوش ستم روا ماراے غافل چشمے و اکن کہ تنگ چشمی کو نیست
بخل ایک ایسا مذموم فعل ہے جس کو یقین یعنی ایمان اور عمل صالح سے دور کی نسبت بھی نہیں، اور "حسد" جو بخل ہی کی ایک شاخ خاردار ہے یا میوہ تلخ ہے فیض معنی سے لگا نہیں کھاتا، حقیقت یہ ہے کہ بخل اور عا سار اپنے ہی نفس پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں تو نظر آئے گا کہ تنگ

چشمی اندھا پن ہی تو ہے۔

ایں سنگ دلاں خاک سیاب بچشم یکا شک ندیدہ شرم اجباب بچشم
 محو اند بذوق خست آرائیہا چوں آئینہ نان در بغل و آب بچشم
 بخیل نہایت سیاہ باطن سنگ دل ہوتا ہے، ذیوی اسباب یہی خاک ہول
 ہے جو اس کی آنکھوں میں پڑتی ہے، دوست تنگی کی وجہ سے پریشان حال ہوں اور
 مارے شرم کے دست سوال دراز نہ کریں، یہ ان کے حالات دیکھتے ہوئے بھی نہیں
 پیچھے، کتنی بے آبروان کی آنکھیں ہیں کہ آبدیدہ نہیں ہوتیں، خست کی صورت
 جس میں یہ محو ہیں آئینہ کی طرح ہے نان تو بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور آنکھوں
 میں آب ہے۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، آب و نان دونوں آئینہ میں ہیں، نان
 بغل میں اور آب آنکھوں میں، مگر یہ نان ایسا ہے کہ اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا
 بلکہ خود بخیل اپنے آپ سے بخل کرتا ہے، آب وہ ہے کہ اس سے کسی کی پیاس
 نہیں بجھتی، خست آرائی میں بخیل محو ہے۔

ساز و حشت حقیقتے ساکن نیست ظاہر ہر چند پر زند باطن نیست
 گوہر دو جہاں گفت و گو خوں گرد حرفیکہ بخاموشی رسد ممکن نیست

ذیوی ساز و سامان و اسباب محسوس ہو رہا ہے اور ”ظاہر“ ہے۔ اس کے
 لئے دوڑ دھوپ و حشت ہے، اضطراب ہے، جو ”سکون“ کی ضد ہے سکون ”باطن“
 میں ہے، انسان فطرتاً سکون کا طالب ہے۔ لیکن اس ظاہری اسباب کی فراہمی
 سے جمعیت دل، اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر دو جہانوں کی خاک چھانو
 اور اس موضوع پر گفتگو کرتے رہو وہ بات جو ”خاموشی“ سے حاصل ہو سکتی ممکن نہیں
 اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر عالم صورت ہے اس میں جو اصل معنی یا
 حقیقت ہے وہ ان صورتوں کی چھان بین سے نہیں ملے گی۔ اہل فکر انہیں نظر
 انداز کرتے ہیں اور اس حقیقت کو خاموشی فکر سے پالیتے ہیں، یہ بات قیل و
 قال مدرسہ اور بحث و مباحثہ و مناظرہ سے حاصل نہیں ہوتی جو محض درد سر

اور وحشت ہے۔

تا چرخ بساط ثابت و سیار است خاموشی مرکز و سخن پرکار است
 بے تخم بود و دیدن ریشہ محال یعنی بے نقط سیر خط دشوار است
 جب تک آسمان پر تاروں اور ستاروں کی بساط بھی ہوئی ہے، تارے اپنی
 جگہ سے حرکت نہیں کرتے جیسا قطب تارہ ہے، ستارے گردش کرتے ہیں، جیسے
 مربع و مثلث و مشتری وغیرہ، مگر یہ سب ایک مرکز کے گرد گردش کرتے ہیں اور
 مرکز قائم اور ثابت ہے ہمارے نظام شمسی میں سورج مرکز ہے۔ اسی طرح
 ”خاموشی“ مرکز ہے اور ”سخن“ پرکار کی طرح اس کے گرد گردش کر رہا ہے، یا یہ
 کہو کہ بیج مرکز ہے اور ”ریشہ“ جو شاخوں وغیرہ میں نشوونما پاتا ہے اسی ”تخم“
 سے وابستہ ہے۔ اس لئے مرکز نقطہ ہے اور اس کے گرد خط کی گردش ہے۔
 جب تک نقطہ نہ ہو گا خط بھی نہ ہو گا۔ یہ مرکز یا نقطہ وحدت ہے اور خط کثرت
 نقاط سے ہی بنتا ہے، جب تک نقطہ وحدت کی طرف رجوع نہ ہو کثرت کی
 حقیقت منکشف نہ ہوگی۔ ریاضی میں ”نقطہ“ وہ ہے جس کا نہ طول ہو نہ عرض
 یہ اقداران خطوط میں ہیں جن سے مختلف شکلیں مثلث و مربع وغیرہ بنتی ہیں۔
 اس لئے اس عالم صورت کی قدر و قیمت اگر کچھ ہے تو اس حقیقت کی دی ہوئی
 ہے جو ”وحدت“ ہے۔

تا از ما و منت پشیمانی نیست جمعیت آبرویت از زانی نیست
 ضبط نفست قدرت تسخیر ہواست تسخیر ہوا غیر سلیمان نیست
 یہ من و تو کے امتیازات نے جو بحر و بر میں شور و شر برپا کر رکھا ہے اگر تیرا
 دماغ اس سے پریشان اور تجربہ کے بعد تو پشیمان نہیں ہوتا تو یہ سمجھ کہ وہ آبرو
 جو جمعیت دل یا اطمینان قلب کی ہے سستی نہیں پڑتی۔ ”ضبط نفس“ سے مراد
 ہوا ہوس کو مسخر کرنا ہے، یہ قدرت اور طاقت ضبط نفس یعنی خاموشی میں ہے
 مشہور روایت ہے کہ سلیمانؑ کے حکم سے ہوا مسخر ہو گئی تھی۔ سلیمان کی قوت

بیدل

نے ہوا کو مسخر کیا ہوا تھا اگر تو بھی ضبطِ نفس سے کام لے تو تو بھی سلیمان ہے۔
من و تو خود بینی و خود رائی ہے۔

خود بینی و خود رائی در مذہب زنداں نیست

کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی (حافظ)

آں نشاء کل کہ سرسرا گاہیت در ہر جزو شظہور غفلت گاہیت
ہر جابتا ملش گرہ می کر دیم در رشتہ افہام ہماں کوتاہیت
رشتہ یادھا گا کو اگر گرہ پر گرہ دیتے جائیں تو اس کا طول کم اور کمتر ہوتا
جائے گا۔ بیدل نے اس تخیل سے حکیمانہ بات یہ پیدا کی ہے کہ کل تو سرسرا گاہی
اور شعور ہی ہے کہ ہوا ہے لیکن اس کا ہر ایک جزو غفلت کا مقام ہے، جب
ہم اس میں تامل یا فکر کرتے ہیں تو اس میں گرہیں ڈالتے چلتے ہیں یہی فہم کی
کوتاہی بن جاتی ہے، بوقتِ تامل جب ہم سرسرا نو ہونے ہیں تو گرہ کی صورت
پیدا کرتے ہیں، یعنی جو حقیقت بالبداہت ثابت شدہ ہے اس میں استدلال
عقلیہ سے آنکھیں پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے حکماء کا کسی نظریہ پر کبھی اتفاق نہیں لیکن
انبیاء و رسل ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں، وہ ایک ہموار راستہ پر چلتے
ہیں اور اہل عقل ناہموار راستہ پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ہر جاستے بردل شاد رسد از دست شعور زحمت ایجاد رسد

بر بندے چشم ز تمیز و بخواب اُمید کہ غفلتے بفریاد رسد

کسی پر ظلم و ستم ہو رہا ہو اور فریاد کر رہا ہو تو فریاد رس بھی کوئی ہونا چاہئے۔

بیدل نے اس سے ایک بات پیدا کی ہے کہ یہ شعور ہی ہے جو زحمت ایجاد کر رہا ہے

اس لئے دلِ ناشاد پر جو ستم ہو رہا ہے وہ اسی کے ہاتھوں ہو رہا ہے، آنکھیں موند

لے اور سو جا، اُمید ہے کہ غفلت سے کچھ فریاد رس ہو جائے گی۔

در ہر را ہے کہ مقتدا می ایستد پیرو بے اختیار و امی ایستد

سیلاب ہر کجا سرش خور و بنگ ہر موج کہ باشد بقفامی ایستد

جس راستہ پر رہنا چلتے چلتے رک جائے تو پیرو خود بخود رک جائیں گے، سیلاب بہتا ہوا اگر تپھروں سے ٹکرائے تو اس کی لہریں پیچھے کی طرف ہٹتی ہیں۔ بیدل کی رباعیات بلکہ تمام کلام میں اس کے مشاہدات ہی کا مذکور ہے، وہ ان سے اخلاقی نتائج پیدا کرتا ہے اور موزوں لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

ہر کس مضمون عافیت می داند از سطر نفس درس فنا می خواند
راحت می خواہی از خموشی مگذر کایں وضع بوضع نیستی می ماند
عافیت راحت، سکون و اطمینان قلب کے مضمون سے جو بھی واقف ہے نفس کی آمد و رفت سے درس فنا پڑھ رہا ہے، سانس ہر ایک دم میں فنا ہوتا ہے مگر جب تک زندگی ہے یہ سلسلہ آمد و رفت جاری، ایک دم چین سے بیٹھنا قبر میں ہی نصیب ہوگا، گفت و گویا حرف و صورت اسی سانس کے رشتہ سے وابستہ ہیں، اگر تو راحت چاہتا ہے تو وہ خاموشی میں ہے۔ یعنی اس سانس سے اضطراب حرف صوت دور کر دے چونکہ راحت کامل نیستی میں ہے خاموشی کی وضع اسی نیستی سے ملتی جلتی ہے۔

اے محرم موج و طیش آموختنش غیر از کف پوچ چہیست اندوختنش
غافل مشوا ز تامل وضع صدف چیزے دار دل باز سخن دوختنش
بحر تحقیق میں اہل فکر ہی غوطہ لگاتے ہیں، اور سطح بحر پر موج اور کف ہرزہ نوا ہیں۔ اگر انہیں جمع کیا جائے تو کیا حاصل ہوگا۔ صدف کو دیکھو کہ اس کے دونوں لب ملے ہوئے ہیں اسی خاموشی میں ایک قیمتی شے ہے، معنی دار دکھ دے گفتن نمی آید، یہ گوہر ہے۔ یعنی اہل فکر تامل سے گوہر مقصود پالیتے ہیں اور فکر خاموشی سے وابستہ ہے، جو لوگ منہ کی بکواس اور قلم کی گھس گھس میں مشغول ہیں وہ سطح پر موج و کف کی طرح مضطرب اور پریشان حال ہیں لیکن کامل سکون خاموشی سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

تا شور نفس پرور ما و من است ہر سونظر افگنی جنوں انجمن است

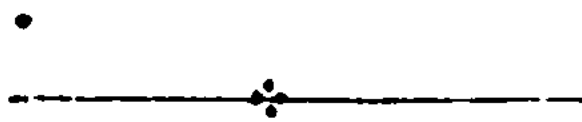
بیدل

اوہام گرفتست جہات امکان جمیعت کو گوشہ دل ہم سخن است
شور نفس سے ماومن کی پردہ دری ہو رہی ہے جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو
جنون نے انجمن آرائی کی ہوئی ہے شش جہت امکانی توہمات کی گرفت میں
ہیں۔ المینانِ قلب کسے نصیب دل کے گوشے باہم ہم سخن ہیں، کوئی خیال
دل میں بے حرف پیدا نہیں ہوتا۔

تافضل و ہنر آئینہ پرداز نشد اقبال درش بروے کس باز نشد
فولاد براہن شرف از جوہر یافت بے علم بجنس خویش ممتاز نشد
جب تک کسی شخص کے فضل و ہنر کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوتا تب تک
وہ مقبول عام و خاص نہیں ہوتا، لوہا اور فولاد ایک ہی شے ہے۔ جو ہر دونوں
میں ہے لیکن لوہے میں پوشیدہ ہے اور فولاد میں نمایاں اس لئے فولاد کو
لوہے پر فضیلت دی گئی ہے، ہر ایک شے اپنی جنس میں ممتاز درجہ حاصل
نہیں کر سکتی جب تک اس کا جوہر علم ظاہر نہ ہو یعنی وہ خواص و حقائق، جو
اس میں پوشیدہ ہیں جب تک ظاہر نہ ہونگے گراں قدر نہ ہوگی۔

بیدل زیبا طرد ہر وحشت انگیز گریئے ہست سرپوں آرو گریز
آوارہ یاس پیش ازین نتوان زیست جائے بنشینے کہ نگوید بر خیز
اس دنیا کے درد و دیوار سے وحشت ٹپکتی ہے اگر تیرے پاؤں ہیں تو سر پر
رکھ کر بھاگ، جو زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اس کا جینا اودمزا برابر ہے ایسی
جگہ جا کر بیٹھ جا کہ کوئی نہ کہے کہ اٹھ، ایسی کونسی جگہ ہے؟ ”آثارِ قدیمہ“ والے
مردوں کی ہڈیاں بھی اکھاڑ رہے ہیں، ”اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے،
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے“ یہ بھی مقامِ عبرت ہے کہ قبریں انہی کی
اکھڑ رہی ہیں جو اغنیاء تھے، مرنے کے بعد بھی اپنی آرام گاہ کی آرائش و
زیبائش کا خیال نہ چھوٹا۔
غالب کہتا ہے کہ ۷

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں
 بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی، ہمیں اٹھائے کیوں
 غالب نے رہ گذر ایسی جگہ تصور کی ہے جہاں سے کوئی اٹھا نہیں سکتا
 حالانکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں چلنے پھرنے والے ٹھکراتے ہیں، اور کھلتے ہیں۔
 بیدل بر خلق کسر شاں نمائی تاثیر تو اس شدن کماں نمائی
 غاصبت اس معرکہ عاجز کشتی است اس جاز نہار ناتواں نمائی
 اس گیر و دار دنیا میں جو معرکہ آرائی ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ زبردست
 کمزور کو دباتا ہے، اور کمزور کچلا جاتا ہے اس لئے اس عاجز کشتی خوشخوار دنیا
 میں جس شخص نے اپنی کمزوری کا اظہار کیا اسے کچل کر رکھ دیں گے۔ اس لئے
 کبھی یا تو سرے سے کمزور نہ ہونا چاہئے، تو انائی پیدا کرنی چاہئے مقابلہ کرنا
 چاہئے، یا اپنی کمزوری دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دو، ورنہ مارے جاؤ گے۔



دیوان بیدل

فارسی شاعری میں شعر کی اصناف تو بہت ہیں، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مگر غزل کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی کا حصہ نہیں، اور یہی زبانِ رد و خلافت ہے۔ غزل کا موضوع بھی مختلف ہے۔ عشقیہ اور صوفیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے، تصوف دراصل فلسفہ نظری اور عملی ہے، تصوف میں عشق بھی کار فرما ہے جسے عشق حقیقی کہتے ہیں، بیدل نے تمام اصناف شعر میں بہت کچھ لکھا ہے، سرِ دست ہمیں غزلیات کا جائزہ لینا ہے، مناسب تو یہ تھا کہ ہم ہر ایک غزل سے دو دو تین تین شعر منتخب کر کے ان کا مفہوم اردو میں بیان کرتے۔ لیکن بقول غالب اس بحرِ بکراں میں شناوری کون کر سکتا ہے، حروف ”ت“ اور ”د“ اور ”میم“ وغیرہ کی ردیف میں بیدل نے جتنی غزلیں لکھی ہیں فرداً فرداً ان کی تعداد اکثر شعرا کے دیوان اور کلیات کے اشعار سے بڑھ کر ہے، سرِ دست ہمارے مدِ نظر بیدل کا شاعرانہ تخیل بھی نہیں، صرف حکیمانہ تفکر ہے۔ لیکن بیدل نے دونوں کو اس ہنرمندی سے جمع کیا ہے کہ حکمت کی خوبی اس کے حسنِ کلام میں اہلِ نظر مشاہدہ کریں تو ان کو مجدا کرنا مشکل ہے۔ پہلے ہم بیدل کی غزلیات سے وہ شعر انتخاب کرتے ہیں۔ جن میں اس نے خودی اور بخودی، امروز و فردا، دنیا و عقبی، آزار اور آسائش

دیوان بیدل

بالخصوص ہستی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

آج تک جو کچھ حکماء نے لکھا ہے وہ جستجوئے حق ہی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے پاس کوئی معیارِ حق بھی ہے یا دریافت ہو سکتا ہے۔ قرآنِ عظیم نے شروع میں ہی معیارِ پیش کیا ہے کہ ”ذالک الکتاب لا ریب فیہ“ وہ کتاب کائنات یا صحیفہ فطرت ہے جس میں کوئی الجھن نہیں اور الجھن ہی کا نتیجہ شک و شبہ ہوتا ہے اور اس ذہنی حالت میں قوتِ فیصلہ تذبذب میں آرہتی ہے۔ بیدل نے نکات میں بھی یہی کچھ لکھا ہے کہ جو کچھ اشیاءِ محسوسہ معینہ مشخصہ کے سوا نظر آئے سب سودا ہے۔ اس لئے جو کچھ بصر و بصیرت سے مشاہدہ ہو رہا ہے اور سب ایک ہی طرح مشاہدہ کرتے ہیں حق ہے۔ انسان پر کیا موقوف ہے حیوانات بھی لیل و نہار میں اختلاف جو کچھ ہے فطرتاً محسوس کرتے ہیں، دن کے وقت فکرِ معاش ہے تو رات آرام کے لئے۔ ہم چہار عنصر اور نکات کے تحت بیدل کے نظریہ تحقیق پر بحث کر چکے ہیں، شنوی عرفان وغیرہ میں وہ اس امر کی تصریح بھی کرتا ہے کہ کائنات کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مختلف صورت ہوگی کیونکہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کل پر حاوی ہو اس لئے اگر کسی نے ہر ایک شے پر تغیرات وارد ہوتے اور آخر فنا ہوتے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا پیچ ہے اور اس لئے ”اے پیچ در فکر، پیچ پیچ“ تو جہاں تک اس کا مشاہدہ ہے یہ نتیجہ بھی صحیح ہے، اس طرح اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یعنی کسی شے کے جزو کو دیکھتے ہیں، کل نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کل کے احکام و آثار سے واقف ہیں، ہمیں ایک ذرہ کے بھی حقائق کا کلاہ علم نہیں۔

انسان طبعاً ”راز جو“ واقع ہوا ہے۔ ”راز جوئی“ کی عادت اوائل عمر میں نمایاں ہوتی ہے، بچے عموماً بڑے بوڑھوں سے چند وجہ و چوں دریافت

بیدل

کرتے رہتے ہیں، بلکہ بعض اوقات بڑے بوڑھوں سے جواب بن نہیں آتا، وجہ راز جوئی یہ ہے کہ نو عمری میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے دنیا اور عجیب ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ جب اس ماحول کو جس میں ہماری پرورش ہوتی ہے عادتاً دیکھتے رہتے ہیں تو اس میں کوئی بات جاذبِ دل نہیں رہتی اور راز جوئی کا جذبہ بھی سرد پڑتا جاتا ہے۔ لیکن بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو راز جوئی کی طرف ہمیشہ مائل رہتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخر میں ”محقق“ کہلاتے ہیں انہی میں سے ایک بیدل بھی تھا، اس کے کلام میں ابتدائی تحریک تحقیق کا بھی مذکور ہے، چنانچہ دو مسلسل غزلوں کا یہی موضوع ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

صبح از چہ خرابات جنوں کرد بہارش
کافاق گرفتہ است بغمیازہ خمارش

اس شعر میں دو مشاہدات کو یک جا بیان کیا گیا ہے، جب نیند کے ماتے صبح اٹھتے ہیں تو انگڑائی لیتے ہیں اور بادہ شبانہ کا نشہ جب اترتا ہے تو خمار کی وجہ سے بادہ خوار انگڑائی لیتا ہے، شاعرانہ تخیل یہ ہے کہ صبح رات بھر تو میخانہ جنوں میں متوالی رہی، یعنی یہ سیہ مست تھی، اب انگڑائی میں اس نے تمام آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ صبح کس خرابات جنوں میں رنگ ریاں مچاتی رہی کہ اس کی انگڑائی نے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ بیدل کے اکثر اشعار کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کا مفہوم نثر میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک ذہنی کیفیت ہے اور شعر کی خوبی بھی یہ ہے کہ نثر میں ادا نہ ہو سکے۔

دوسری غزل کے چند اشعار یہ ہیں:-

چنیں کشتہ حیرت کیستم من
کہ چوں آتش از سوختن زیتتم من

میں کس کا کشتہ حیرت ہوں کہ آگ کی طرح جل رہا ہوں مگر میری

زندگی بھی اس جلتے میں ہی ہے، آگ اگر نہ جلے مُردہ ہے، اور جب تک جلتی رہے زندہ ہے۔ میں کشتہ حیرت بھی ہوں، حیرت نتیجہ ہے لاعلمی کا، یعنی ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ کیا مشاہدہ کرتے ہیں اس لئے حیرت میں آ رہتے ہیں، باوجود اس امر کے کہ میں کشتہ حیرت ہوں مگر زندہ بھی ہوں اور میری زندگی آگ کی طرح ہے کہ جب تک مسلسل جلتا ہوں زندہ ہوں اگر ایک دم ٹھنڈا پڑ جاؤں تو خاکستر ہو کر رہ جاؤں گا، اگر یہ لفظ ”حسرت“ ہو تو معنی ایک ہی ہے۔

نہ شام نہ محزوں نہ گردوں نہ خالم
نہ نفظم نہ مضمون نہ معنیستم من
ہر ایک شے ایک خاص حالت میں نظر آتی ہے۔ مگر میری عجیب حالت ہے کہ کسی ایک حالت کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ ”نہ شادم نہ محزوں“ نہ تو میں ایک ہی حالت شادی میں اور نہ ایک ہی حالت غم کی تصویر ہوں، بلاشبہ یہ تمام حالات مجھ پر وارد تو ہوتے ہیں مگر عارضی ہیں، میری فطرت کے نزدیک بیگانہ سے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ میں نہ آسمان ہوں اور نہ زمین اور نہ عبارت کا مضمون اور لفظ و معنی۔

اگر فانیم چلیست ایں شور ہستی
وگر باقیم از چہ فانیستم من
اگر میں فانی ہوں تو ہنگامہ ہستی کیا ہے، اور اگر میں باقی ہوں تو مر کر فانی کیوں ہوتا ہوں۔

غالب مرحوم نے بیدل کی دونوں غزلیات کی ترجمانی بھی خوب کی ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
اسی غزل میں ”ابر کیا ہے اور ہوا کیا ہے“ وہی چہ و چوں و چرا ہے جو تحقیق

کی بنیاد ہے۔ شعر ہے کہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ لے خدا کیا ہے

غالب نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ موجود صرف "ذات واحد" ہے، اس لئے ہستی میں یہ شور اور ہنگامہ کس لئے اور کس کا برپا کیا ہوا ہے؟ ایک سوال اٹھایا ہے مگر جواب نہیں دیا، جواب مخاطب پر چھوڑ دیا ہے، ظاہر ہے کہ ہنگامہ میں ایک سے زیادہ شخصیتوں کی شرکت واجب ہے، ایک سے زیادہ موجود ہی نہیں۔ بیدل نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر میں فانی ہوں اور فانی سے شور ہستی کا ظہور ناممکن ہے تو پھر یہ ہنگامہ آرائی کرنے والا کون ہے جو موجود ہونا چاہئے، اگر میں موجود ہوں تو میرے ساتھ یہ فنا کا دم چھلّا کیسے اور کیوں لگا ہوا ہے، اس کا جواب اسی غزل میں دیتا ہے کہ

بنا زائے تخیل، ببال اے تو ہم

کہ ہستی گماں دارم و نیستم من،

یہ تخیل اور تو ہم کا کرشمہ ہے کہ گمان ہستی اپنے لئے کرتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ "نیست" ہوں، غالب نے چہ چند و چوں کا تخیل تو بیدل ہی سے لیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ شیخ فضل اللہ المعروف قاضی شیخ جمال الدین جمال دہلوی کے ایک مطلع کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔

لے از جمالت ایں ہمہ غوغا برائے چلیست

چوں جملہ حسن تست تماشا برائے چلیست

شیخ جمال کی کمبوہ ذات تھی۔ دہلی میں عہدہ قضا پر عہد اکبری میں مامور تھے، ۹۴۲ھ میں وفات پائی، حاجی بھی تھے اور اپنے زمانہ کے اکثر علماء و حکماء سے ملنے والے بھی تھے، چنانچہ ملا جلال دوانی صاحب خلاق جلالی سے مراسم دوستانہ بھی تھے، آپ کا ایک شعر بہت مشہور نعت میں ہے۔

موسى زہوش رفت بیک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمے

بیدل نے بھی ایک رباعی میں قاضی صاحب کے فتاوے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ”حق را قاضی جمال نتوان فہمید“ قاضی جمال نے مطلع میں اس سوال کا جواب کہ ”تماشا برائے چلیست“ اور ”غوغا برائے چلیست“ بتا ہر لفظوں میں نہیں دیا مگر لا جواب مطلع میں اشارہ یہ ہے کہ ”برائے من و تو“ ہے بیدل کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہر کہ اینجا میرسد بے اعتدالی می کند
شمع ہم در بزم مستان شیشہ خالی می کند
ایک شعر ہے۔

درس دانش ختم کن کاٹینہ دار سیم زر
زنگی مکروہ را ملا جمالی می کند
ملا جمال کبوتر کا رنگ رو سیاہ تھا اور شاہی ملازم شاہی خزانہ سے
تنخواہ لیتے چاندی سے ہاتھ اور زر سے دل سیاہ ہوتا ہے۔
تلمبے شب پرست حق و باطل بودن
مردایں محکمہ آنست کہ قاضی نشود

نواب شکر اللہ خاں کا ذکر ”چہار عنصر“ کے تحت ہم کر چکے ہیں۔ ان
ایام میں سخن فہمی اور سخن گوئی بھی قابلیت کا ایک معیار تھا۔ ہر ایک صاحب
سیف صاحب قلم بھی تھا۔ عہد اکبری سے آخری تابعدار مغلیہ کے دور تک اکثر
امراء و زرا بھی ادیب اور صاحب دیوان تھے، ”مائثر رحیمی“ اور دیگر تذکروں
میں ان لوگوں کا مذکور ہے۔ شکر اللہ خاں سپہ سالار بھی تھا اور ادیب بھی،
تذکرہ مرآۃ الجنال امیر شیر علی خاں لودھی نے لکھا ہے اس میں بیدل اور
ہم عصر شعرا کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک دن نواب شکر اللہ خاں کے ہاں
مجلس شعر و سخن گرم تھی۔ ناصر علی سرہندی اور بیدل بھی موجود تھے۔
بیدل نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔

بیدل

نہ شد آئینہ کیفیت مآظہر آرائی

نہاں مانندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

مفہوم شعر تو یہ ہے کہ اگرچہ لفظوں کی صورت میں معنی کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن میں یا میری حقیقت کا اظہار کسی صورت میں نہ ہوا۔ ناصر علی نے کہا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ پیدا ہوا تو البتہ معنی بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ معنی تابع لفظ سمجھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی لفظی حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں لیکن ”من“ کی ماہیت کسی لفظ سے منکشف نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ”حقیقت انہاں“ باوجود کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت پوشیدہ ہی رہی ناصر علی نے خوب داد دی۔

شعوی ”عرفاں“ میں بیدل کہتا ہے کہ جب میں نے تحقیق شروع کی تو آخر

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان نیست

نہاں در ہر کف خاکے جہان نیست

مجھے یقین ہو گیا کہ ہر ایک قطرہ میں جان ہے، اور ہر ایک ذرہ ایک

جہان ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ایں دل حیرت سرا از نقش قدر ہا پر است

ذرہ از سا ماں مہر و قطرہ از دریا پر است

کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد

کدام ذرہ کہ طوفان آفتاب ندارد

ہمارے زمانہ کی علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک ذرہ میں

کامل نظام شمسی موجود ہے، اور ہر ایک قطرہ میں دریا موجزن ہے۔ بصرو

بصیرت سے نقوش ان اشیاء کے اور ان کے حقائق ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، قلب انسانی ایک آئینہ ہے اور حیرت سرا ہے۔ نہ تو اشیاء آفاقی اور نہ ان کے نقوش یا تصورات ذہنی ہمارے پیدا کردہ ہیں۔ بیدل اکثر اشعار میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا وہی خالق کائنات ہے اور ایک ہی ہے۔

بہر حال معیار صداقت بھی صحیفہ کائنات ہے، لیکن بیدل ایک خاص بات بھی کہتا ہے اور یہی اس کی اپنی تحقیق ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق حرفِ آخر نہیں، جسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ محقق کی اپنی حدِ نظر ہے۔
ہر کس اس با از مقام و حال خود گوید خبر
از زبانم حرف او گر بشوی باور ممکن

ہر ایک محقق کا نظریہ جسے وہ اپنی تحقیق سے تعبیر کرتا ہے خود اس کے حال اور مقام کا پتہ دیتا ہے کہ اس کے ذہن کی زمانی اس حد تک ہے۔ اسی طرح اگر میں یا کوئی اور کسی کی نسبت جو اس کا غیر ہے یہ کہے کہ وہ ایسا اور ایسا ہے تو باور نہ کر مطلب یہ ہے کہ کنہ ذات معلوم کرنا محال ہے۔ ذات کی نسبت جو کچھ علماء نے آج تک کہا ہے وہ ان کا اپنا نظریہ ہے اور بس۔ البتہ ہر ایک نظریہ کی بلندی اور پستی کا اندازہ اسی نظریہ کی بلندی اور پستی سے ہو سکتا ہے۔ ایک رباعی میں بوضاحت لکھا ہے کہ کسی شے کا سایہ خاک پر تاریک ہوتا ہے جو شخص سایہ اس حال میں دیکھ رہا ہے وہ اسے تاریک ہی کہے گا اور سچ کہتا ہے۔ دوسرا شخص اسی سایہ کو پانی میں تمثال کی صورت میں دیکھتا ہے اگر وہ اسے تمثال سے تعبیر کرتا ہے تو وہ بھی سچ کہتا ہے۔ دونوں کا مشاہدہ اور تحقیق ان کی اپنی حدِ نظر تک ہے۔ اصل شے سایہ اور خاک و آب و تاریکی و تمثال سے باہر ہے اور ان سب سے بے نیاز ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر بیدل کہتا ہے کہ جس حد تک تزکیہ نفس

بیدل

اور تصفیہ قلب ہو یہ سایہ یا ”ظل“ اسی حد تک صاف مشاہدہ ہوگا، اس سے بڑھ کر ہم تحقیق کر ہی نہیں سکتے، یعنی اپنی محسوسات معینہ مشخصہ کی صورتوں اور حقائق سے آگاہ ہو سکتے ہیں، اور یہ سب ظل ہی ہے۔ اس موضوع پر بیدل نے مختلف پیرایہ میں اکثر اشعار میں داؤ تحقیق دی ہے۔

تنزیہ بے نیاز است از انقلاب تشبیہ

گو برہمن دوروزی محو صنم بروں آ

تنزیہ تشبیہ کی مثل نہیں ہے تشبیہ خواہ سایہ ہو یا تمثال اس پر ہرگز تغیرات واقع ہوتے ہیں، اور کبھی ایک حال پر اس کا پیام نہیں، لیکن تنزیہ اس انقلاب سے پاک ہے۔ برہمن بت پرستی میں محو ہے تشبیہ اور اس کے انقلاب کا پجاری ہے، اگر وہ چاہتا ہے کہ حقیقت آشنا ہو تو اس تمثال پرستی کو ترک کرنا چاہئے اور اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے جس کی یہ تمثال ہے، یا جس نے یہ تمثال پیدا کی ہے۔

بغیر عکس ندانم دگر چہ خواہی دید

اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

آئینہ خواہ کتنا ہی صاف ہو اس میں تو صرف عکس ہی نظر آئے گا۔

اس لئے جمال یکتا یا حسن وحدت اسی حد تک ممکن ہے۔

پر تو خود شید جز در خاک نتوان یافتن

یک زمین آسماں از اصل خود دوریم ما

آفتاب کا سایہ خاک ہی پر پڑتا ہے جو انتہائی کثیف ہے، اسی طرح

ہمارے جسد خاکی میں یہی ظل جلوہ فرما ہے، آفتاب تو آسمان میں اور سایہ

زمین پر، یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنی اصل سے اتنا ہی دور ہیں جتنا عرصہ یا

فاصلہ زمین و آسمان میں ہے۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین

زمین فلک شود و آدمی خدا نہ شود

اگر یہ ممکن بھی ہو کہ زمین آسمان بن جائے پھر بھی داغ بندگی جو
ہماری پیشانی پر ازلی وابدی ہے مٹ نہیں سکتا اور یہ ممکن ہی نہیں کہ
آدمی خدا بن جائے۔

مگو ممکن نہ حد خویش بگذشت نہ لو واجب شد و نہ ممکن ای گشت

حسن یکتائی و آغوش دوئی و ہم است و ہم

تا تو از آئینہ می یابی اثر دیدار نیست

حسن یکتائی کو دوئی کی آغوش میں دیکھنا محض وہم محال اندیش ہے،
جب تک تو آئینہ میں اس کا عکس دیکھ رہا ہے یہ سمجھ کہ حسن یکتائی کا
دیدار نہیں ہو گا۔ لیکن

باید از ہستی بہ تمنائے قناعت کردنت

میں ہماں خانہ آئینہ بیروں دراست

اس کے سوا چارہ نہیں کہ آئینہ ہستی میں اسی نکل اسی تمثال پر

قناعت کی جائے، خانہ آئینہ میں مہمان کی صورت تو جلوہ گر ہے مگر حقیقت

یہ ہے کہ مہمان خانہ آئینہ کے دروازہ سے باہر ہی ہے، اسی تخیل کو بیدل نے

ایک اور شعر میں بیان کرتے ہوئے ایک اور بات پیدا کی ہے۔

حسن یکتا چہ جنوں داشت کہ از تنگ وئی

خواست بر سنگ زند آئینہ بر یار و دست

اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے اس شعر کو سمجھنا چاہئے۔

کجاست غیر جز اثبات ذات یکتائی

”توئی“ در آئینہ وار دمنی کہ از تو جداست

اگرچہ آئینہ میں تیرا عکس تو ہی ہے مگر تجھ سے جدا ہے، اس لئے تیرا غیر

اعتباری ہے، اس لئے اس کی نفی تیری ذات کی یکتائی کا اثبات ہے،

اگرچہ تیرا عکس فی الحقیقت تیرا غیر نہیں لیکن اس لئے کہ تجھ سے جدا ہے اسے

بیدل

غیر کہہ سکتے ہیں، اسی کی نفی سے غرض تیری یکتائی ثابت کرنا ہے، کائنات آئینہ ہے اور اس میں ذات کے اسما و صفات جو عکس ذات میں جلوہ فرما ہیں، ان کی نفی ”ذات بحت“ کا اثبات ہے، اب مناسب تو یہ تھا حسن یکتا کی غیرت اس آئینہ کو پتھر پر مار کر توڑ دیتی مگر میرے سر پہ مارا، اس میں تلمیح ہے، اور اشارہ آیہ کریمہ کا طرف ہے، کہ امانت ”کو پہاڑوں پر پیش کیا گیا مگر سموات وغیرہ سب یہ بار امانت اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ آئینہ سنگ ہی ہے، یا جلا شدہ سنگ آئینہ ہے، اور پہاڑ یہی سنگ ہیں، مطلب یہ ہے کہ انسان عقلمند باشعور مخلوق ہے اور یہی ”عین“ و ”غیر“ میں تمیز کرتا ہے اس لئے ذات کی شخصیت اور اس کے عکس کو ایک دوسرے کا غیر ہی کہہ سکتا ہے۔ اس شعر کا لطف ”چہ جنوں داشت“ میں ہے۔ عقل کی نفی جنوں کا اثبات ہے، اور جنوں حسن یکتا نے ہمیں دیا ہے۔ بیدل نے اکثر اشعار میں عقل و جنوں پر جسے اصطلاح میں عشق سے موسوم کرتے ہیں لطیف بحث کی ہے۔ علامہ اقبال نے بیدل کے ایک شعر کی تشریح ”بانگ درا“ میں کی ہے شعر یہ ہے کہ

باہر کمال اند کے آشفنگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

خرد ہر چند نقد کائنات است چہ سجد پیش عشق کیمیا کار
اگرچہ عقل کائنات کا سرمایہ ہے اور تمام کائنات میں یہی ایک شے
قدر و قیمت کی ہے مگر عشق کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہیں، عشق کیمیا
کار ہے۔ کائنات خاک ہے اس کو زرا اسی کیمیائی عشق سے بنا سکتے ہیں،
عقل ہر ایک شے کو ایک دوسرے کا غیر دکھاتی ہے، عشق کی نگہ میں
کثرت محو ہو کر وحدت جلو نما ہوتی ہے۔

یہ بحث تو طویل ہے، بیدل نے اکثر اشعار میں مختلف پیرایہ میں یہی تخیل واضح کیا ہے، آئینہ و تمثال کی نسبت کہتا ہے۔

تمثال بغیر از اثر شخص چہ دارد
خوش باش کہ خود را تو نمودن بہر اوست

یہ شعر نہایت لطیف ہے۔ ہر ایک انسان کو ”انا الموجود“ کا احساس ہے، حالانکہ بقول شیخ سعدیؒ

ایں مدعیان در طلبش بے خبر اند
کا ترا کہ خبر شد خبرش باز نیا مد

موجود تو ایک ذات واحد ہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنی موجودگی کا احساس اس اثر سے ہو رہا ہے جو وجود حقیقی کی تمثال نے ہم میں پیدا کر رکھا ہے۔ یعنی اس کی تمثال ہم ہیں اور یہ جلوہ صفات ہے۔ چونکہ وہ بالذات موجود ہے، اس لئے تمثال کو بھی ”انا الموجود“ کا دغوئے ہے۔ فوات قائم اپنی ذات میں ہے اور حق مطلق ہے۔ ہم قائم بالحق ہیں۔ اسماء کا قیام مسمیٰ سے اور صفات کا قیام موصوف سے ہے۔ اسی نظریہ کو آفتاب اور سایہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر سایہ یہ چاہے کہ آفتاب تک پہنچے تو ظاہر ہے کہ جہاں آفتاب جلوہ گر ہو گا سایہ محو ہو جائے گا۔ کثرت صفات میں ہے، ذات میں تعدد نہیں۔

صفات ہر چہ بود ذات را تعدد نیست
بفکر لالہ و گل خوں مخور بہار یکست

بہار تو ایک ہی ہے اس کی رنگینی لالہ و گل ہی میں مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے عالم کثرت کا قیام وحدت سے ہے، اگر کثرت کا اپنا وجود ذاتی بھی کوئی ہوتا ”لفسدا تا“ تو یہ نظم و نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

بیدل

ہیوستگی بحق زدو عالم بریدن است
دیدار دوست، ہستی خود را ندیدن است
پرواز سایہ جز بسر بام مہر نیست
از خود در میدان تو بحق آرمیدن است
”دو عالم“ سے مراد ”دوئی“

نظر آئے دو عالم جس کو اک عالم یہاں اختر
سمجھئے بشرِ حول ہے وہ ساری خدائی کا
بیدل نے آفتاب اور سایہ کا مضمون مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔
یہ شعر بھی لطیف ہے۔

جز ہستی مطلق ز مقید نتوان یافت
اشیاء ہمہ یکسایہ خورشید نقاب اند

سایہ دراصل وہی آفتاب ہے جس پر ایک نقاب پڑا ہے۔ اس لئے
ہستی مطلق ہی ہے جو مقید میں مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ ہستی مطلق خود تقییدات
سے پاک ہے وہ ازلی اور ابدی، مطلق ہی ہے مطلق ہی رہے گی۔ لیکن اس
شعر میں بیدل نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ تب طرح آفتاب کا سایہ اس خاکدان
پر پڑتا ہے اور لطیف شے کو ہم کثیف ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہستی
مطلق کا مشاہدہ مقید ہی میں ممکن ہے۔ خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ

حجاب و پردہ نہ دارد نگار دلکش ما
تو خود حجاب خودی حافظ از میان بر خیز

ہزار سایہ ہوں آفتاب پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ البتہ جہاں تک
انسانی مشاہدہ کا تعلق ہے ”ذردا برنا پدید کند“ ”اللہ نور السموات
والارض“ یہ نور چونکہ لطیف ہے ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن سموات اور ارض
میں مشاہدہ کر سکتے ہیں سموات اور ارض خود تاریک ہیں لیکن اسی نور سے

ہمیں اشیاء کائنات نظر آتی ہیں ابصار اس نور کے درک سے عاجز ہیں، یہ نور خود ہمارے ادراک کو نہ صرف درک کرتا ہے بلکہ اسی نور سے ہم اشیاء کائنات اور اس نور کی موجودگی کا شعور رکھتے ہیں، اس کی مثال وہی ہے جو سورہ نور میں بیان کی گئی ہے۔ ایک تاریک مکان میں نور شمع مکان اور مکان کی ہر ایک شے کو روشن کر رہا ہے۔ لیکن ہم اشیاء کو تو دیکھتے ہیں اس نور شمع کو جو اشیاء پر پڑتا ہے نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اشیاء بذاتہ روشن ہیں، اب اگر شمع مکان میں نہ ہو تو ہماری آنکھوں میں بھی نور نہ ہوگا اور تمام دنیا جہاں تاریک ہوگی۔

در علمے کہ با خود رنگ نمود مارا

بودیم آنچہ بودیم او و نمود مارا

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ”عرفت ربی بنور ربی“ میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے نور سے پہچانا، ہمیں نور اس سے رہبر بنا رہا جو رشید، بیدل کا نظریہ معرفت ہم بیان کر چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی پہچان سکتا ہے۔ اس لئے اللہ کی معرفت اللہ ہی کو ہے، اللہ کا نور اللہ کا عین ہے، اور اسی نور سے اپنی معرفت ذاتی حاصل ہے، اور یہی نور انسان میں بھی اسے خود شناس بناتا ہے، اس لئے ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ جو خود شناس ہے وہ حقیقت شناس ہے۔

علامہ محمود شبستریؒ ”گلشن راز“ میں بھی یہی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ اگر سویت کو برہنہ آئینہ سے دیکھیں تو اس میں خیرگی اور تیرگی پیدا ہوگی لیکن اگر اس کا عکس پانی میں دیکھیں تو اگرچہ ہم آفتاب کو نہیں دیکھ رہے مگر ایک کیفیت ذہن میں پیدا ہوگی۔

اگرچہ بیدل دیگر موفیاء محققین کی طرح ”وحدت الوجود“ کا نغمہ سنچ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے جس کا اسے خود اعتراف ہے اور جسے مولانا جامی

بیدل

نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ

سروحدت منطق الطیر است جامی لب بہ بند
جز سلیمانے نشاید فہم ایں گفتار را
یہ جانوروں کی بویاں کوئی سلیمان ہی ہو تو سمجھے، یہ مسئلہ علم فہم
نہیں، بہر حال

دوسرا ہر دوسرا میں اور تو کوئی نہیں
ہستی مہموم میری یا خدا کی ذات ہے
مزید بحث ہم بعض اشعار کی شرح کے تحت کرینگے۔ ان مسائل کو
شرح و بسط سے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ بیدل کا کلام سمجھنے
میں آسانی ہو، کیونکہ زیادہ تر یہی اس کے کلام کا موضوع ہے۔

اصور و فروا | بیدل کا نظریہ زمان و مکان کے بارے میں یہ ہے کہ تمام
کائنات ایک ”واقعہ واحدہ“ ہے اور ”حضرت علم

الہی“ اس خارج معدوم ہے۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ اس گفتی کو ہمارے
زمانہ کے علماء نے بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور افلاطون سے لے کر
آج تک کائنات کے بارے میں جو کچھ نظریے پیش کئے گئے ہیں ان میں
دونوں نظریے نمایاں ہیں، ایک تو یہ کہ کائنات مادی دنیا ہے، اور یہی قدیم
ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات ایک
”قلب“ عظیم کے اندر موجود ہے جس کو ”خیال“ () سے موسوم

کرتے ہیں۔ اور جسے مادہ کہتے ہیں وہ صرف خیالی صورتیں ہیں، اقل الذکر
حکماء کو مادہ پرست اور مؤخر الذکر کو سوفسطائی خیال پرست ()

کہتے ہیں۔ بحث صرف قلب () اور مادہ () پر

آرہتی ہے۔ مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ مادہ ہی سے قلب کی پیدائش واقع
ہوئی ہے، اور خیال پرست اس کے خلاف قلب کو مقدم کہتے ہیں، قلب

کا کام تصورات یا خیالات ہیں اور مادہ مکان و زمان ہی میں مشاہدہ ہوتا ہے، ان دونوں میں جو اختلاف عمل ہے اسے دیکھتے ہوئے ”ڈیکارٹ“ کے متبعین نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قلب کا جسم پیرا و جسم کا قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر یہ صحیح ہو تو کائنات میں قلب اور جسم متوازی خطوط پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں جو کہیں نہیں ملتے، ”ڈیکارٹ“ کے نظریہ ”دوئی“ کو بہتر (وغیرہ نے مسترد کر دیا۔

آئیڈیل ازم (کے نزدیک مادہ حقیقی شے نہیں۔
 بشپ ”بارکلی“ نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، کانٹ
 (۱۷۲۴ء-۱۸۰۴ء) کا نظریہ یہ ہے کہ دو حقیقتیں موجود ہیں۔
 مقدم حقیقت مادی ہے مثلاً شکل و صورت، وزن وغیرہ اور ثانوی
 حقیقت رنگ، نوائقہ وغیرہ، اول الذکر تو آفاق میں مادی دنیا کے
 اوصاف ہیں اور مؤخر الذکر احساسات یا تصورات ذہنی ہیں۔ اول الذکر
 جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان اور انسانی ذہن سے بے نیاز
 پہلے ہی موجود ہے۔ بارکلی (۱۶۸۵ء-۱۷۵۳ء) اس نظریہ کو مسترد
 کرتا ہے۔ ہیگل (۱۷۷۰ء-۱۸۳۱ء) کا نظریہ کسی حد تک کانٹ کے
 مطابق ہے۔ لیکن وہ کانٹ کے نظریہ کثرت کو وحدت میں محو کرتا ہے۔
 اس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت موجود ہے، جسے وہ ”مطلق“
 کہتا ہے، یہ مطلق نہ صرف حقیقت مجردہ ہے بلکہ عالم
 صورت بھی یہی ہے۔ تمام عالم ایک وحدت ہے جو کثرت پر محیط ہے اور
 کثرت میں اختلاف اور تضاد سب موموم ہے، یعنی ”دوئی“، غیر حقیقی
 ہے، اور یہ کہ عالم قلب ہی ہے۔

مگر ز عالم اضداد بگذری ورنہ

بہشت ہم بہتابل جہنمی دارو

بیدل

نقش نیرنگ دو عالم رقم لوح دل است

ہمہ ازماست گرایں آئینہ برما بخشد ،

ہیگل کے نظریہ کے مطابق تمام اشیاء اور ان کی شکل و صورت وغیرہ میں اختلاف محض "نسبتی امور" ہیں۔ ہم اشیاء کا تقابل امثال و اختلاف و تضاد وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہی کچھ کسی شے کی نسبت ہمارا مبلغ علم ہے۔ لیکن یہ تمام امور غیر حقیقی ہیں، اور یہی کیفیت ہمارے تصورات اور عقائد کی بھی ہے۔ جسے ہم "حق" کہتے ہیں اس کا تصور "کذب" کے تصور سے وابستہ ہے، جسے ہم حقیقی کہتے ہیں اس کی ضد غیر حقیقی بھی ہمارے پیش نظر ہوتی ہے، اگرچہ یہ دونوں ذہنی امور ہیں لیکن جسے ہم امر واقعہ سے تعبیر کرتے ہیں اس کی موجودگی واجب ہے، اور وہ قائم بالذات ہونا چاہئے نہ کہ اس کی ہستی کا انحصار کسی دوسرے امر واقعہ پر ہو، اگر ایسی صورت ہو یعنی حقائق کی اکثریت ہو اور سب قائم بالذات ہوں تو ہیگل کا نظریہ باطل ہوگا، مگر ہیگل اس نظریہ ہی کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم صرف "واقعہ واحد" ہے جسے وہ مطلق سے موسوم کرتا ہے، بیدل اور تمام صوفیاء و محققین کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم واقعہ واحد ہے اور یہ کہ واقعات جو ہم مشاہدہ کرتے ہیں نسبتی امور ہیں اور اس واقعہ واحد سے وابستہ ہیں یعنی حق مطلق قائم بالذات ہے اور کائنات قائم بالحق ہے خود قائم بالذات نہیں، اس نظریہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے مسئلہ تجدد امثال کو پیش نظر رکھنا چاہئے جس پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے بحث کریں گے، اور اسی کے تحت زمان و مکان و امور و افراد اور دنیا و عقبی وغیرہ مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت تو ہر ایک اہل نظر پر منکشف ہے کہ

تجدد امثال

کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے پر تغیرات

واقع ہوتے ہیں، اس انکشاف کے بعد محققین نے ان تغیرات کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ عالم میں قوانین فطرت آفرینش سے سرگرم عمل ہیں اور انہی سے نظامِ عالم قائم ہے۔ یہ قوانین خود نہیں بدلتے اور ناقابلِ تبدیل و تحویل ہیں لیکن تمام تغیرات انہی کے پیدا کردہ ہیں۔ ان تغیرات کی وجہ سے تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے ارتقائی مرحلے طے کرتی چلی آ رہی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تجدود امثال کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک شے کی امثال بدل رہی ہیں۔ خود یہ شے یا اس کی حقیقت یا ماہیت جو کچھ بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے نہیں بدلتی۔ ہر ایک شے کی صورت ہی بدلتی ہے، اس لئے ہر ایک شے تغیرات کے زیر اثر ”خلقِ جدید“ میں رونما ہوتی ہے۔ صورت نہ صرف ظاہری ہے بلکہ ذہنی بھی ہے یعنی قانونِ تجدود کائنات خارجی اور ذہنی دونوں صورتوں پر مؤثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علوم و فنون بھی بدلتے رہتے ہیں۔

”ہربرٹ سپنسر“ کہتا ہے کہ اول تو کسی ایک زمانہ میں بھی حکماء کا ایک نظریہ پر اتفاق کبھی نہیں ہوا اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی ہو تو واجب ہے کہ خلفِ سلف سے اختلاف کرے اگر ایسا نہ کرے گا تو ذہنی ارتقاء رک جائے گا۔ قومیں جو رجعت پسند ہوتی ہیں اور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتی ہیں جس کو اصطلاح میں تعادل کہتے ہیں ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور وہ دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔ ارشادِ قرآن ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو نہ بدلے اور جب نہیں بدلتی تو اس کے برے دن آجاتے ہیں جو ٹالے سے نہیں ٹلتے“

۴۷۵-۴۷۰ قبل

مشہور یونانی فلسفی ہرکلیٹس

از مسیح) کا نظریہ یہ تھا کہ ہر ایک شے متغیر اور متبدل ہو رہی ہے۔ ایک

بیدل

دوسرے فلسفی پر میناٹڈ (۵۰۰ قبل از مسیح) کا نظریہ یہ تھا کہ

اگرچہ اجزاء پر تغیرات واقع ہوتے مشاہدہ ہو رہے ہیں مگر کائنات کلی جوں کی توں ہے۔ یعنی نہ تو فوراً بصر بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے اور تغیرات محض فریب نظر ہیں، فریب نظر کی مثال ”زیتو“ (۱) نے یہ پیش کی ہے

کہ فرض کرو ایک تیرکمان سے نکلا، ہدف تک اس کو کچھ عرصہ درکار ہے۔ اس عرصہ کے لمحات میں تیر کو پرواز کرتا ہوا تصور کرو ہر ایک لمحہ میں تیر کسی خاص مقام پر ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہئے تو وہ متحرک نہیں اس لئے حرکت محض فریب نظر ہے۔ اسی قسم کے سو فسطائی دلائل بہت ہیں افلاطون نے اپنا نظریہ ”عالم مثال“ (۲) اپنی دو

نظریوں پر قائم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں نظریے صحیح ہیں، اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ فرق صرف دونوں محققین کی حد نظر کا ہے۔ جہاں تک محسوسات کا تعلق ہے تغیرات بالبداهت ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ اور جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں دوسرا نظریہ بھی صحیح ہے کہ حقیقت مطلق ناقابل تغیر و تبدیل ہے۔

ہمارے زمانہ میں ارتقا پر جو کچھ حکماء نے لکھا ہے اس سے ”تجدد امثال“ کی قطعی تائیدی شہادت ملتی ہے، لیکن مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ کل کائنات ایک عظیم الشان مشین کی طرح ہے جس کے پُرزے اور ان کا عمل ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں اس لئے اس نظریہ کو میکینٹک (۳) کہتے ہیں کسی وقت کسی نے یا اتفاقاً کسی سبب سے

اس میں حرکت پیدا کر دی یا پیدا ہو گئی۔ اور اب یہ کل اور اس کل کے پُرزے خود بخود سرگرم عمل ہیں یہ وہ نظریہ ہے جس کی پُر زور مخالفت ”برگسان“ (۴) نے ہمارے زمانہ میں کی، مادہ پرست تو یہ

کہتے ہیں کہ زندگی مادہ ہی کا خاصہ ہے۔ برگسان یہ کہتا ہے کہ مادہ زندگی

تجدد امثال

۲۵۳

کی پیداوار ہے۔ برگسان نے حیاتیات (اور نفسیات) پر اپنے دلائل کی بنیاد استوار کی ہے۔

ہم نے ان حکماء کے نظریوں کا حوالہ اس لئے دیا ہے تاکہ بقول بیدل معلوم ہو کہ ”کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست“ ہمارے زمانہ میں فلسفہ یعنی نظری حکمت کے ساتھ سائنس یعنی علمی حکمت نے ایک انقلاب عظیم ذہن انسانی میں پیدا کیا اور مادہ اب صرف ایک قوت (اصل میں رہ گیا ہے۔ اور اس قوت کی حرارت کی کمی بیشی سے مختلف مادی صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ قوت بھی محدود ہے۔ اور اس کی تقسیم غیر مساوی سے تغیرات وغیرہ واقع ہو رہے ہیں اور یہ کہ اس قوت کا رجحان مساوی تقسیم کی طرف ہے۔ اور جب یہ اعتدال پر آجائے گی تو کائنات میں حرکت مفقود ہو جائے گی یعنی ایک قسم کا جمود مطلق واقعہ ہو گا۔ اسے کہتے ہیں :-

(حکماء اسلام میں سے غالباً سب سے پہلے محی الدین شیخ اکبر نے اصطلاح تجدد امثال قرآن کی بعض آیات سے اخذ کی (واذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلاً- ۲۹: ۲۰) نیز (افعینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جدید- ۲۶: ۱۵) چنانچہ قصوص الحکم میں اپنی کتاب تجلیات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ میں نے کشف میں اکابر صوفیہ جنید بغدادی وغیرہ کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہ تھا، میں نے آیہ (او تو ابہ متشابہا) کی تفسیر کرتے ہوئے انھیں قانون تجدد امثال سے آگاہ کیا۔ شیخ اکبر یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف اس دنیوی زندگی میں بلکہ بعد ممات بھی زیر اثر تجدد امثال ارتقاء جاری ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج اہم ہیں۔

بیدل

(۱) جہان کبھی کہنہ و فرسودہ نہیں ہوتا ہر آن اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

نوی بیدل از سازا مکان رفت نشد کہنہ تجدید ایجاد با
در کار گہ تجدید یکست چمن سازست
تقویم بہار ایں جا پارینہ نمی باشد
تجدید کے کارخانہ میں جو کچھ بھی بنتا ہے نیا ہی بنتا ہے اس چمن پر
ہمیشہ بہار کی رونق رہتی ہے۔

اے میوہ نردوز در رس کہنہ مشو
باغ طربی نہ خار و خس کہنہ مشو
ہنگامہ آثار و تجدید گرم است

اے معنی تازہ پیش کس کہنہ مشو
میوہ پختہ ہو کر نہ رو پڑ جاتا ہے مگر نچنگی سے مراد کہنگی نہیں اور نہ وہ خار و
خس میں بدلتا ہے اس کی حقیقت ہمیشہ تروتازہ ہے۔ تجدید کے زیر اثر وہ کبھی
کہنہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بظاہر کہنگی کے آثار محسوس ہوتے ہیں مگر تو خود باغ
طرب ہے اور ہمیشہ تروتازہ ہے۔

(۲) چونکہ عالم کی امثال بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے عالم ہر آن فنا ہوتا اور
ہر آن اس کا مثل ظہور میں آتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ہر آن خالق اور
مبدی اور بدیع اور مصور و غیر ہم ہے، (کل یوم ہونی شان)
(۳) تجدید میں ارتقاء لا محدود ہے۔ (اجر غیر مہنون)

ز کار گاہ تجدید عیاں نہ شد بیدل
جز ایں قدر کہے ایں جا بانہا نہ رسید
اے بے دل کار گاہ تجدید سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس جگہ
کوئی شخص انتہا کو نہ پہنچا۔

۲۵۵ تجد و امثال

(۴) ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر ایک شے کا آخر اول سے بہتر ہے۔
(الآخرۃ خیر و البقی)

(۵) تجد و میں رجعت یعنی ہستی میں تکرار نہیں۔

تکرار مبنیٰ بر اوراق تجد و تقویم نفس را خط پارینہ نباشد
جس طرح ہر ایک سانس ایک نیا ہے اور جو گزر گیا وہ دوبارہ نہیں
آتا، اسی سے رشتہ زندگی وابستہ ہے، اسی طرح دفتر ہستی کا جو ورق الٹ
گیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، وہ کبھی گردش کرتا ہوا دوبارہ نہ دہرایا ہوگا
نشست و برخاست نہی گردانہ سپند مکرر
چہ ممکن است کہ نقش کسے دوبار نشیند

جس طرح سپند کا دانہ ایک دفعہ ہی بھر میں جل کر آواز دیتا ہے اور پھر
ہمیشہ کے لئے خاموش ہوتا ہے اسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی نقش دوبارہ ثبت
ہو سکے۔ ”برگسان“ نے لکھا ہے کہ فرض کرو آپ غیر متحرک ساکن شے کو دیکھ
رہے ہیں۔ یہ شے ایک ہی جگہ پڑی رہی اور آپ اسے ایک ہی جانب سے
ایک ہی زاویہ نگاہ سے اور ایک ہی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کا
تصور لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہے گا۔ میرا حافظہ بھی موجود ہے جو تذکرہ سے گزشتہ
تصویرات کو سامنے لا رہا ہے، میری قلبی حالت جوں جوں جاوہ وقت پر
گامزن ہوتی جائے گی، ان تصویرات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ گو وہ
ایک دوسرے کے مشابہ اس حد تک ہوں کہ ان میں امتیاز پیدا کرنا
مشکل ہے، مگر ہر ایک تصویر ایک دوسرے کا غیر ہے۔ ”برگسان“ کے
لفظوں میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم ”بلا توقف، متغیر، مورہ“ ہیں، خواہ یہ
اشیاء خارجی کے تصویرات ہوں یا ہمارے قوی باطنی یا خواہشات یا
جذبات یا ارادہ وغیرہ ہو اور جسے حال سے موسوم کیا جاتا ہے وہ صرف
تغییرات کا دوسرا نام ہے۔ احساس ہو یا خیال یا ارادہ وغیرہ مسلسل معرض

تغیر میں ہے اور اگر یہ رورک جائے تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے ایک حالت سے گزر کر دوسری حالت میں آنا یا ایک ہی حالت میں مسلسل رہنا ایک ہی بات ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں، بات صرف اتنی ہے جسے شیخ اکبر نے واضح کیا ہے کہ ہمیں تغیرات کا فوری احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ نہایت لطیف اور ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں مگر یہی وجہ ہے کہ ہم باوجود ان تغیرات کے یقین کرتے ہیں کہ ہم عمر کے ہر ایک دور میں ایک ہی ہیں۔

جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ :-

مکرر رونما ہوتا نہیں ہے کوئی ہستی میں
مثال اس آئینہ خانہ میں ممکن ہو تو پیدا کر
نقش آئینے میں پڑے اور مٹ گئے

اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا
(امیر مینائی)

تو اس کے نتائج پر جو بہت دور رس ہیں غور کرنا چاہئے۔ بیدل اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ”بیدل“ دوبارہ نہیں ہوگا، ایک رباعی میں کہتا ہے کہ ہزار کوثر و تسنیم نثار کروں اگر بیدل دوبارہ ہو اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہئے کہ بیدل حیات بعد ممات کا قائل نہیں، وہ خود کہتا ہے کہ

صورت ایں انجمن گر محو شد پروا کراست

خانہ نقاش ما نقش دگر خواہد نمود

اگر یہ انجمن جہاں ہم صورت دو چار بیٹھے ہیں درہم برہم ہو جائے تو کیا پرواہ ہے وہی نقاش جس نے اس انجمن کا نقشہ کھینچا اور نقش بنا دے گا۔

پیکر خاکی مارا برہ سبیل فن

یاد بر باد ی ازاں نیست کہ معمار ہست

میرے خاکی جسم کو سیلاب اگر بہا کر لے جائے اور ضرور لے جائے گا تو مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ میں معدوم ہو جاؤں گا۔ اس لئے کہ معمار موجود ہے۔ جس نے پہلے میرا خاکی جسم بنایا وہی جس صورت میں چاہے گا اسے تعمیر کرے گا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میرا دوبارہ پیدا نہ ہو گا خواہ کچھ اور ہو غور کرنا چاہئے کہ انسانی صورت میں پیدائش سے لے کر موت تک ہم کتنی صورتیں بدل چکے ہیں، موت کے بعد ہم ان میں سے کس پسندیدہ صورت میں رونما ہوں گے؟ بیدل نے مزید تشریح شہادت ارتقا میں کی ہے جس کا تذکرہ شہنوی ”عرفان“ کے تحت ہم کر چکے ہیں۔ ”طہین“ یعنی جنادات سے ترقی کرتے ہوئے ہم انسان بنے، اگر ارتقاء کا یہ سلسلہ جاری رہے اور جاری ہے تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ بہتر صورت میں رونما ہونگے۔ اس تحقیق کے ضمن میں وہ کسی شخصیت کی آمد ثانی کا بھی قائل نہیں، چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

باز آمدن مسیح و مہدی ایں جا از تجربہ مزاج اعیان دور است

مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ

اور انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے (اقبال)

اہل کتاب نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔

اور عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح کے ساتھ مہدی کا بھی ظہور دوبارہ ہو گا، تحقیق سے بہت بعید ہے۔ اس لئے کہ ہستی میں تکرار نہیں ہے۔

مہدی خلافت عباسیہ کے آٹھویں تاجدار معتمد باللہ کے ”مہدی“ ”سامرا“ (سمرن رائے) کے ایک نماز میں پوشیدہ ہو گئے تھے، اور ان کی آمد ثانی یا ظہور ثانی کا انتظار سنی اور شیعہ دونوں کو ہے۔ مہدی شیعہ کے بارہویں

بیدل

امام غائب ہیں۔

انسان روزانہ اپنے ہم جنس انسانوں کو مرنے اور اسی طرح خاک میں ملتا دیکھ رہا ہے جس طرح دیگر حیوانات لیکن اس یقینی واقعہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی عمر ابد کا طالب ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ مرنا ایک روز ضرور ہے پھر بھی چاہتا ہے کہ میں نہیں تو میرا نام ہی سہی یہی زندہ رہے۔

بہر کہ می نگرم طالب دوام و بقا ست

مدار خلق بفکر محال می گذرد

میں ہر ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ یہی چاہتا ہے کہ دائمی زندگی ہو، بات یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی کا مدار ہی فکر محال پر ہے علاوہ ازیں خضر کی کہانی لوگوں کے اندر ہے۔

تجدد پر نشان و غرہ عمر ابد بودن

نیاز خضر کن را ہے کہ در صحرائے بنگا فتد

جب یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک شے پر تغیرات واقع ہو رہے ہیں اور کسی شے کو کسی ایک حالت پر بقا نہیں تو ”عمر ابد“ کا خیال خام نختہ کرنا انتہائی بے بصیرتی ہے۔ مناسب ہے کہ اس ”دردِ خیال“ کو جو بھنگ کے جنگل میں پیدا ہوتا ہے حضرت خضر کی نذر کر دو یعنی اس طرح بے پر کی اڑانا بھنگڑوں ہی کی ذہنیت کے مناسب ہے۔ لفظ ”نیاز“ نے خاص لطف پیدا کر دیا ضعف الاعتقاد خضر کے نام پر نذر و نیاز بھی دیتے ہیں۔

تا کے زخلق پردہ برو انگنی چو خضر

مردن بہ از خجالت بسیار زیستن

کب تک تو خلق سے چھپتا پھرے گا۔ خضر کی طرح چہرہ پر نقاب ڈالے گا۔ درازی عمر بھی شرمسار ہی ہے اس سے بہتر تو مرنا ہی ہے، جو شخص شرمسار ہو وہ منہ چھپاتا پھرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسی ہی شرمندگی خضر۔

کو بھی لاحق ہے ایہ تخیل غالب نے اس طرح ادا کیا۔

ہیں زندہ ہم کہ ہوئے روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
اس تحقیق کے تحت بیدل قاضی جمال کے فتاوے کی نسبت بھی یہی کہتا
ہے کہ احکام شرعیہ حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات ہمیشہ بدلتے ہیں
خواہ ذہنی ہوں یا خارجی اس لئے ان کے مناسب احکام بھی بدلتے چاہئیں۔
نئے نئے حالات کے مناسب نئے احکام وضع ہونے چاہئیں یعنی ہمیں اپنی
ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب بدلنا چاہئے۔ حق راقا تہی جمال نتواں
نہید۔

بیدل کا دوسرا نظریہ تجدد امثال کے تحت یہ ہے کہ امروز و فردا اور دنیا
و عقبیٰ اور زمان و مکان سب اعتباری یا نسبی امور ہیں۔ اور غیر حقیقی ہیں۔
اصل میں کائنات واقعہ واحد ہے اور حال ہی حال موجود ہے یہ صرف
تخیرات ہیں جن کو ہم ماضی و مستقبل سے موسوم کرتے ہیں چند اشعار اس
موضوع پر ملاحظہ ہوں۔

نہ دی گذشت نہ فردا بہ پیش می آمد

تجدد من و مائتات امت آغاز است

غبار ماضی و مستقبل از حال تو می خیزد

در امروز است گم گروا شگافی دی و فردا را

دامن حال سے گرد جھاڑیں تو کچھ تو ماضی اور کچھ مستقبل کی صورت
اختیار کرے گی، جسے تو کل گذشتہ اور آئندہ کہتا ہے دونوں حال ہی میں
پوشیدہ ہیں۔ جب تو ”آج“ کو کھول کر دیکھے گا تو دونوں ظاہر ہو جائیں گے،
اسی تخیل کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ
غم مستقبل و ماضی است کا نرا حال می نامی
نقابے درمیاں است از غبارش پیش و پس ایں جا

بیدل

جب غبار ہمارے آگے چھپے اُڑ رہا ہو اور ہم اس میں گھرے ہوں تو لاچار
اس خیال سے کہ یہ خاک دھول ہماری آنکھوں میں نہ پڑے یا منہ میں نہ جائے
ہم چہرہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ذکر ماضی اور فکر مستقبل کی ہے کہ دونوں
گرد و غبار ہیں جو ہمارے حال پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا حال بھی
غبار آلودہ ہو کر رہ گیا، ہماری عمر یعنی حال اسی ذکر ماضی و فکر مستقبل میں
گزر جاتا ہے اس لئے حال بھی ضائع ہو رہا ہے۔

یہ فریبِ نسیہ نقدِ خرمیہا با ختم
ساغر امروز با بدستی فردا شکست

کہتے ہیں کہ نو نقد نہ تیرا اودھار، مگر ہم اودھار جو متوقع ہے کہ کل
ملیگا اس طرح کھا کر بیٹھ رہے کہ جو نقد خرمی تھا وہ بھی ضائع ہو گیا اور
اس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا۔ یہ کہنے کہ "ساغر امروز" ہاتھ میں تھا اور اسمیں
بندرا استعداد یا ظرف، بادہ خوشگوار بھی تھا لیکن بن پیسے فردا کا نشہ اتنا پڑھا
کہ ساغر امروز ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

جنوں بخودی پیش برد سعی اف
کہ کار عالم امروز نذر سردا کرد

دور از کار توقعات بھی مایخو لیا ہے کہ جو کام آج کا ہے اسے کل پُر اٹھا
رکھا۔

بفکر نسیہ موبوم نقد نیز نماند
میریں در غم مستقبل چه حال گذشت

اودھار کی اُمید پر جو ایک امر موبوم تھا جو کچھ ہاتھ میں نقد تھا وہ بھی
نہ رہا فکر مستقبل کے بارہ میں کچھ نہ پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری یعنی حال اسی غم میں
گزر گیا۔ چونکہ "حال" ہی اصل شے ہے اس لئے

درہائے فردوس و ابود امروز از بے دماغی نفتم سردا

فردوس کے دروازے آج کھلے ہوئے ہیں لیکن ہماری بے دماغی کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں کل اس میں داخل ہوں گے۔

نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا
تو کز خود غافل صرف عدم کن دور بینی را

نشاط و بہار و بہشت و نگار جو آج یہاں موجود ہیں اگر ان سے چشم پوشی کی جائے تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے آپ سے غافل ہیں اور اس کا فائدہ نہیں اٹھاتے اور اُمید موہوم پر یہ بھی ضائع کر رہے ہیں، یہ دور بینی اسی وقت ممکن ہے جب نزدیک بینی نہ ہو اس لئے یہ سمجھ لو جس شے کی توقع ہے وہ محض موہوم و معدوم ہے۔

ز بس بردہ است افسون اہل از خود جہانے را
گرازاں روز می پرسی ز فردا گفتگو دارد

یہی دور از کار توقعات ہیں جس نے ایک دنیا کو موجودہ حالات سے غافل بنا رکھا ہے۔ اگر کسی سے امروز یعنی آج کے حالات دریافت کرو تو کل کی باتیں سنائے گا۔

بیدل کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ تم اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے اور اسی جگہ ایک عمر بسر کرنی ہے آخر اس کی بھی کچھ غرض و غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے، بلکہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی مہیا کر رکھا ہے۔ نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا، لیکن ہم نے اس جنت کو دوزخ بنا رکھا ہے۔

داغ نیز نگیم تاب آتش دیگر کراست

دوزخ امروز ما اندیشہ فردا بس است

یہ اندیشہ فردا جو ہمیں آج لاحق ہے ہمارے جلنے کے لئے یہی آگ کافی ہے، اس کے علاوہ اگر کوئی اور نار جہنم بھی ہو تو کون برداشت کر سکتا ہے۔

بیدل

بیدل نے ”نکات“ اور ”چہار عنصر“ میں لکھا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی آسائش کا
آپ دشمن ہے۔ اگر سفر میں ہے تو وطن کا خیال اور اگر وطن میں ہے تو سفر کی
خواہش اسے چین لینے نہیں دیتی۔

تلخ است عیش امروز از گشگوئے فردا
در خانہ کہ مائیم ہمسایہ شور و آرد
اسی طرح :-

دُنیا الم غفلت و عقبیٰ غم اعمال
آسودگی از مادہ جہاں فاعلہ دارد

دنیا میں غفلت کا اور اسی دنیا میں رہتے ہوئے عقبیٰ کا غم کھائے جاتا
ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ جسے آسودگی کہتے ہیں وہ ہم سے اتنی دور ہے
جتنا دو جہان کا فاصلہ نہ دنیا میں چین ملا، اور نہ عقبیٰ میں آسودگی کی توقع
ہے وہاں بھی اعمال کی سزا و جزا ایسی ہی ہے جیسی اس دنیا میں۔

تامنیری رمز این معنی نگر دور و شدت

کا شنائی زندگی از عافیت بیگانہ است

جب تک تو مر کر اس زندگی کو خیر باد نہیں کہتا تب تک یہ راز تجھ پر
منکشف نہ ہوگا کہ اس زندگی سے آشنائی عافیت سے بیگانگی ہے۔

فلسفہ ”آزار“ بھی بیدل اسی تخیل سے اخذ کرتا ہے کہ

چہ اوج سپہ و چہ زیر زمین بہر جا توئی جلے آرام نیست
ذوق کہتا ہے کہ

خواہ پھرتا ہے فلک یا خواہ پھرتی ہے زمین

پر ہمارے واسطے یاں منزلِ راست نہیں

مطلبے گر بود از ہستی ہمیں آزار بود

ورنہ در کج عدم آسود بسیار بود

”عدم“ نام ہے بے شعوری کا، بے علمی کا، بے حسی کا، ورنہ جسے عدم حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا تصور ایسا ہی ”محال“ ہے جیسے خود ”محال“ کا۔ یعنی انسانی ذہن میں عدم اور محال کا تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان عدم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی انسان کے ذہن میں آئے خواہ وہ محض وہم ہی کیوں نہ ہو ”ممکن“ ہے اور اگر مناسب اسباب کا علم ہو تو خارج میں اس کا ظہور بھی ممکن ہے۔ پیدائش سے پیشتر ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کیا تھے، اب ہمیں اس امر کا شعور و علم و احساس ہے کہ ہم ہیں۔ لیکن اس شعور ہستی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ثابت ہے کہ بت کامل آسودگی کہتے ہیں وہ اسی بے شعوری میں تھی شعور ہستی شعور آزاری ہے جو بالبدایت ثابت شدہ واقعہ ہے۔

راحت دہیں قلم و از آثارِ بوش نیست
خوابیدہ است اگر کسے آرام داشتہ است

امروز فردا اور دنیا و عقبیٰ اور بہشت و دوزخ ایسا موضوع ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے چونکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ یہ صرف تغیرات ہیں جن کو ہم دی و فردا سے موسوم کرتے ہیں ورنہ حال اصل شے ہے، اور کائنات واقعہ واحد ہے۔ یہ تغیرات یا تجدد امثال ہے اور اسی میں ہم مسلسل ارتقاء مشاہدہ کر رہے ہیں جس کی انتہا نہیں، کائنات کھلوتا نہیں کہ بچوں کا دل پہلانے کے لئے بنا اور جب چاہا تو پھوڑ کر رکھ دیا۔ یہی کائنات بیشمار تغیرات کے بعد ہم موجودہ صورت میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہی ارض و سموات قانون تجدد امثال کے تحت ”غیر السبلوات والارض“ بدل کر ہو جائیں گے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں کہ آفاق میں نظر کر ”ہر روز قیامت است و ہر شب مردن“ اس لئے وہ اس عقیدہ کا مضحکہ اڑاتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قیامت وہ وقت ہے جب کل

بیدل

کائنات فنا ہو جائے گی اور ایک ذات حق تعالیٰ کے سوا جیسی کہ وہ
 انہی ہے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور صنعت
 کاملہ سے بہت بعید ہے کہ ایک شے بنائے اور اسے پھر معدوم کر دے، پھر
 ایسی شے ”عبث“ ہوگی ”باطل“ ہوگی لیکن ”ربنا ما خلقت هذا باطلا“
 ”باطل از باطل بروید حق ز حق“ ذات باری تعالیٰ حق ہے وہ حق پیدا
 کرتا ہے اللہ تعالیٰ باطل پیدا نہیں فرماتا، ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ باطل
 نہ تو کچھ پیدا کر سکتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو دہرا سکتا ہے، (ما یبدی الباطل
 وما یعینہ ۲۲: ۱۶) اللہ تعالیٰ نے کائنات خلق فرمائی تو یہ باطل نہیں اور
 اگر باطل ہوتی تو اس کی پیدائش ایک دفعہ ہی پیدا ہو کر ختم ہو جاتی،
 لیکن مشاہدہ ہو رہا ہے کہ یہ پیدائش تجدد و امثال کے تحت ہر آن نئی
 صورت میں رونما ہوتی ہے۔

اسی تجدد و امثال میں ”خلق جدید“ اور ”قیامت“
 کا راز مضمر ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ لوگوں کا بھی عجیب
 حال ہے کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور ما سوائے جو کچھ ہے باطل ہے۔
 انیسہ خلق طرفہ جو ہر دارد

صورت دیگر است و عرض دیگر دارد

می گویند او حق است و ما باطل محض

از باطل حرف حق کہ باور دارد

جب ہم باطل ہیں تو ہمارا قول بھی باطل ہے۔ اس لئے ہمارا یہ
 دعوے کہ حق تعالیٰ کی ذات حق ہے قول باطل ہے، حق ہی حق پر
 شاہد ہے۔

مجاز اندیشیت فہم حقیقت را نمی شاید
 محال است این کہ حق از عالم باطل شود پیدا

مجاز کا تصور حقیقت شناسی کے مناسب نہیں ہے، یہ ناممکن ہے کہ عالم باطل سے حق کا ظہور ہو، حق کا ظہور حق سے ہی ہوگا۔

چہ امکان است گرد غیر ازیں منزل شود پیدا

ہماں لیلی شود بے پردہ تا محمل شود پیدا

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس منزل و حدت پر غیر ناقہ سوار ہو اور ”غبار غیریت“ اُڑ رہا ہو اگر محمل نظر آ رہا ہے تو یہ سمجھو کہ وہی لیلی بے پردہ ہے، یعنی ذات ہی جلوہ صفات میں رونما ہو رہی ہے۔

برون لفظ محال است جلوہ معنی

ہماں ز کسوت اسما طلب مسئلی را

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم حقیقت مجرودہ یا لیلی کو بے پردہ نہیں دیکھ سکتے، یہ حسن صفات یا اسماء ہے یا استعارہ میں ”محمل“ ہے اسی میں لیلی بھی نظر آ رہی ہے، جیسے الفاظ کی صورت میں معنی۔

ندارد حسن یکتائی ز جیب غیر جو شیدن

حق از حق جلوہ گر شد باطل از باطل برآید

یہ تشریح ذہن نشین کرنے کے بعد ماضی و حال و مستقبل اور دنیا و

عقبیٰ اور دوزخ و بہشت پر بیدل کا نظریہ ملاحظہ ہو۔

ہوس چوں نار ساشد نیہ نقد حال می گردد

اٹل را رشتہ کوتہ ساز و عقبیٰ گیر دنیا را

محض ہوس، آرزو، تمنائے تو مدعا حاصل نہیں ہوتا، اور کبھی نہیں

ہوتا اس لئے جب ہماری آرزو نار سار ہی یعنی مقصد حاصل نہ ہو تو

یہ کہہ کر دل کو طفل تسلی دی کہ دنیا میں نہیں تو عقبیٰ میں حاصل ہوگا۔ نقد

حال بھی اودھار بن گیا۔ اگر تم نقد حال سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اسی

دنیا کو عقبیٰ فرض کر لو۔ اور عاقبت کی امید پر اودھار کھا کر نہ بیٹھو۔

بیدل

خلق در خاک انتظار صبح محشر می کشند،
 زندگی با مردگان در گور با ہم رفتہ است
 خلق مگر بھی قبر میں صبح محشر کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے جو
 لوگ مر گئے وہ زندگی کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ انتظار کسی شے کا
 زندگی کے ساتھ ہوتا ہے، حالانکہ موت و حیات دو متضاد امور ہیں
 اور اجتماع اضداد محال ہے۔

در کفن باقیست احرام قیامت بستنت
 مگر تو بنشستی نخواہد فتنت ات، ازہ پانشت

کفن اور احرام میں مشابہت ہے، عرفات کے میدان میں حج کی
 تقریب پر ایک ہی چادر میں ہر ایک شخص ملبوس ہوتا ہے، اسی طرح کفن
 کی صورت ہے، مگر انسان قبر میں آسودہ رہتا ہے، مگر آسودگی کہاں
 یہ کفن جس میں کہ تو اپنا بٹوہ ہے گویا احرام ہے حج قیامت کا، تو خواہ بجائے
 خود آرام سے بیٹھ گیا ہے مگر یہ فتنہ قیامت کہاں چین سے تجھے بیٹھنے دے گا
 نادریں محفل تامل بر بساط حال رخت

ساغر ماضی بگردش رنگ، استقبال رخت

ورنہ اس جا حال کو مستقبل و ماضی کدام

قلقل و ہمی است کز مینائی قبل و قال رخت

اس محفل ہستی میں تذکر و تفکر ہی کا کرشمہ ہے کہ حالات جو ہم پر گزر
 چکے ہیں یا مشاہدہ کر چکے ہیں وہ ماضی سے موسوم کرتے ہیں یہی حالات و
 واقعات ہیں جن کا نشہ ساغر ماضی میں ہے اسی پیمانہ ماضی کی گردش سے
 نشہ مستقبل پیدا ہوتا ہے، یعنی حال یا واقعہ ایک ہی ہے، نشہ بادہ ایک
 ہی ہے۔ مگر ایک دو گردش میں نام مختلف ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس بزم
 ہستی میں حال اور ماضی اور مستقبل کہاں ہیں، محض نسبتی امور ہیں مینائی

قیل و قال سے قتل و ہم کا شور بلند ہو رہا ہے۔ یعنی فہم و تہم اور کہنے سننے میں یہ باتیں آرہی ہیں۔ ورنہ زمان و مکان سب موبہوم باتیں ہیں۔

در عدم نارفہ متواں بسوی ہستی یا فتن
فرصت آں بجا رفت و ایں با طرح ماہ سال نخت

غور کرنا چاہئے کہ حال میں جو فرصت ہمیں میسر ہے وہ تو ماضی میں معدوم اور مستقبل میں موبہوم ہو کر رہ گئی، اس لئے ہستی جو فرصت ہی کا دوسرا نام ہے عدم میں چلی گئی اسے تلاش کرنا ہو تو عدم ہی میں ملے گی، لیکن ہم اسے ماہ و سال میں ماپ رہے ہیں جو گزر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے ایک اور بات بھی پیدا کی ہے کہ جسے وجود حقیقی کہتے ہیں وہ اس بزم ہستی میں نہیں، تو عدم باش وجود ایں جا نیست، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں اور مزید تشریح مناسب مقام پر کی جائے گی۔

کلفت فردا ہماں دی شمر آزار باش

آنچه بتفصیل آں فتنے مجلیست

اس شعر میں بھی یہی واضح کیا گیا ہے کہ جسے تو ”فردا“ سمجھ رہا ہے وہ دراصل ”دی“ ہی ہے یعنی کل جو آنے والا ہے یا گزر چکا ہے ایک ہی شے ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جو گزر چکا وہ تو مفصل مشاہدہ کر چکا ہے اسی کا اجمال ”فردا“ ہے جس کلفت کا تو مفصل تجزیہ کر چکا ہے اب اس غلط فہمی میں نہ الجھ کہ وہی پھر آئندہ رونما ہوگی اس لئے خوش رہنا چاہئے، کہ رسیدہ بود بلائے وے بخیر گذشت، لیکن تجھے جو کل کا غم کھائے جاتا ہے یہ محض وہم ہے۔

پیش ازاں کزو ہم دی آئینہ زنگاری کند

در نظر بارو شن است امروز فردا نیکہ نیست

اس سے پیشتر کہ گزرے ہوئے کل کا وہم تیرے آئینہ خاطر کو مکرر

بیدل

کرے، اسی آئینہ دیدہ و دل میں آج وہ حالات تجھ پر روشن ہیں جو ”دی“ یعنی ماضی میں محو ہو رہے ہیں، اور جوں جوں تجھ پر حال میں منکشف ہو رہے ہیں یہ سمجھ کہ تجھ پر فردا روشن ہو رہا ہے جو ماضی میں محو ہو گیا۔ اس لئے قطع نظر ”دی و فردا“ تجھے تو صرف حال ہی کا شعور ہے، اور جو حالات تجھ پر وارد ہو رہے ہیں وہ ”فردا“ سے آکر ”دی“ میں گم ہو جاتے ہیں، اس لئے ”فردا“ یعنی کل جو آنے والا ہے یہ سمجھ کہ حال میں محو ہو گیا اور اب فردا نیست ہے، خواہد امروز شدن آنچہ بفکرت فردا است۔

ہر جلوہ کہ در پیش است گردش بقفا دریا

فردائی ایں عالم بے دینہ نمی باشد

ہر ایک جلوہ جو تیرے روبرو ہے یا پیش آنے والا ہے یہ سمجھ کہ گردش کرتا ہوا تیرے پیچھے چلا جائے گا یعنی فردا ”دی“ ہو جائے گا۔ اس عالم ہستی میں کوئی ”فردا“ بغیر ”دی“ نہیں بلکہ فردا ہی دی ہے۔

ہر کجارتتم ز رفتن نیم گام از خود بروں

صد قیامت رفت و امروز مرا فردا نکرد

زمان و مکان، ماضی و مستقبل، غرض جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے،

ہماری ”خودی“ کے ساتھ ہی ہو رہا ہے، اور یہ خودی () کہیں ایک

آدھ قدم نہ گئی نہ آئی۔ فردا حال اور حال ماضی میں بدلتا رہا اور ہم ویسے

کے ویسے اپنی جگہ پر رہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے

کہ جسے فردا کہتے ہیں اس کا تصور تو محال ہے، ہم ”ماضی“ پر اسے قیاس

کرتے ہیں جو گزشتہ ”حال“ ہے، لیکن جسے فردا خیال کرتے ہیں وہ حال

ہی میں رونما ہوتا ہے تو اس کا شعور ہوتا ہے۔ اس لئے ”خواہد امروز

شدن آنچہ بفکرت فردا است“

ہرچہ آنجا است چو آنجا رسی ایں جا گردد

چہ خیال است کہ امروز تو فردا گردد

امروز و فردا کا نظریہ بیدل واضح کر چکا ہے، چونکہ امروز ہمیشہ امروز ہی رہے گا، اس لئے عقبی جب وہ سامنے ہو تو دنیا ہی ہوگی۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ دنیا ہو یا عقبی دونوں کا تصور ہمارے ہی ذہن سے وابستہ ہے ہم نہ ہوں تو یہ بھی نہیں۔

آنسو کی خولیت چہ عقبی و چہ دنیا ہم نیست
بگذر از خود تا نگاہ پیش میں پیدا شود

بے کشمکش نیست چہ دنیا و چہ عقبی
آہ از دل آزاد کہ خود را بچہا بست
دنیا ہو یا عقبی دونوں سے وابستگی ایک اُلجھن ہی ہے، آزادی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتی کہ ہم ان سے اُلجھے رہیں۔
چہ دام است دنیا چہ نام است عقبی
تو معمار ہی ایں خانہ ہائے گماں را

دنیا کے دھندوں میں تو ہم پھنسے ہوئے ہیں، اور عقبی کے نام کی رٹ لگا رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ”از ماست کہ بر ماست“ اس خانہ و ہم و گماں کے معمار ہم ہی ہیں، یہ سب ہمارے ہی تصورات ہیں، مقام تحقیق بھی یہی دنیا ہے۔

ہر چہ وارد محفل تحقیق امروز است و بس

خاک بر فرق دو عالم دی و فردا کردہ اند

ایں سازفتہ کہ تو محشر شنیدہ زیر ویم تو گرنہ بود غلغلیش نیست

یہ شور محشر تو سازفتہ سے سن رہا ہے اگر تیری ہی مدھم اور پچم سریں نہ

ہوں تو اس کا غل بھی خاموش ہو جائے گا۔ یہ امر کہ بہشت کی نعمتیں اسی

دنیا کی نعمتوں کے تصورات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے ماضی کے تصورات متقبل ہیں۔

بیدل

انتظار صبح محشر عالمی را خاک کرد

عمر با رفت و ہمیں امروز و فردا می رود

بہشت و کوثر از حرص و ہوس لبریزی باشد

بقیہ ہم رسیدم تیرہیں دنیا نشد پیدا

ہم نے عقیقی کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہی حرص و ہوس دنیوی ہے

جس سے بہشت معمور ہے اور کوثر پر ہے۔

حرص و ہوس کی برد بوسیم و زر دارد نظر

زابد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نداشت

جہاں حرص و ہوس سرگرم عمل ہو وہاں سیم و زر پر ہی نظر ہوگی، زابد

جو ترک دنیا اس اُمید پر کرتا ہے کہ بہشت میں حور و قصور ہیں تو ظاہر ہے کہ

وہ دنیا ہی کا طالب ہے۔

در مقامیکہ بود ترک و طلب امکانے

رو بدنیاست ہماں گرچہ زد دنیا گردد

جہاں کسی شے کا ترک یا طلب کرنا ممکن ہو تو خواہ ہم دنیا ترک کر کے

بہشت طلب کریں ہمارے بد نظر دنیا ہی ہے اگرچہ ہم اپنے زعم میں اسے ترک

کر رہے ہیں، لیکن بہشت کے نام پر طلب کر رہے ہیں، یہ کائناتِ عالم امکانا

ہے ترک و طلب دونوں امور امکانی ہیں اس لئے ہم اس عالم امکانا

میں ممکنات ہی کا تصور کر سکتے ہیں خواہ اسے دنیا یا عقیقی کے نام سے تعبیر

کریں۔

آں را کہ تو عقیقی شمیری عقیقی نیست

یعنی جائے تقرب مومن نیست

وصف جنت شنیدہ عبرت گیر

ہر جازر و گوہر بیست جز دنیا نیست

جسے تو عقبی سمجھ رہا ہے وہ عقبی نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا مقام نہیں، اور جنت کی نعمتوں کا بیان تو سننا ہے۔ عبرت حاصل کر جہاں زر و گوہر ہو وہ دنیا کے سوا اور کوئی جگہ نہیں۔ اس رباغی میں لفظ ”عبرت“ کے معنی گذر جانا، عبور کرنا۔ جب حافطہ کی مدد سے ہم گزشتہ واقعات کو دیدہٴ تصور کے سامنے لاتے ہیں تو اسے اصطلاح میں ”تذکرہ“ کہتے ہیں۔ یعنی کسی واقعہ گزشتہ کی یاد، جب اس سے گذر کر تفکر کی طرف آ رہے ہوں، تو اسے ”عبرت“ سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی تذکرے سے عبور کر کے تفکر کی طرف آثارِ رباغی میں دونوں معنی ہیں کہ اگر تو تقرب الہی چاہتا ہے تو عقبی کا جو تصور تیرے ذہن میں ہے اس سے گذر جا اور یہ کہ غور کرنا چاہئے کہ یہ تصور عقبی دنیا کی نعمتیں ہی ہیں اس لئے دنیا طلبی ہی ہے۔

بیانا دی کفیم امر دنہ فردائے قیامت را

کہ چشم شیرہ بیناں تنگ و پداغوش رحمت را

زمین تا آسماں اشار عام، آنگاہ نو میدی

برویم از در باز کرم این گرد تہمت را

تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ظہور میں آئی ہے۔ اور ”الوجہن“

کا تقاضہ یہ ہے کہ مخلوق کو وہ کچھ دے جو اس کی زندگی کے قیام کے

مناسب اور ضروری ہے۔ اور یہ سب کچھ بلا عمل منجانب مخلوق دیا اور

دے رہا ہے البتہ ”الرحیم“ اعمال کا معاوضہ بھی دیتا ہے مان اشعار

کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ ان اعمال

کی جزا دے گا جو ہم دنیا میں کر چکے ہیں ”میں غنی ہوتا تو کب وعدہ فردا

کرتا“ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت عامہ سے جو تمام

کائنات پر وسیع اور محیط ہے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آج نہیں

کل معاوضہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے یہ خود خیر و سرتنگ چشم ہیں

بیدل

انہوں نے اللہ کی رحمت کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم ”فردائی قیامت“ کو گزرے ہوئے کل میں محو کر دیں۔ اور یہ تہمت جو اللہ کے کریم کے دروازہ کو غبار آلود کر رہی ہے اس پر جھاڑو پھیر دیں۔

نومیدیم شتم کش خلد و حیم نیست
آسودہ ام خواب عدم زیں فسانہ

امرا کو عموماً نیند کی شکایت رہتی ہے اور کم خوابی کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ تن آسانی کے دلدادہ محنت و مشقت سے جی چلے ہیں۔ آرام سے جس شخص کی گزرے وہ آخر بے آرام ہی ہوتا ہے، مرد و بدن بھر کی محنت کے بعد میٹھی نیند سوتا ہے۔ امراء نے خواب آور تدبیر یہ نکالی کہ فسانہ سُنتے اور ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ”افسانہ گو“ جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ فسانہ سُنتے سُنتے امراء کو نیند آجاتی۔ اس لئے فارسی اور اردو علم ادب میں فسانہ اور خواب کو ایک دوسرے سے نسبت دی گئی۔ مطلب شعر یہ ہے کہ میں بہشت اور دوزخ کے فسانے سُنتا سُنتا خواب عدم میں آسودہ ہوں۔

عالے راسرگزشت زفنگاں از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد بچ کس بیدار نیست

ایک دنیا کو گزرے ہوئے لوگوں کے قصوں نے بیکار بنا رکھا ہے۔ بات یہ ہے جہاں کہیں افسانہ گوئی ہے وہاں کوئی شخص بیدار نہیں ہوتا۔ فسانہ ہے ہی خواب آور، شعر محولہ بالا میں یہ اشارہ ہے کہ بہشت اور دوزخ کی کہانیاں ہی ایسی خواب آور ہیں کہ میں فسانے سُنتے سُنتے خواب عدم میں نہایت آسودہ ہوں۔ اس لئے میری نومیدی خلد و حیم اور اُمید و حیم سے بے نیاز ہے۔ غالب کہتا ہے کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آنسوِ خوف ورجا خلد یقین پیدا کنید
 ورنہ ایمانیکہ مشہور است جز اعراف نیست
 اُمید و بیم جہاں ہو وہ یقین کا بہشت نہیں، بہشت اطمینانِ قلب
 کا نام ہے، اس لئے یقین یا ایمان جو مشہور ہے وہ ”اعراف“ میں ہے یعنی
 اُمید و بیم کے درمیان، اور یہ خلد یقین ہے اعراف کے معنی معرفت کا
 مقام۔

طبعیکہ اُمیدش اثر آمادہٴ بیم ست
 گر خود ہمہ فردوس بود ننگِ حجیم ست
 ”امید و بیم“ دو متضاد ممکن امور ہیں۔ ایک کا تصور دوسرے کی
 تصدیق ہے۔ اس لئے جس دل میں اُمید ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ”بیم“
 کا اثر قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے خواہ وہ سراسر فردوس ہو ننگ
 دوزخ ہے۔

طالب ویرانہا غیر جنونت کہ کرد
 آنچہ تو خواندی بہشت خانہ بے آدمی است
 اگر تجھے صحرا نوردی کا شوق دامن گیر ہے تو ظاہر ہے کہ تیرے سر پر
 وحشت سوار ہے جسے تو بہشت سے موسوم کر رہا ہے ”خانہ بے آدمی“ ہے۔
 اگر آدم کے رہنے کی جگہ مناسب ہوتی تو آج وہاں آدم ہوتا مگر روایت
 یہ ہے کہ وہاں سے نکل آیا اور اب یہ خانہ بے آدمی ویرانہ ہے اگر اب
 بھی تجھے اس کی طلب ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ ”ظلم و جہول“
 کا مخاطب تو ہی ہے۔

پیچ دانانزند تیشہ بیائے آرام
 از بہشت آنکہ بروں آمدہ آدم نیست

یہ تو ظاہر ہے کہ بہشت ”خانہ بے آدمی“ ہے اور اگر یہ جائے آرام و آسائش ہوتی تو یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر کلباڑی مارے اور آرام چھوڑ کر تکلیف برداشت کرے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ جس نے بہشت چھوڑا وہ آدمی نہ تھا۔ کیونکہ آدمی کی واحد امتیازی خوبی یہی عقل ہے وہ کوئی ظلم و جہول ہی ہو گا جس کو بہشت ملی اور ترک کی۔

عافیت و دراست از نقش بنامی محرمی
خون بود رنگے کز و تصویر انساں می شود
در خیال آباد راحت آگہی نامحرم است
جلوہ نماید بہشت آنجا کہ جنس آدم است
یہی تخیل اس شعر میں بھی ہے کہ :-

راحت دریں قلمرو از آثار ہوش نیست
خوابیدہ است اگر کسے آرام داشتہ است

یہ ظاہر ہے کہ ہوش و حواس کے ساتھ جسے راحت کہتے ہیں وہ میسر نہیں، جو سویا ہوا ہے وہی آرام میں ہے۔ یعنی غفلت میں ہی راحت ہے۔ اہل عقل و ہوش کے لئے آرام و آسائش نہیں بہشت جائے راحت ہے اور یہ معلوم ہی ہے کہ اس قیام راحت میں آدم کا قیام نہیں۔ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جہاں آرام ہے وہاں بہشت نہیں۔ آدم تو طبعاً مفسد اور خونریز واقع ہوا ہے اس سے یہ کب توقع ہو سکتی ہے کہ راحت و آرام و آسائش سے روشناس ہو، شکست عافیت آہنگ گردید بہر جا ساز آدم آفریدند۔

اے فضول وہم عقبتی آدم از جنت چہ دید
عبرت است آنجا کہ صاحب خانہ بہاں می شود
تجھے عالم اولام میں عقبتی اور بہشت کے حور و قصور کے نظارے دکھائی
دیتے ہیں۔ اتنا تو سمجھنا چاہئے کہ جد امجد آدم نے جنت میں کیا دیکھا اور
کیا پایا؟ بہشت سے بے آبرو ہو کر نکلے۔ ایسی جگہ جہاں صاحب خانہ خود
بہاں کی حیثیت رکھتا ہو جائے عبرت ہے نہ جائے قیام۔
دلت بعشوه عقبتی خوش است، ازین قافل
کہ ہر کجا توئی آنجا بغیر دنیا نیست
دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا تو ہے کہ عقبتی بھی ہے لیکن تو یہ
حقیقت نہیں سمجھ سکتا کہ جہاں تو ہے وہاں دنیا کے سوا اور کوئی مقام
نہیں۔

بیروں نہاختہ است ازین عرصہ پہنچ کس
واماندہ نیست ایتکہ نوگوٹی فلاں گذشت

زین خاکداں کہ دامن دلہا گرفتہ است
خلقی ز خویش رفت و بجائے دگر نرفت
اس زمین نے ہمارے دلوں کو کچھ ایسا ابھھا رکھا ہے کہ لوگ اپنے
آپ سے گزر رہے ہیں یعنی مر رہے ہیں مگر کسی دوسری جگہ جانے کا نام
نہیں لیتے۔ یعنی اس کرۂ ارض سے کوئی آج تک باہر نہیں گیا، جسے ہم
کہتے ہیں گزر گیا وہ کسی اور جگہ نہیں گیا، اسی جگہ براجمان ہے۔
در جنتی کہ وعدہ نعمت شنیدہ آدم کجاست اکثر سکنش احمق اند

بیدل

وہ جنت جس کا وعدہ نعمت تو سن چکا ہے وہاں آدم کہاں ہے
جو صاحب عقل و شعور ہے وہاں تو اکثر احمقوں کا ڈیرا ہے یہ اشارہ
حدیث شریف ”اکثر اهل الجنة بلہم“ کی طرف ہے۔
گویند بہشت جائے خوبیت آنجا ہم اگر دماغ باشد
(۶) تجدد امثال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ عالم ہر آن بدلتا ہے، چونکہ
ہستی میں تکرار نہیں اور کسی شے کو ایک حالت پر قیام نہیں اس مشاہدہ
کی ”فرصت“ بھی نہیں میسر نہیں، جب ہم ایک شے کو دیکھتے ہیں تو آنکھ
کی جھپک میں یہ شے ہزاروں رنگ بدل چکی ہے۔ اس لئے بیدل
فرصت کا رونا روتا ہے کہ نہ

رمیدہ است چو نرگس دریں تماشا گاہ

ہزار چشم ویکے رانصیب دیدن نیست

علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس تخلیق کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن بیدل کچھ اور بات کہتا ہے کہ ہمیں باوجود نور بصر و بصیرت

اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی شے کو آنکھ بھر کر دیکھ سکیں، اس لئے
کہتا ہے کہ

من نمی گویم زیاں کن، یا بفکر سود باش

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

میں یہ نہیں کہتا کہ تو گھائے میں رہے یا فائدہ کی فکر میں وقت

فرصت ضائع کرے جو کچھ تو نے کرنا ہے کر گزر، کیونکہ یہ وقت فرصت

جو تجھے میسر ہے پھر نہیں ملے گا۔

بزم تجدید یا سمتِ این جافرت تحقیق کو
من منی وارم کہ تا و امیر سم او می شود
اس بزم تجدد امثال میں فرصت تحقیق میسر نہیں، میں جانتا ہوں کہ
”میں ہوں“ جب ”انانیت“ () کی تحقیق کے لئے اس کے قریب
جاتا ہوں تو ”انانیت“ اتنے عرصہ میں ”اومی شود“ میرا تصور ”خود می“
محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کسی اور کا تصور جگہ لے لیتا ہے۔

ز عرض شبہ ہی نیست نسخہ تحقیق
تو آنچہ کردہ از خویش انتخاب شکاست
کسی شے کی تحقیق تو اس وقت تک ہو سکتی ہے جب ہم اس شے کو
جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تو تحقیق مشکل
ہے۔ اس لئے جسے ہم اس شے کو جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر جب یہ گرگٹ
کی طرح رنگ بدلے تو تحقیق مشکل ہے۔ اس لئے جسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ
در اصل ”شبہ“ ہے۔ اس شعر میں لفظ ”شبہ“ نہایت موزوں واقع ہوا ہے
”شبہ“ اور ”شبہ“ اور ”مشابہت“ دو اشیاء میں ہوتی ہے، چونکہ تجدد میں امثال
بدل رہی ہیں اس لئے ہر ایک مثل پہلی اور دوسری کی شبہ ہے اور
امثال میں مشابہت ہے۔ ہم ایک مثل کو دوسری مثل پر قیاس کرتے ہیں
اور اسے تحقیق سے موسوم کرتے ہیں۔

تا تجدد جلوه دارد شبہ معنی بجاست

کس چہ ہمید زیں عبارتہا یکے مانوس نیست

بیدل

تا دم زنی چو آئینہ گردانده است رنگ

ابن کار گاہ جلوہ چہ مقدار نازکست

آئینہ میں ”تمثال“ ہی مشاہدہ ہوتی ہے۔ ایک سانس کے وقفہ میں یہ تمثال بھی اپنا رنگ بدل چکتی ہے۔ اس شعر کی لطافت اس حقیقت میں ہے کہ اگر ہم آئینہ پر پھونکیں تو اس کی سطح پر ایک تہ بخارات کی جم جائیگی، جو ہمارے سانس کیساتھ پیدا ہوتے ہیں بلکہ سانس ہی بخارات ہیں۔ اس حالت میں آئینہ مگر رہو جائے گا اور عکس بھی بدھم پڑ جائے گا۔ ”دم زدن“ محاورہ ہے۔ اردو میں بھی ہم ”دم مارنا“ کہتے ہیں۔ جو دراصل فارسی ہی کا ترجمہ ہے۔ ہم محاورہ میں کہتے ہیں کہ ”کس کو دم مارنے کی مجال ہے“ یعنی کس کی جرأت ہے کہ بول سکے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ”کار گاہ جلوہ“ اتنا لطیف ہے کہ آئینہ کی طرح تجھے اس کے سامنے سانس لینے کی فرصت نہیں توڑے سانس لیا اور اس کا رنگ بدل گیا۔

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانہ ٹحیرت

مژہ برہم مزن تان شکنی رنگ تماشا را

نیز:-

چشیکہ کشائی بہ تامل بکشا تا از مژہ رنگ جلوہ پا خورد
ذرا احتیاط کے ساتھ آنکھ کھول ایسا نہ ہو کہ رنگ جلوہ کو مژہ کی
ٹھوکر لگے۔ کتنا نازک خیال ہے!

نگہ بر سرور و د، پوشنم، ز شرم باید آب گردد

اگر بداند کہ بے محابا جلوہ گاہ کہ می خراشد

نگاہ ہر طرف بے لگام پھر رہی ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ کس کے

جلوہ گاہ میں بے ادب خرام کر رہی ہے تو شبہم کی طرح مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی۔ ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ ”کتنی آیات ہیں جن پر یہ غافل یونہی گزر جاتے ہیں۔“

بستہ احرام صد عقبی اہل اماچہ سود
فرصت نگذشتہ ات پیش گذشتن ہا گذشت

تو نے سینکڑوں عقبی کی توقعات کا احرام باندھا ہوا ہے لیکن کیا فائدہ، تیری فرصت کے لمحات جو ابھی گزرنے باقی تھے ان دور ازکار توقعات کی انجمن میں گزرنے سے پہلے ہی گزر گئے، ”احرام“ حج کی تقریب پر باندھا جاتا ہے، اور یہ ایک ہی چادر ہوتی ہے، اور کفن کی بھی ایک چادر ہوتی ہے، تو نے احرام کفن اس توقع پر باندھا کہ عقبی کا حج نصیب ہوگا مگر وہ تو نہ ہوا اور حج عقبی کے ایام گزر گئے تو نے فرصت کا وقت احرام باندھنے میں ضائع ہی کر دیا۔ یعنی تو عقبی میں کبھی نہ پہنچے گا۔

بہرچہ واریسی از خود گذشتنی دارد

بہوش باش کہ امروز رفت فردا نیست

تو جس چیز کے پاس پہنچنا چاہتا ہے وہ تو خود گزر رہی ہے، اسی طرح فردا تو کبھی نہ دیکھے گا۔ البتہ اس توقع میں ”امروز“ کی فرصت بھی تو ہاتھ سے کھودے گا۔ امروز تو گیا مگر فردا بھی اسی طرح امروز بن کر گزر جائیگا۔

شاید بعض حضرات کے دل میں یہ دسوسہ ہو کہ بیدل بھی

انتباہ | ”دہریہ“ ہے کہ عقبی اور حشر و نشر و بہشت و دوزخ کا منکر

ہے۔ بیدل منکر نہیں۔ لیکن ان اصطلاحات کی جو قرآن میں مذکور ہیں

بیدل

اپنے فہم کے مطابق تاویل کرتا ہے، یہ ایک فقہی مسئلہ ہے کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا منکر کا فر ہے۔ لیکن جو تاویل کرتا ہے وہ منکر نہیں، البتہ اس کا مطلب وہ وہ سمجھتا ہے جو عام عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے بیدل صحیح کہتا ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حد نظر ہے، بات بھی یہی ہے کہ ہر کس و ناکس غزالی اور رازی، بوعلی سینا اور فارابی نہیں، ذہنی درجات بلند و پست ہوتے ہیں۔ قرآن ”بلاغ“ اور ”بلیغ“ کلام ہے جو ہر ایک زمانہ کے ذہن بلند و پست تک رسا ہے۔ بیدل کا جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں حیات بعد ممات پر ایمان ہے، وہ زندگی ایک ”واقعہ واحدہ“ یا ایک مسلسل واقعہ سمجھتا ہے۔ تجد و امثال کے تحت جو کچھ تغیر مشاہدہ ہو رہے ہیں یا ہونگے وہی دنیا و عقبی وغیرہ سے تعبیر ہوتے ہیں اس لئے یہ ایک لفظی بحث ہے، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ نظریہ میں بہت اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر بھی پڑتا ہے، عقائد کا اختلاف صرف ”فروع“ میں ہے۔ اصول میں نہ اختلاف ہے اور نہ مسلمانوں کے کسی فرقہ میں ایسا اختلاف ہے۔ ہم بیدل کے مذہب پر بحث کر چکے ہیں، اس کے مطالعہ کے بعد کوئی شخص محض اختلاف عقائد کی وجہ سے بیدل کو خارج اسلام نہیں کہے گا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر یہ بھی واضح کیا جائے کہ جسے ہم عقبیٰ سے موسوم کرتے ہیں اس کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف موجودہ حالات پر قیاس کر سکتے ہیں اور قرآن میں بھی ہمیں اسی طرح سمجھنا یا گیا ہے کہ فرض کرو وہاں دودھ ہو گا مگر اس کا رنگ اور ذائقہ نہیں بدلے گا۔ اس مثال سے ایک کیفیت تو ذہن میں آتی ہے کہ وہ عالم کیسا ہو گا۔ لیکن جو شے ہمارے محسوسات سے بالاتر یا باہر ہے اس کا

تصور ہم نہیں کر سکتے۔

اس میں کچھ قباحت نہیں کہ ہم بحوالہ آیات قرآن واضح کریں کہ یہ دنیوی زندگی بھی جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتی ہے اگر ہم اسے اپنے اعمال سے جہنم نہ بنائیں۔ اور یہ کہ جس جنت کا وعدہ اصحاب رسول کریم اور اہل ایمان سے کیا گیا تھا اس کا ایک حصہ دنیوی جنت بھی تھی اور ہے، اگرچہ آخرت کی نعمت بدرجہا بہتر ہے۔ الفاظ جنت اور فردوس اور عدن اور بحرین عموماً آیات قرآن میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے علماء نے کبھی ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہی سمجھے کہ ان سے مراد غیبی کے مقامات ہیں جہاں ہر ایک قسم کی نعمت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جنت کا ذکر ہے وہاں انہار جاری ہیں اور باغات ہیں اور مساکن طیبہ ہیں اس سے مراد ارضی جنت ملک شام ہے اور یہی الفاظ توراۃ میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور اسی ارضی جنت کا وعدہ ذریت ابراہیم بنی اسرائیل و بنی اسماعیل سے کیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کو تو صرف ملک شام ہی ملا۔ بنی اسماعیل کو مصر کی فراوانی، عراق اور ایران کی دولت و ثروت بھی ملی۔ لفظ فردوس عربی نہیں، پارسی ہے۔ اور پارسیوں کی مقدس کتاب ”زند اوستا“ کے حصہ ”ونیداد“ میں یہ لفظ ”پر یزیدہ“ استعمال ہوا ہے۔ مراد شاہان فارس کے خیابان ہیں، جب یہ لفظ یونان میں گیا تو یونانی زبان میں ”پیراڈائس“ ہو گیا۔ عبرانی اور عربی میں ”فردوس“ ہوا۔ ”عدن“ بھی عربی لفظ نہیں۔ یہ ”سمری“ زبان کا لفظ ہے اور سمیری قوم عراق میں آباد تھی۔ اس لفظ کا مفہوم وہ سبز و زار ہے جو دریا کے کناروں پر ہوتا ہے۔ ”بحرین“ عرب کا انتہائی جنوب مشرقی کونہ ہے،

یہ ایک جزیرہ ہے۔ اس کا مذکور سورہ ”رحمن“ میں ہے، یہاں دو دریا یا بحر کا اجتماع اب بھی ہے، اوپر کی سطح پر آب شور ہے اور دو تین گز نیچے آبِ فرات یعنی آبِ شیریں ہے۔ جزیرہ کے لوگ غوطہ لگا کر ٹیٹھے پانی سے مشکیزے بُسر لیتے اور یہی پانی پینے کے کام آتا۔ جزیرہ میں جب سے ”پٹرول“ دریافت ہوا تو چایات بھی احداث کئے گئے، اس سے پیشتر لوگ میٹھا پانی بھر ہی سے نکالتے، بعض اوقات میٹھا پانی سطح پر بھی آ جاتا ہے۔ ”جمع البحرین“ موتیوں کی برآمد کے لئے بھی مشہور ہے۔ یہاں کے موتی نہایت خوشنما آیدار ہوتے ہیں۔ قرآن میں ان الفاظ کا استعمال بطور پیش گوئی استعمال ہوا ہے کہ یہ مقامات جس کی زبانوں کے یہ الفاظ ہیں اہل ایمان کو عطا ہونگے۔ اور ہوئے۔ اور اب بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں مگر بہشت میں رہتے ہوئے جہنمی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس تحقیق کی تائید میں آیات قرآن میں ارشاد ہے کہ

قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة۔

ہم نے فرمایا کہ اے آدم تو اور تیری زوجہ اس جنت میں رہو۔

ظاہر ہے کہ اس ارشاد الہی کا خطاب آدم خاکی اور اس کی زوجہ کو ہے۔ اس لئے یہ جنت جہاں آدم اور اس کی زوجہ کی سکونت تھی۔ مادی جنت ہی ہو سکتی ہے، اور مادی کائنات سے باہر متصور نہیں ہو سکتی، زمین کی پیداوار ہی کا مذکور قرآن میں ہے کہ وجعلنا فیہا جنت من نخیل واعناب وفجرنا فیہا من العیون لیاکلوا من ثمرہ۔ (۲: ۲۳) توراۃ میں بھی انہی ارضی نعمتوں کا مذکور ہے جو بنی اسرائیل کو ارضِ شام میں ملیں (مثانی باب ۸) میں انہی چشموں اور ندیوں

اور وادیوں اور پہاڑوں اور گندم اور جو اور انگور اور انجیر اور انار اور زیتون اور شہد اور ان کی فراوانی کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ ”تجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوگی“ (فیہا ما یشاؤن) جس قوم سے یہ ارضی جنت ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے چھینی گئی ان کی نسبت ارشاد ہے کہ۔

کم ترکوا من جنت و عیون و ذروع و مقام کریم
و نعمة کانوا فکھین۔ (۱۲: ۲۵)

کتنے باغات اور چشمے انھوں نے چھوڑے اور نملہ کے کھیت اور نفیس مقام اور نعمتیں جن میں وہ خوش و خرم تھے، ایسا ہی ہوا اور ہم نے یہی کچھ دوسری قوم کو میراث میں دیدیا۔ آدم کو اسی دنیا میں پیدا کیا گیا اور اسی دنیا میں اس نے رہنا ہے اور رہتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ جس غرض کے لئے اسے یہاں رکھا گیا ہے وہ پوری ہو۔ کیا اچھا نسخہ سعدی نے فرمایا ہے کہ
تو کارِ زمین را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی
اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ کو مخاطب فرماتا ہے کہ
یا ایہا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة
قادخلى فی عیدی وادخلى جنتی۔ (۱۲: ۳۰)
اے الہیمان یافتہ نفس انسانی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ
تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پس میرے بندوں میں
داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو۔
ظاہر ہے کہ مقامِ راحت اور امن الہیمان ”قلب“ ہی ہے۔ اگر یہ نہ

بیدل

ہو تو سب نعمتیں بدمرزہ ہیں۔ اہل جنت وہ ہیں کہ ”لا خوف علیہم ولا
ہم یحزنون“ جنہیں نہ کسی بات کا خوف نہ دھرد کا اور نہ حزن و غم،
غرض بالکل مطمئن ہیں۔ آسودگی پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے کہ حالت یہ ہے کہ
دنیا الم غفلت و عقبی غم اعمال آسودگی از یاد و جہاں فاصلہ دارد

خاطر تپوں جمع شد از ہر دو عالم فارغی

قطرہ دارے چوں گہر زیں بحر بے پایاں برآ

جب تجھے ”الطینان قلب“ حاصل ہو گیا تو دونوں جہانوں سے
بے نیاز ہو گیا۔ بحر قطروں کا مجموعہ ہے یعنی اس عالم کثرت سے تو اسی
حالت میں باہر آ سکتا ہے جب گوہر کی طرح اپنے آپ میں جمع ہو کر یا جمیت
دل حاصل کر کے بحر سے باہر آ سکتا ہے، بلکہ بحر میں رہتے ہوئے بھی اس سے
جدا ہے اور موج حوادث سے نہ تجھے کچھ خوف ہے نہ غم۔

لیکن بیدل کے نظریہ بہشت میں کچھ اور بات بھی ہے۔ یہ کائنات،
خواہ ”درد سر“ ہو یا ”دردِ جگر“ بہشت کی بہت بڑی نعمت یہی ”دردِ
دل“ ہے۔

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید

جا بیکہ بداعی نہ طید دل چہ مقام است

کہتے ہیں کہ بہشت دائمی راحت کا مقام ہے ایسی جگہ جہاں داغ
سے دس میں طیش پیدا نہ ہو وہ کیسا مقام ہو سکتا ہے۔ ایک مطلع ہے کہ

مدعا از ہستی مابس ہمیں آزاد بود

ور نہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

دائمی راحت ”عدم“ کے مترادف ہے، زندگی توجہ و جہد میں

ہے جو اسی کردہ ارض پر ہے۔

زمین گیری بزنک سایہ باید مغنم دیدن

چہ خواہی دید اگر درخانہ خورشید خوانند

اس لئے بہشت راحت جاوید ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

ورد عشق و مرثوہ راحت زہے فکر محال

ایں خبر یارب کدائیں بے خبر آوردہ است

ورد عشق ہو اور عاشق کو راحت کی خوشخبری سنائی جائے یہ تو فکر محال

ہے، وہ کون ہے جو یہ خبر لایا ہے۔

نہد و تقویٰ ہم خوشست اما تکلف بر طرف

درود دل را بندہ ام در دوسرے درکار نیست

جاننا ہوں ثواب طاعت زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(غالب)

اس کائنات کو ”مادی“ کہو جیسے کہ مادہ پرست کہتے ہیں، یا خیالی

صورتیں کہو جیسے کہ ”ایڈیلٹسٹ“ کہتے ہیں، حقیقت پرست کے نزدیک یہ

صرف لفظی بحث ہے اور محققین کی اپنی حد نظر ہے۔ اور صداقت سے خالی

نہیں مثال یا عکس یا سایہ یا ظل ایک ہی معنی ہیں، چونکہ مثال آئینہ میں

رو نما ہوتی ہے اس لئے ”آئینہ“ پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے وہ آج تک کسی

شاعر نے اس شرح و بسط سے نہیں لکھا۔

خورشید ز ظلمت کردہ سایہ بروں است

تبا کے زحدوث آئینہ سازید قدم را

حادث وہ شے ہے جو پیدا شدہ ہو یہ کائنات حادث اور مخلوق ہے

بیدل

اس میں اگر ”قدیم“ کی نکل یا سایہ بھی مشاہدہ ہو تو ظاہر ہے کہ آفتاب حقیقت جو قدیم ہے آئینہ کائنات میں پر تو فگن ہو تو یہ عکس تو آفتاب نہیں ہے آفتاب آئینہ اور عکس سے باہر اور جدا ہے۔ یعنی حادث قدیم نہیں ہو سکتا۔

ہمہ بشوخی تمثال چشم با ختمہ ایم
وگر نہ حسن بروں از کنار آئینہ است
بغیر عکس ندانم وگرچہ خواہی دید۔

اگر در آئینہ بینی جمال یکتارا
ہیں نہیں جانتا کہ تو اگر آئینہ میں ذات بکتا کا حسن مشاہدہ کرے
تو عکس کے سوا اور کیا دیکھے گا، اور وہ عکس سے باہر اور جدا ہے۔

در خلوت دل از تو تسلی نتوان یافت
جز اینکه در آئینہ توان دید مثال است

”خلوت“ وہ یکسوئی ہے جہاں دوسرا نہ ہو۔ گوشہ دل میں بھی خلوت کا مقام نہیں کہ اطمینان سے ہم تجھے دیکھ سکیں یعنی آئینہ دل کو کثرت کے نقوش محو کرنے کے بعد بھی وہ خلوت حاصل نہ ہوئی کہ جلوہ وحدت رونما ہوتا۔ اس آئینہ میں اگر کچھ دیکھنا ممکن ہو تو وہ ”مثال“ تھی نہ کہ خود حقیقت۔

کس دل کو دعوت ہے کہ حقیقت پرست ہے

آئینہ بھی اگر ہے تو صورت پرست ہے

تا بکے نازی بحسن عاریت ماومن آئینہ داری بیش نیست

تو کب تک ایسے حسن پر ناز کرتا رہے گا جو عاریت ہے، ہم تم کو

صرف آئینہ وار ہیں جس میں عکس ایک حقیقت کا پڑتا ہے جو ہم سے باہر اور جدا ہے۔ اس آئینہ میں ہم نے حسن کا عکس عاریت لیا ہوئے ہے یا دیا گیا ہو۔

دلت مقابل و آنگاہ عرض یکتائی

ثبوت وحدت و آئینہ خانہ بوالعجبیت

(۷) تجد و امثال کا ایک اہم دور رس نتیجہ یہ ہے کہ ہم صرف

”امثال“ محسوس کر رہے ہیں، ”حقیقت“ کی طرف یہ امثال ضرور

اشارہ کرتی ہیں اور ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ”ہست“

پیش بینان بارگاہ الہیہ پیش ازین رہ نہ رہے اندکہ ہست

(سعدیؒ)

”امثال“ محض صورتیں ہیں اور ہر آن بدلتی ہیں۔ اس لئے اگر انہیں

سوہوم کہا جائے تو کچھ قباحت نہیں، ”حقیقت واحدہ“ ہے اور وہی

تمام صورتوں میں رونما ہو رہی ہے۔ انسان بے کسوت عبارت معنی

شناس نہیں ہو سکتا اور اسمائے پردہ ہی میں مسمیٰ کی ہستی کا احساس

ممکن ہے اگرچہ ہم اس کی ”کنہ“ کو نہیں پہنچ سکتے۔ بیدل ایک رباعی میں

کہتا ہے کہ:-

آں جلوہ بے نشان کہ نے رنگ و نہ بوست

پیدائی و نہ پائی او حرف لگوست

پنہاں ز انسانکہ آنچسہ اندیشی نیست

پیدا چند آنکہ ہرچہ بینی ہمہ اوست

چونکہ حقیقت بذاتہ صورتوں سے معرا ہے اور ہم اسے کسی صورت سے

مشخص و معین نہیں کر سکتے اس لئے لا تدرك الا بصار و هو يدرك

بیدل

الایصار، وهو الطیف الخبیر۔ (۱۹: ۷) مولانا رومی بھی یہی کہتے ہیں کہ ”آنچه در اندیشه ناید آن خداست“ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ”پیدا چند آنکہ ہر چہ بینی ہمہ اوست“ جب وہی اوّل اور وہی آخر اور وہی ظاہر اور وہی باطن ہے، تو اوّل و آخر و ظاہر و باطن کے علاوہ اور کیا ہے جہاں اس کے غیر کی گنجائش ہو۔

سواد نسخہ تحقیق بیدل دقتے وارو

دو عالم جلوہ باید خواندن بے رنگ نہمین

دو عالم یعنی ”دوئی“ سے مراد عالم کثرت ہے اور کثرت اختلاف لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کثرت اور اختلاف اور اس کی رنگینی غرض سب کچھ ایک جلوہ ذات احد ہے جو خود بیرنگ ہے۔

عالم ہمہ یک جلوہ ذات احد است

ایں جانہ ہیولی نہ صورت جسد است

کثرت آثار چشم واکردن است

ایں صفر چو محوشد ہماں یک عداست

بیدل کے شاعرانہ تخیل نے ایک سادہ امر واقعہ میں بھی ایک لطیف

پیدا کر دیا ہے۔ آنکھ کی صورت بھی صفر کے مشابہ ہے، ایک پر صفر

زیادہ کرتے جاؤ تو دس اور سوا در ہزار تالا تعداد ہو جائیں گے۔ جب ہم

آنکھ کھولتے ہیں تو چونکہ آنکھ خود صفر ہے۔ یہ صفر بھی ہم ہر طرف مشابہہ

کرتے ہیں اور یہی وحدت کو کثرت میں دکھا رہا ہے۔ اب آنکھ بند کرلو

تو یہ صفر سب محو ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت ہمارے حواس

محسوس کر رہے ہیں۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گرنہ بینی نور حق بر ما منحند
مدعا دل بود اگر نیرنگ امکاں رختند
بہر ایں یک قطرہ خون صد زنگ ہواں رختند

سیر دل | ”بیدل“ نے جو کچھ ”تجد و امثال“ پر لکھا ہے وہ بیان
حقائق ہے اور تصویر کے دونوں رخ اس نے پیش
کر دیئے ہیں۔ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، تصویر کے خط و خال
نمایاں نہیں ہو سکتے اگر روشن طرف کے ساتھ سایہ نہ ہو۔ تصوف میں
ایک فریق کی نظر اسی سایہ پر رہتی ہے، ان کے کلام میں فرسودگی اور
مایوسی نمایاں ہے، بقول علامہ اقبال یہ فرسودگی غالب کے کلام میں
بھی ہے، لیکن بیدل طبیعت میں ایک حرارت اور حرکت پیدا کرتا
ہے، وہ فلسفہ آزار بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا
یہ فٹسا ہے اور ”لیس للانسان الا ماسعی“ اور سعی اور آزار لازم و
ملزوم ہیں۔

مدعا از ہستی مایس ہمیں آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود
جب ہماری زندگی اسی شے کا تقاضہ کرتی ہے تو اس تقاضہ کو
پورا کرنا چاہئے، سکون و راحت تو عدم ہی کے مناسب ہے اس لئے
اگر تم اس کے طالب ہو تو ”موت کی تمنا کرو“ بیدل تو اس بہشت کو
بھی پسند نہیں کرتا جسے بے خبر لوگ مقامِ راحت کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ
گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بداغی نہ طید دل چہ مقام است
اور اکثر اشعار میں اشارہ کرتا ہے کہ اگر آدم کے مناسبِ راحت طلبی

بیدل

ہوتی تو وہ بہشت کو چھوڑتا ہی کیوں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے راحت کہتے ہیں وہ آدم کی فطرت کے نامناسب ہے ”جلوہ نماید بہشت آنجا کہ جنس آدم است“۔ اور صاف صاف لفظوں میں تلخ حقیقت بیان کرتا ہے کہ:-

عافیت دور است از نقش بنائے محرمی

خوں بود رنگے کزو تصویر انساں می شود

اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ اگر ان تلخ حقائق کی تلخی محسوس کرتے ہوئے انسان مایوس ہو کر بیٹھ رہے تو بیدل اسے ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

بے بہار نیستی از قدر خود ہوشیار باش

تمام کائنات کی متفقہ کوشش نے بے شمار دوروں میں سے گزر کر آخر کرۂ ارض پیدا کیا۔ اور اس خاکدان کے بے شمار طبقات کا آخری ارتقائی ظہور انسان بنا۔ اس اہتمام کے بعد انسان کی تخلیق بجلستے خود ایک مقصد تھا، جیسے ایک نخل ضرور کا مقصد اس کا پھل ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شاخیں اور پتے غرض ہر ایک شے کا رآمد اور مفید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فطرت کوئی شے ناکارہ اور باطل پیدا نہیں کرتی۔ انسان پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ سرِ دست یہ حقائق جو بیدل بیان کرتا ہے ہمارے سامنے ہیں کہ جسے ”تحقیق“ کہتے ہیں، وہ بھی ”شبہ“ سے خالی نہیں۔

ز عرض شبہ تہی نیست نسخہ تحقیق

تو آنچہ کردہ از خویش انتخاب سکاست

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ”تا تجد جلوہ دارد شبہ معنی

بجاست، یہ تجد و امثال ہی کا کرشمہ ہے کہ ہمیں ”امثال“ یا شبہ کے بعد شبیہ نظر آتی ہے اور ایک دوسری کی غیر ہے۔ اس حالت میں کوئی شخص دعوائے نہیں کر سکتا کہ وہ محقق ہے، کسی شے کی نسبت صحیح حکم ہم اسی حالت میں لگا سکتے ہیں جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو لیکن اس شے کی تصویریں یکے بعد دیگرے ایک دوسری سے مختلف ہماری آنکھوں کے سامنے سرعت سے گزر رہی ہوں تو تحقیق کی کونسی صورت ہے۔

بزم تجدید است این جا فرصت تحقیق کو
من منی دارم کہ تاوامیری اومی شود

جب ہمیں تحقیق کی فرصت ہی نصیب نہ ہو تو تحقیق ممکن نہیں۔ لیکن بیدل کہتا ہے کہ تحقیق کی ایک صورت ہے اور وہ ”سیر دل“ ہے، اس کو اصطلاح میں ”سیر النفسی“ بھی کہتے ہیں۔

زیر کار گاہ تمثال یا دل قناعت و است
از ہر گلے کہ خواہی آئینہ رنگ دارد

اس عالم صورت یا تمثال میں مناسب یہی ہے کہ دل ہی پر قناعت کرو، امثال سرعت سے بدل رہی ہیں اور ان میں تکرار اور رجعت نہیں اس لئے ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس پر ہمارا قبضہ تصرف ممکن ہو۔ لیکن جو کچھ آفاق میں ہے اس کا عکس ہو رہا ہے آئینہ دل پر پڑتا ہے اور اس میں محفوظ ہو جاتا ہے، باغ میں پھول کی رنگینی پر بھی تجد و امثال اثر انداز ہے اور یہ ہر لحظہ بدل رہی ہے۔ مگر دل میں ہر ایک رنگ اور رنگینی محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں گلگشت چمن چھوڑ کر سیر دل ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

نیل

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سروسمن در آ

توز غنچہ کم نہ میدہ در دل کشا بچمن در آ

کتنی ستم ظریفی ہے اگر تجھے ہوا و ہوس سیر گلشن کی ترغیب دے تو خود غنچہ سے کم شگفتہ نہیں ہے دل کا دیوارہ کھول کر چمن میں داخل ہو جا، تیرا دل خود ایک گستان جہاں ہے۔

پے نافہ ہائے رمیدہ بو پسند ز حمت جستجو

بخیاں حلقہ زلف او گرد خور و بختن در آ

نافہ یا پھولوں کی خوشبو تو فضا میں پریشان ہو رہی ہے۔ تو اس کے پیچھے دوڑ دھوپ کب تک کرتا رہیگا، اور کہاں تک کرے گا۔ وہ تو ہاتھ آنے سے رہی، اسی مطلوب حقیقی کی زلف کے پیچ و خم کے تصور میں محو ہو جا اور ختن میں داخل ہو جا جس کی فضا نافوں کی خوشبو سے لبریز ہے یا جو ہر ایک خوشبو کا سرچشمہ ہے۔ اس شعر میں رعایت لفظی اور معنوی کی اعلیٰ مثال ہے۔ نافہ غزالہ کو "رمیدہ"، کہنا لفظاً اور معناً صحیح ہے۔ کہ ہرن بھی "رم" کرتا ہے۔ اور نافہ کی خوشبو بھی پراگندہ اور منتشر ہوتی ہے۔ زلف میں بھی گرہیں، پیچ اور خم ہوتے ہیں اور تذکر و تفکر میں سرزبانوں کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے تو یہ بھی مگرہ کی شکل ہے، مطلب یہ ہے تو سیر دل میں اتنا انہماک اور استغراق پیدا کر کہ بیرونی دنیا و مافیہا سے غافل ہو جا، بیرونی دنیا عالم کثرت ہے اور کثرت میں پریشانی ہے۔ عالم دل میں خلوت ہے اور سکون اور راحت ہے اور مطمئن ہو کر جستجو حقیقت کرو وہ اسی دل میں ہے تجھ کو بیرونی دنیا میں نہیں ملے گی۔

ز سروش محفل کبریا ہمہ وقت میرسد ایں ندا

کہ بخلوت ادب و وفا ز درہروں نشدن در آ

الہام کہہ کبریائی سے تجھے ہر وقت یہ آواز آرہی ہے کہ خلوت دل

وہ مکان ہے کہ اس کے باہر تو تیری نگاہ بے محابا دھڑا دھڑوڑتی رہے گی۔ تو اس مکان کے اندر ہی رہو اور اندر ہی اندر اس میں داخل ہو۔ داخلہ ہمیشہ کسی جگہ باہر سے ہوتا ہے اور مکان یا مقام ہی منزل گاہ ہے اس لئے تو مکان دل میں داخل ہو جا۔ اور پھر باہر نکلنے کا نام نہ لے۔ اگر تحقیق مطلوب ہے تو پہلے ”خلوت“ پیدا کرو۔

ہر سخن سنجے کہ خواہد صید معنیہا کند
چوں زباں می باید اول خلوت پیدا کند

گفتگو تو زبان ہی سے ہوتی ہے۔ مگر زبان تو محض ایک آلفاظ و صوت ہے۔ خیال اور الفاظ بیک وقت دل ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے اس لئے سخن گو اگر یہ چاہتا ہے کہ معانی کا شکار کرے تو جس طرح شکاری تنہا گھات میں بیٹھتے ہیں اور جس طرح زبان منہ میں خلوت نشین ہے پہلے خاموشی سے دل پر نظر کرے اور دیکھے کہ کیا کیا معانی اس پر الہام کردہ حروف و صوت سے منکشف ہوتے ہیں ”چوں“ جمع شد معانی گوئے بیاں تو اں زد“ خلوت کے بغیر جمعیت دل حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب تک یہ نہ ہو خیالات پریشاں اور پرانگندہ ہی رہیں گے اس لئے

دل جمع کن از کش مکش و ہر بروں آ
کیں بحرِ در آغوش گہرِ ریخت کراں را

بحر پانی کے قطروں کا ہی مجموعہ ہے۔ مگر جو تہو ج اس میں پیدا ہوتا رہتا ہے وہ قطروں کو پرانگندہ ہی رکھتا ہے۔ اس لئے کسی قطرہ کو جمعیت حاصل نہیں۔ موتی بھی قطرہ آب ہی ہے مگر جمعیت حاصل ہے۔ اور خلوت بھی اور بحرِ بے پایاں اور طوفان موج افزا میں امن و راحت میں رہتا ہے، اس بحرِ عالم میں بھی کش مکش اضطراب امواج کی

بیدل

طرح ہے۔ اگر تجھے گہر کی طرح جمعیت حاصل ہو تو اس بحر سے باہر نکل کر
بھی جمعیت ہاتھ سے نہ دیگا۔ اور ہمیشہ کنار عافیت سے ہمنار رہے گا۔
”بے نیاز از بحر گردد قطرہ چوں گوہر شود“

نیز:-

خاطرت گرج جمع شد از ہر دو عالم فارغی
قطرہ وارے چوں گہر زیں بحرے پایاں برآ
ز سیر عالم دل غافلیم ورنہ جناب

سرے اگر بگریاں فرو برد دریا ست

جناب اور دل کی شکل و صورت بھی ملتی جلتی ہے، ہم بیرونی دنیا میں
اسی طرح بھٹک رہے ہیں جس طرح پانی کا بلبلا سطح بحر پر موجوں کے
ساتھ بہ رہا ہو۔ اگر ہمارا دل، یہ جناب ذرا گریبان میں منہ ڈالے تو اسے
فوراً معلوم ہو جائے گا کہ میں تو دریا ہوں۔ یہ دعویٰ انا الموجود، اور یہ
سر بلندی، اور ہوائے غرور جو جناب کے سر میں سمائی ہوئی ہے اسی وقت
تمک ہے جب تک وہ اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا اور
جب دیکھے گا تو ہوا نکل جائے گی اور وہ دریا میں جو اس کی اصل ہے محو
ہو جائے گا۔ جناب اگر سر بلندی کے خیال میں محو نہ ہو اور ذرا جھک کر
اپنے نیچے نظر کرے تو اس کو اپنی حقیقت جو دریا ہے معلوم ہو جائے گی، یہاں تو
عجز درکار ہے اور بندگی سے سب کچھ ملتا ہے۔

بارگاہ نیاز دار و فروتنی تازہ سر بلندی

بخاک روزے دوریشہ گی کن دگر بال و شجر پروں

بروں دل نتوان یافت ہر چہ خواہی یافت

کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست

یہ لاجواب شعر ہے۔ جو کچھ بھی تو چاہتا ہے وہ کچھ دل ہی میں ملے گا۔

دل سے باہر ہرگز نہیں مل سکتا۔ تجدد و امثال کے تحت ہم بیدل کے نظریہ تحقیق پر بحث کر چکے ہیں نظریہ یہ ہے کہ جب ہم کائنات پر نظر کرتے ہیں تو اسے عالم صورت یا امثال پاتے ہیں جس کو محسوسات کہتے ہیں اور ہم صورتوں کے سوا کچھ اور محسوس کر ہی نہیں سکتے، یہی عالم امثال ہمارے آئینہ دل میں بھی منعکس ہو رہا ہے۔ اس لئے اب اہل دل جو اہل ذکر و فکر محققین ہوتے ہیں بیرونی دنیا میں سرگرداں نہیں ہوتے۔ اسی دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور استغراق کے بعد گوہر مقصود یعنی حقائق اشیاء معلوم کر لیتے ہیں، مشہور ہے کہ گنج خرابہ ہی میں مدفون ہوتا ہے، سعدی کہتا ہے کہ :-

کیمیا گر بہ غصہ مردہ و رنج ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج
حسن کا گنج گرا نمایاں تجھے مل جاتا
تو نے فرما دیا کھودا کبھی ویرانہ دل (اقبال)

ویسے بھی تمام معذنیات اور قیمتی جواہرات زیر زمین ہی ہوتے ہیں، شمع کا مطلب یہ ہے کہ وہ کونسا خزانہ ہے جسے تو اپنے آپ سے باہر ڈھونڈ رہا ہے وہ تو تیرے ہی دل خراب میں ہے۔ اور یہیں ملے گا۔ ”تدبیر“ کہتے ہیں کھودنے کو اسی کرید سے اسی تدبیر و تفکر سے تجھے حقیقت کا علم ہو گا۔

”جمعیت دل“ بخودی، انہماک اور استغراق سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جب ہم بیرونی دنیا سے غافل ہو کر اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ رگائیں تو گوہر حقیقت پالیتے ہیں۔

ہزار جلوہ در آغوش بخودی نحو است

جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب

یہاں خواب سے مراد انہماک و استغراق ہے جو توجہ کامل سے

بیدل

حاصل ہوتا ہے جس سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اسی کا نام بخودی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے، جو حضرات نفسیات سے واقف ہیں وہ شعور اور تحت الشعور اور لا شعور کی اصطلاحات سے واقف ہیں حقیقت عالم لا شعور میں ہے۔ لوگ تو شعور کے طالب ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اور وہاں پریشانی اور سرگردانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو ”خواب طلب“ تو تحت الشعور بلکہ لا شعور طلب کر۔ ایک رباعی میں لکھا ہے کہ:-

اشیا عرض خیال دیدن بود دست

اسما ہر افسانہ شنیدن بود دست

ایں جملہ ز خود بروں دویدن بود است

انسان گشتن بخود رسیدن بود است

فلسفہ خودی اور بخودی کو بیدل نے اس ایک رباعی میں بیان کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی خیال اور مادہ پرست فلسفیوں کا نظریہ بھی پیش کر دیا ہے کہ کائنات محسوسات میں سمع و بصر یہی اشیاء کا دیکھنا اور ان کو اسما سے تعبیر کرنا ہے جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ تمثال ہی ہیں، ہر حال محسوسات جو کچھ بھی ہیں انسان سے خارج میں موجود ہیں، اور انہی میں دوڑ دھوپ اپنے آپ سے باہر ہے۔ اور جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان سے علاحدہ اشیاء ہیں۔ ”انسان گشتن بخود رسیدن بود است“ خود شناسی خدا شناسی اور حقیقت رسی ہے۔

جمیت حواس در آغوش بخود لیست

از ہوش بہرہ نیست کسے را کہ مست نیست

عام خیال تو یہ ہے کہ جو مست اور بخود ہو وہ بے ہوش ہوتا ہے مگر بیدل نے شاعرانہ صنعت یہ پیدا کی ہے کہ افساد کو جمع کر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ بے ہوش وہ ہے جو مست نہیں کیونکہ بخودی میں مجبضہ حواس ممکن ہے۔

اور بخودی اور مستی ایک ہی بات ہے۔
 ان تمام محولہ بالا اشعار کا منہوم یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں تجد و امثال
 سرگرم عمل ہے اور زمان و مکان کی قید بھی ہے۔ اور امثال کے بدلنے اور
 دیگر امور متعلقہ کی وجہ سے ہمیں فرصت تحقیق ہی نہیں ملتی تو تحقیق کی کونسی
 صورت ہے؟ یہ عالم دل ہے جہاں ہر ایک واقعہ جو بیرونی دنیا میں رفت
 گذشت ہو چکا ہے اب پھر واپس نہیں آسکتا اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا
 نہیں ویسا ہی من و عن موجود اور محفوظ ہے۔ حافظہ کی مدد سے ہم اسے
 پھر حال میں لاسکتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ مستقبل میں واقع ہونے
 والا ہے اسے بھی حال میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے زمان و مکان صرف خارجی
 دنیا میں ہے دل میں یہ محو ہو جاتے ہیں۔ تذکرے زمانہ ماضی اور تفکر سے مستقبل
 کو ہم حال میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

نظارہ حضرت انسان کو آب گل سمجھتے ہیں

مگر اہل نظر ہستی کا اس کو در سمجھتے ہیں

مدعا دل بود اگر نیرنگ امرکاں ریختند

بہرائیں یک قطرہ خوں رنگ طوقاں ریختند

قیامت سے دماز پردہ خاکے کہ انساں شد (غالب)

عارف رومی کا بھی یہی ارشاد ہے کہ۔

اے برادر تو ہمیں اندیشہ مابقی تو استخوان و ریشہ

”زمان“ کیا ہے؟ واقعات یا حالات کو یکے بعد دیگرے مشاہدہ کرنا،

مکان کیا ہے؟ حالات کو کسی خاص مقام میں دیکھنا۔ چونکہ زمان و مکان

بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہم غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ”حال“ بدل

رہا ہے جو مکان و زمان سے علاحدہ نہیں دیکھ سکتے۔ حالانکہ ہم ہر حال میں

حال ہی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماضی معدوم اور مستقبل موہوم امور ہیں

بیدل

حال ہی معلوم ہے۔

”تجدد امثال“ پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے مختصر مگر فہم و تفہیم کے لئے کافی بحث کر چکے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ”دل“ ہی ہے جس کی سیر ہماری تخلیق کا منشا ہے، بیدل اکثر اشعار میں اسی پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ باہر ہے تو اس سے اور وہ تجھ سے بے تعلق نہ بھی ہو پھر بھی یہ سمجھ لے کہ تیرا دل یا قلب یا ذہن بیرونی دنیا سے افضل شے ہے۔ اس لئے تو مسجود ملائک ہے اور تمام کائنات تیرے ہی لئے مسخر ہو چکی ہے۔

انسان کہ فلک ہاست سرافکنندہ او
در حیرت او گم است دانشدہ او
دارد خاصیت کہ در خارج و ذہن
ہر چیز کہ آفریدہ شد بشدہ او

تیرا راز پانہ سکے ملک تیرا بار اٹھانہ سکے فلک
کوئی پہنچا تیری نہ گرد تک وہ ہیں دور تر تگ تاز میں
یہ سمک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا

جسے تو سمجھتا ہے دور تر ہے قریب راہ دراز میں

خودی | انسان کی بلندی مرتبہ پر بیدل نے جو کچھ لکھا ہے کوئی
کیا لکھے گا اور اس کے ضمن میں خودی اور بخودی پر۔

جو حکیمانہ بحث کی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ سرِ دست
ہمارا مقصد اتنا ہی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔ اگر خدا
نے توفیق عطا فرمائی تو تفصیلی بحث بھی کی جائے گی۔ خودی سے مراد
خود شناسی ہے، انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا صحیح مقام کائنات

ہیں کیا ہے، اور یہ کہ اس مقام کا تقاضہ اور مطالبہ کیا ہے؟ جب یہ راز اس پر منکشف ہو گیا تو وہ سمجھ جائے گا کہ تمام کائنات اس کے سامنے جھکتی ہے، وہ صحیح معنی میں ”خلیفہ فی الارض“ ہے۔

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی و بیخودی ایک خاص مقصد کا حامل ہے۔ اور بلاشبہ قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، بیدل نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے علامہ اقبال کی نظر بھی اس پر ہے اور علامہ کے اکثر اشعار میں بیدل کا تخیل کار فرما ہے۔

بیدل کہتا ہے :-

بیدل بحصول رزق آمادہ سیر سگ چاکر سگ نگشت خربند زخ
از مخترعات کارگاہ امکاں این تنگ شعور نیست جز صنع بشر
طبقہ حیوانات میں حاکمی اور محکومی صرف عالم انسانی میں مشاہدہ
ہوتی ہے۔ انسان تمام طبقہ میں باشعور حیوان ہے، امکانات میں سے
جو امر ممکن ہے وہ اسی تنگ شعور انسان کی اختراع ”حکومت“ ہے،
کہ اپنے ہی ہم جنس انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ اور حاکم و محکوم کا
امتیاز پیدا کر رکھا ہے۔ بیدل اس چاکری اور بندگی کے اسباب کی
تشخیص بھی کرتا ہے، کہ یہ احتیاج رزق ہی ہے، اور کثرت رزق کی
طلب اور اس کے لئے زہ اندوزی کی ہوس، بیدل اس کی نہایت
کرتا ہے۔

امروز قدر ہر کس مقدار مال و جاہ است

آدم نمی توان گفت آن را کہ خربنا شد

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج ہر ایک شخص کی قدر و منزلت مال و

جاہ کی مناسبت کے ساتھ ہے، یہ بار دنیا بخوابل مال و دولت نے اپنی

پشت پر اٹھایا ہوا ہے گاؤ و خربہ کا کام ہے۔

بیدل

فلک تکلیف جاہست گرد ہد فال حماقت زن
 کہ غیر از گاؤں نتواند کشیدن بار دنیارا
 مشہور ہے کہ کرۂ ارض گائے کے سینگوں پر ہے۔ اس لئے اگر آسمان
 نے تجھے دنیوی جاہ کے لائق سمجھا ہے تو یہ سمجھ تجھے آدمی نہیں بلکہ ”پشوا“ سمجھا
 کیونکہ گائے ہی دنیا کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

در ہمہ حال آدمی شخص ملک سیرت است
 لیک بجاہ اند کے ناز خرمی می کنند
 آدمی تو فطرئاً نیک ہی ہے اور بہر حال فرشتہ سیرت ہے مگر مال و
 جاہ کے ساتھ دولتیاں بھی جھاڑتا ہے یہ خری مال و جاہ ہی کا کرشمہ ہے۔
 کمال خواجگی در این سوف و اطلس است اینجا
 اگر این است عزت آدمی آن بہ کہ خر گردد
 اگر صوف و اطلس اور دیبا و حریر سے آدمی کی عزت ہے تو بہتر ہے
 آدمی گدھا بن جائے، جس پر زریں پالان ہو۔

بے زریں مستحق جوہر انسانی نیست
 آدم آنست کہ مال و چشمش خسر نکند
 اگر کوئی شخص بے زر ہو تو محض بے زری کوئی عیب نہیں، کیونکہ
 زرمعیار شرافت انسانی نہیں ہے، عموماً اہل علم بے زر ہی ہوتے ہیں،
 لیکن یہ ممکن ہے کہ آدمی جاہ و حشمت کے ساتھ گدھا ہو اس لئے آدمی وہ
 ہے جسے جاہ و حشمت گدھا نہ بنائے، گریہ دولت برسی مست نگوی مردی
 بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ

آخر ز فقر بر سر دنیا زدیم پا
 خلقے بجاہ تکیہ زد و ما زدیم پا
 میں نے فقر کے ساتھ دنیا کو ٹھکرا دیا، لوگ تو جاہ و حشمت پر

تکیہ لگائے بیٹھے ہیں میں نے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ اس لئے
ہمتے گرہست، پائے برسر دنیا زنید

بچوں گردوں خیمہ در عالم بالا زنید
اگر کچھ ہمت ہے تو دنیا کو ٹھکرا دو
آسماں کی طرح عالم بالا میں خیمہ گاڑ دو

کسی مقصد کے حصول کے لئے کچھ مناسب وسائل اور بالواسطہ
بازمات اور محرکات ہوتے ہیں اور ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے ”خود شناسی“
ممکن نہیں جب تک ”آزادی“ نصیب نہ ہو، اور آزادی حاصل نہیں
ہوتی جب تک پراگندہ روزی ہو، اور ”رزق کریم“ میسر نہیں ہوتا جب تک
احتیاج اغیار کی دستگیری پر مجبور کر رہا ہو، جو شخص اپنے ہی نفس میں
زیوں ہو اور بوجہ احتیاج ذلت محسوس کر رہا ہو وہ عارف حق نہیں
ہو سکتا۔ اس موضوع پر مزید بحث ہم بیدل کی اخلاقی شاعری کے
تحت کریں گے۔ سر دست دیکھنا یہ ہے کہ دنیا طلبی کس حد تک خود شناسی
کی سڈ راہ ہے؟ جس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں بھی ”حیوۃ الدنیا وزینتها“ کی مذمت کی گئی
ہے۔ دنیا کیا ہے جو نزدیک تر ہو، ”ادنیٰ“، شے نزدیک تر ہوتی ہے
اور عجلت اور سہولت سے ہاتھ آجاتی ہے اس کے لئے زیادہ جدوجہد کی
ضرورت نہیں ہوتی اور جوشے دور تر ہو اس کے لئے سعی بھی زیادہ کرنی
پڑتی ہے۔ مگر طبائع انسانی عجلت اور سہولت پسند واقع ہوئی ہیں۔
ادنیٰ شے دنیوی مفاد ہے جو محسوس اور نزدیک ہے۔ اور یہ ادنیٰ حیوانی
زندگی کے مناسب ہے۔ اور اس میں النعمان بہائم سے بڑھ کر نہیں۔
یہی خورد و نوش اور پوشش اور آرام و آسائش انسان بھی چاہتا ہے،
اور اس کے اسباب بھی نزدیک ہی موجود ہیں۔ جس سے دیگر حیوانات

بیدل

بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی زندگی ”حیوۃ الآخرہ“ ہے، بیدل نے اسی ادنیٰ حیوانی زندگی کی مذمت کی ہے اور اہل دولت و ثروت کو گاؤں و خرابیوں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی گاؤں و خرابی بننا پسند کرے تو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اور اس اعلیٰ مقام سے واقف نہ ہو گا جو حضرت انسان کا ہے۔ چونکہ اکثریت گاؤں و خرابی ہے اور اہل علم و ہنر اقلیت میں ہیں۔ اس لئے جو لوگ خود شناس ہیں ان کو فقر و فاقہ ہی میں زندگی اس وقت تک بسر کرنی پڑتی ہے جب تک نظام معاشرت و معاشیات میں انقلاب پیدا نہ ہو اور ان کو پیدا کرنا چاہئے۔ گاؤں و خرابی کی اجازت نہیں دیں گے مگر ان کی کوشش ضرور بار آور ہوگی۔ اہل علم ہمیشہ عسرت ہی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ خواجہ کی شکایت بجائے کہ

فلک بمر دم سفلہ دہد زمام مراد
تو اہل دانش و فضل ہمیں گناہست بس
اہل علم توکل پیشہ ہیں۔ لیکن توکل کا وہ مفہوم نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے، اور افسردہ دل ہو کر مایوسی کی تصویر بنے رہے۔ بیدل کہتا ہے کہ:-

فسردن گر ہمہ گو ہر بود بے آبرو باشد
بکن جہد آنقدر کہ ز خاک برداری توکل را
اگر افسردگی سرتاپا گوہر بھی ہو پھر بھی بے آبرو ہے تجھے اتنی کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ توکل کو خاک مذلت میں نہ ملنے دے۔
دل از خمار طلب خون کن و شراب طلب
جگر بتشنہ بی واگذار و آب طلب
مباش ہچو گہر مردہ ریگ ایں دریا
نظر بلند کن و ہمت جاب طلب

زعافیت نتوان مُرثدہ کشایش یافت
بدل شکستے اگر ہست فتح یاب طلب
مترس از زخم ناسورائے جراحات دل

بزلف یار بزن دست و مشکتاب طلب

طلب کا احساس ایک فطری امر ہے۔ طالب ایسے مطلوب کو طلب کرتا ہے جو غائب ہو اگر مطلوب حاضر ہو تو طلب مفقود ہوتی ہے۔ پانی کی طلب پیاسا کرتا ہے، جسے پیاس ہی نہ ہو پانی طلب نہیں کرے گا جب پانی ہاتھ آئے اور پی لیا اور پیاس بجھ گئی تو طلب غائب اور مطلوب حاضر ہو گا۔ افسردگی اسی حالت میں ہوتی ہے جب جدوجہد کی طاقت نہ ہو۔۔۔۔۔ اور طاقت ہو اور عمل میں نہ آئے، اس لئے ادنیٰ حیوانی زندگی کے اسباب کی طلب جلدی ہی افسردگی پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ محدود ہے، لیکن اعلیٰ زندگی کی کوشش کا اجر غیر ممنون ہے۔ اس کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ بیدل اس لئے بہشت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا کہ وہ مقام عافیت ہے۔

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بدائے نہ طید دل چہ مقام است
بیدل کہتا ہے کہ انسان خود شناس ہو نہیں سکتا اگر افسردہ ہو۔

بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو زاشک آنہم کم نہ، قدے ز آبدہ پا طلب
ز مراد عالم آب و گل، بدر جنوں زن و اگل
اثر اجابت منفعیل ز شکست دست و عا طلب
طلب تو بس بودا یں قدر کہ ز معنی تو بیری اثر
بخودت اگر نہ رسد نظر بخیاں بیچ و خا طلب

بیدل

چہ خوش آنکہ ترک سبب کنی، بقیں رسی و طرب کنی
 ز حقیقت آنچہ طلب کنی بطریق بیدل ما طلب
 ان اشعار میں بیدل بلند ہمتی اس درجہ تک واضح کرتا ہے کہ اسباب
 کی تلاش تکمیل مقصد کے لئے کم ہمتی ہے۔

اگر از نام خضر آگاہ باشی ہمہ گر منزلے در راہ باشی
 خضر کا کام تو منزل کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور خضر کی ضرورت
 اسی وقت تک ہے جب سالک منزل سے دور ابھی راستہ میں ہے۔ جب
 منزل پر پہنچ گیا تو خضر کی ضرورت یا طالب ختم ہو گئی۔ خضر ایک سبب
 ہے یا وسیلہ ہے اور مقصد منزل ہے، اگر تو منزل پر پہنچ کر بھی خضر کو یاد
 کر رہا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے تو ابھی راہ میں ہے۔ ان اشعار میں بیدل ترک
 اسباب کی تلقین نہیں کرتا۔ اسباب کی طلب تو بہر حال رہے گی مگر
 بیدل یہ کہتا ہے کہ اسباب کی تلاش اپنے وجود سے خارج میں نہ کر اگر
 تجھے عافیت مطلوب ہے۔ یعنی جس منزل پر تو پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے
 نہ تو کسی رہنما کو تلاش کر اور نہ عصا کا سہارا لے۔ یہ سب خارجی اسباب ہیں
 اور ان کی احتیاج کا احساس تجھے آخر افسردہ بنا کر رکھ دیگا۔ البستہ آنسو
 تیرا ہے اور تیر ہی ہی آنکہ سے ٹپکتا ہے اور مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو
 مارے رنج و غم کے آنکھوں سے گرتا ہے، رونا اسی بات کا ہے کہ
 جو مقصد تو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے اسباب تیرے ہی وجود میں
 موجود ہیں بہر حال آنسو ایک قطرہ آب ہے، حیرت شے سہی، تو کیا اس سے
 بھی گیا گزرا ہے۔ منزل تک سفر طے کرنا قدم کے بغیر ممکن نہیں تیرا
 آنسو ”آبلہ پا“ ہے۔ ”آبلہ پا“ وہ شخصیت ہے جس کے پاؤں میں چھلے
 ہوں اور چھالے سفر سے ہی پڑتے ہیں، تیرا آنسو سراپا ”آبلہ پا“ ہے۔
 تو قدم اسی سے طلب کر کہ بے دست و پا رواں ہے۔ یعنی خارج اسباب سے

قطع نظر کر، اسباب اور محرکات وغیرہ سب تیرے ہی وجود میں موجود ہیں۔ اس عالم آب و گل کو عالم اسباب کہتے ہیں تو اس سے قطع تعلق کر، جنوں کا دروازہ کھٹکھٹا۔ دعائیں مانگنا تو ان کا کام ہے جو مایوس افسردہ خاطر ہوں۔ جب ان کی اپنی کوشش سے مقصد حاصل نہیں ہوتا تو غیر کے آگے دست سوال دراز کرتے ہیں: ”لیس للانسان الا ما سئى“ ہمت مروانہ کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش نہ پھوڑے۔ عالم اسباب انسان سے خارج ہے۔ اس کے آگے دست دعا دراز نہ کر، اگر تو چاہتا ہے کہ تیری دعا قبول ہو تو دست دعا کو توڑ دے اثر اجابت منفعل، وہ اثر جو قبولیت پر مؤثر ہے خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ لوگوں نے ایام جاہلیت میں اسی عالم آب و گل کو اپنا حاجت روا سمجھ رکھا تھا اور جل دیوتا اور اگنی وغیرہ کے حضور پرا رتھنا کرتے تھے، یہ سب ہماری ہی خدمت پر مامور ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے لطیف بات یہ پیدا کی ہے کہ عالم اسباب میں سرگردانی اور مقصد کے لئے اسباب کی تلاش عقل کا کام ہے تو جنوں کا دروازہ کھٹکھٹا اور عقل حیلہ گر کے فریب میں آکر عالم اسباب میں پریشان نہ ہو۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام یہ۔ کی جانے گی۔ تیری طلب کی انتہا تو اتنی ہے کہ عالم صورت میں حقیقت آشنا ہو اور یہ حقیقت تجھے سیرداں یا انفسی ہی میں مشاہدہ ہوگی۔ اگر تو خود شناس نہیں ہے تو پھر عالم خیال میں خدا کو طلب کر، اسی کے ہم معنی یہ شعر بھی ہے کہ۔

حبیب بزوج طرنگاہ حضور دریا ست

نکر خود کن گرت اندیشہ رب باید کرد

گم شدہ تحقیق خود آوارہ وہم است

مارا بگزارید بدرد طلب ما

بیدل

لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نسبت عجب ابلہ فریب باتیں اختراع کی ہیں۔ بعض تو یہ دعوائے کرتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول ہوتی ہیں، ایسے مستجاب الدعوات مرجع جہلا ہیں۔ ان کی دُعا کیا ہے حکم ہے اور خدا کو ماننا پڑتا ہے، حضرت ابراہیم کی دُعا باپ کے حق میں قبول نہیں ہوئی۔ نوح کی بیٹے کے حق میں رد ہوئی ہے۔

آخری شعر میں بیدل کی تلقین یہ ہے کہ ترک سبب کن، سبب کو مسبب الاسباب نہ سمجھ۔ تو یقین یعنی ایمان کے درجہ پر پہنچ جائے گا۔ اگر تو اس حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو طلب بھی اس طریق سے کر جس طرح بیدل کر رہا ہے۔ گذشتہ از میر مطلب تمام شد مطلب، اس تشریح کے بعد اب اشعار محولہ بالا کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

دل از خار طلب خو کن و شراب طلب الخ

یعنی پہلے احساس طلب ہوتا چاہئے، اور طلب کو مطلوب سے کچھ مناسبت بھی ہونی چاہئے۔ پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے رنج خمار شراب ہی سے رفع ہوتا ہے۔ طلب مثل خمار اور تشنہ بی ہے۔ جب اس کا احساس ہوگا تو بقدر شدت خود بخود ایک تحریک حصول مطلوب کے لئے پیدا ہو جائے گی۔ لیکن احساس طلب باہر سے نہیں آتا، ہمارے ہی وجود میں ہے، اس کی تسکین بھی ہم ہی محسوس کرتے ہیں۔ گہر کی طرح قعر دریا کی ریت میں مُردہ کی طرح مدفون نہ ہوا اپنی نظر بلند رکھ، حباب کی ہمت دیکھ کہ سطح دریا پر پھر رہا ہے، ”فتح باب“ در مراد کا کھلنا، اگر دروازہ کھلا ہو تو ہم مکان میں بے تکلف داخل ہو سکتے ہیں عاقبت یعنی آرام طلبی سے کشائش کار ممکن نہیں۔ اگر تیرا دل شکستہ ہے تو سمجھ دروازہ مُراد کھلا ہے، اگر بند ہوتا تو توڑنا ہی پڑتا کہتے ہیں کہ زخموں کا علاج مومیائی سے ہوتا ہے اور یہ مشک سے تیار ہوتی ہے۔

مشک کوزیتوں کے تیل میں ملا کر زخم پر لگاتے ہیں تو مند مل ہو جاتا ہے۔ جراثیم دل یعنی دل کا زخم اگر ناسور کی صورت اختیار کر لے تو گھبرانانہ چاہئے۔ یار کی زلف تک دست درازی کر اور وہاں سے مشک ناب طلب کر ان اشعار میں بھی بیدل افسروگی اور مایوسی کی مذمت کرتا ہے کہ ہمت مردانہ کے مناسب نہیں۔

ہمت بلند دار کز اسباب اعتبار

بے عزتیت آنچہ نیاید بکار مرد

”اسباب اعتبار“ ہر ایک شے کسی اسم سے تعبیر ہوتی ہے اس لئے کائنات کی اشیاء ”اعتبارات“ ہیں، کوئی شے معتبر نہیں ہو سکتی جب تک میز اور کسی نام سے موسوم نہ ہو۔ کائنات میں ہر ایک شے کارآمد ہے مگر ”بے عزتی“ ایک ایسی شے ہے جو مردوں کے کسی مصرف کی چیز نہیں۔ یعنی ہمت مردانہ کبھی بے عزتی گوارا نہیں کرتی۔ بیدل کہتا ہے کہ۔

بہ کہ بروز حشر باز کنی پیش کریم

ورنہ ز کم ہمتیت غدر گناہ خواستن

تو نے قیامت کے دن کریم کے حضور پیش ہونا ہے۔

بجناب کرم افسون دروغ پیش مبر

بے گناہی گنہ نیست کہ آنجا بخشند

بخشش تو گناہ کی ہے۔ بے گناہی ایسی شے نہیں کہ کریم کے حضور

پیش کی جائے۔

ز ساز مجید رحمت ہمیں نواست بلند

کہ اے عدم صفات کاش کے گناہ کنید

درگاہ رحمت سے یہ آواز بلند آہنگی سے آرہی ہے کہ ”لا تقنطوا

من رحمت اللہ“ انسان کیا ہے ”لم یکن شی مذکوراً“ عدم تھا،

اور عدم میں محو ہو جائے گا۔ اگر اس سے گناہ بھی سرزد ہو تو غنیمت ہے بلکہ اعجاز ہے۔

ماجرالم کن زنی رنگ بد و نیکم پیرس
من عدم بودم عدم چیزیکہ بود آوردہ است
از چمن تا انجن جوش بہار رحمت است
دیدہ ہر جا بازی گرد و دو چار رحمت است
کو دماغے آنکہ ما از تا خدا منت کشیم
کشتی بیدست و پایتہا کنار رحمت است
احسان تا خدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ پھوڑدوں لنگر کو توڑدوں (ذوق)
خواہ ظلمت کن تصور خواہ نور آگاہ باش

ہرچہ اندیشی نہاں و آشکار رحمت است
قدردان غفلت خود گر نباشی جرم کیست
آنچہ عصیاں خواندہ آئینہ دار رحمت است
وحشی دشت معاصی را دور وزے سر و ہید

تاکجا خواہد رسید آخر شکار رحمت است
حقیقت بھی یہی ہے کہ واجب ہے انسان غلطی کرے اور گناہ اور غلطی
ایک ہی بات ہے اگر غلطی نہ کرے گا تو بہائم سے بہتر ہوگا کیونکہ بہائم غلطی
نہیں کرتے یا خدا بن جائے گا کیونکہ ذات باری ہر ایک عیب سے
پاک ہے انسان تو خدا ہو نہیں سکتا۔

یہ ممکن است روداغ بندگی ز جبین
زمین فلک شود و آدمی خدا نشود
الہستہ بہائم سے بدتر ہو سکتا ہے، غلطی اس لئے واجب ہے کہ

انسانی ذہنی ارتقاء اسی میں ہے انسان کبھی کامل نہیں ہو سکتا وہ صرف ذات الہی ہے۔ آفرینش سے انسان غلطی کرتا رہا ہے اور ترقی بھی کرتا آ رہا ہے، بہائم غلطی نہیں کرتے اور ایک ہی حالت میں آفرینش سے ہیں۔ بقول بیدل ”بے مصلحت نیست ظہور شیطان“ یہ ممکن ہے کہ انسان بہائم کی طرح غلطی نہ کرتا، گناہ نہ کرتا، مگر وہ انسان نہ ہوتا، گاؤں نہ ہوتا۔ لیکن غلطی ہو یا گناہ اراداً کرنا انسانیت کے شرف کو بڑھ لگانا ہے۔ سہواً ہو تو اس کا ازالہ کرنا چاہئے اور یہی ذہنی ترقی کا مطالبہ اور تقاضہ ہے۔ بہر حال غلطی انسانی امتیازی خوبی ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی جس کا تعلق بالواسطہ ”خودی“ سے ہے۔ عموماً اہل تصوف پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور کسی حد تک بجا بھی ہے کہ تصوف افسردگی سکھاتا ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ تصوف نتیجہ بیکاری ہے۔ اگر کوئی اور کام کرنے کا ہوتا تو اس طرف توجہ ہی کون کرتا۔ اور ناداری کا نتیجہ افسردگی ہے۔

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد

غافل نام فضولی را تصوف کردہ اند

لیکن ایک بات ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہئے اور اس ضمنی بحث میں ہم نے اسی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اہل علم کو مجبوراً فقر و فاقہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ علم سے کنارہ کش ہوں اور اہل دنیا کی طرح بہائم کی زندگی بسر کریں، ورنہ اس کے سوا جیسے کہ حالات ہیں چارہ نہیں کہ بُری بھلی زندگی جیسی بھی ہے بسر کریں، لیکن ان حالات میں خود داری یا وضع داری کو خوش اسلوبی سے نبھانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے اکثر اہل علم نے امر کی سرپرستی قبول کی۔ اس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔ پہاڑ عنصر کے تحت ہم بیدل کا نظریہ مدح و ذم بیان کر چکے ہیں کہ حقیقت بھی

میدل

یہی ہے کہ جب حکومت اہل علم کی سرپرست ہو تو وہ اہل علم کی قوتِ فکریہ کو خرید لیتی ہے۔ تمام نامور شعرا بادشاہوں اور امرا کے مداح ہی گذرے ہیں۔ یہ دیروزہ گری خود داری کے منافی ہے۔

کاش مدح و ذم سے ناواقف رہیں اہل سخن
آبرو کو بچتے ہیں بے خبر گو ہر فردش
آبرو کے بارہ میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

بے تامل مٹیواں طے کرد صد دریائے خوں
ایک نتواں از سربیک قطرہ آب روگذشت

آنچہ نتواں داد جز دردست محبوباں دل است

و آنچہ نتواں ریخت جز درپائے خوباں آبرو است

جب لوگوں نے دیکھا کہ اکثر صوفیہ کرام گوشہ نشین فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف ناداری اور افسردگی سکھاتا ہے اور جب ان کے کلام میں مسئلہ ”فنا“ مطالعہ کیا تو اکثر اہل علم نے بھی ٹھوکر کھائی، خود خانقاہ کے پیروں کے حالات بھی اس کی تائید میں تھے اور ہیں اس لئے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ صوفی اور ہندو سادھو اور مسیحی رہبان ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں۔ ترک دنیا صرف ایک ڈھونگ ہے، بقول ”گبن“ ترک دنیا سے دنیا زیادہ ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں، صوفیہ کرام محققین ہیں اور تحقیق کا مطالبہ ہے کہ یک سوئی ہوتا کا کامل توجہ مطلوب و مقصود میں مرکوز ہو۔ اس کے لئے ایک عمر چاہئے، حافظ کہتا ہے۔

سحر گہ رہوے در سر زینے ہمیں گفت این معمر باقرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ بودشا کہ در شیشہ بماند از بعینے

ایک سالک نے یہ بات استعارہ میں اپنے اصحاب سے کہی کہ شراب اس وقت صاف ہوتی جب اس میں ”درد“ تاپلچھٹ کا شائبہ تک نہ ہو، جب وہ شیشہ میں چالیس سال رہتی ہے۔ چالیس سال عمر کا بہترین حصہ بلکہ منتہائے عروج ہے، آج کل تو جوانی پچیس حد میں سال پر ختم ہو جاتی ہے مگر سلف صالحین اس کو لڑکپن کا زمانہ سمجھتے تھے، اور جوانی کی اشد قوت اور بلوغ چالیس قرار دیتے تھے، اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ”ہر کسے را بہر کارے ساختند“ اور جس کام کا کوئی اہل فطرت ہوتا ہے اس کام کی آفت اس کے دل میں ہوتی ہے، یہ کہنا چاہئے کہ ہر ایک کام خواہ صنعت و حرفت ہو یا کچھ اور ایک فطری مناسبت ہر ایک طبیعت سے رکھتا ہے اور ہر ایک شخص پیدا آئشی اس کام کا اہل ہوتا ہے جو اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اگر وہ اس کام میں لگ جائے اور حالات بھی سازگار ہوں تو اس میں ”اختراع“ اور ”ایجاد“ بھی کرتا ہے اور مستند استاد مانا جاتا ہے، ”سورہ نازعات“ میں یہی بیان ہے، لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوں تو بیدل کہتا ہے کہ۔

اے بسا روشن دے کز بے نیاز یہائے شوق

چوں فروغ مہر بر خاک سیاہ افتادہ است

اکثر اہل دل ایسے بھی ہیں کہ آسمان رفعت پر آفتاب کی طرح جلوہ افروز ہیں مگر ان کے فیض کی شعاعیں خاک سیاہ پر پڑ رہی ہیں، انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی ان کی مدح کرتا ہے یا ذمہ، اور یہ کہ ان کے نور کا اکتساب نا اہل کرتا ہے یا اہل۔

اے بسا آئینہ کز کسوت زنگاریش

یوسف ستانے بخلوت گاہ چاہ افتادہ است

کئی آئینے ایسے ہیں کہ اپنے لباس کی رنگینی کی وجہ سے حسن یوسف کو

بیدل

جلوہ دیتے ہیں مگر یہی سبب ان کے کنوئیں میں گرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ تنہا ہوتے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا۔

معنی اقبال فقر از غافلاں پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں دشتگاہ افتادہ است
غافل لوگ کیا جانیں کہ خاک نشیں فقرا کی گودڑی میں کیا لال
چھپے ہوئے ہیں۔

یہ امر کہ جو ہر ذاتی اور وصف اضافی میں کیا فرق ہے؛ بیدل بتاتا ہے کہ۔

ہیچو شبنم از تامل دیدہ گر وا کنی
برگ برگ این چمن جز لوح استعداد نیست
اگر تو شبنم کی طرح آنکھ کھول کر دیکھے تو تجھے صاف نظر آئے گا کہ اس
باغ کا پتہ پتہ ”لوح استعداد“ ہے، شبنم ہر ایک پتہ پر پڑتی ہے اور اسے
ہر ایک پتہ کا حال معلوم ہے کہ کس قابلیت کا مالک ہے۔

جو ہر ذاتی است موزونی نہ کسب عارضی
گل بسعی پر نشانیہا چہ سرو آزاد نیست
جسے موزونی کہتے ہیں اور یہی حسن و خوبی پیدا کرتی ہے، وہ جو ہر ذاتی
ہے، فطری قابلیت ہے، کسی اور عارضی نہیں، یعنی کسب و اکتساب سے
حاصل نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو عارضی چند روزہ ہوتی ہے، گل اپنی وضع
میں گل ہے مگر ناممکن ہے کہ خواہ کتنی سعی کرے سرو کی طرح بلند و بالا ہو،
اور سرو گل نہیں بن سکتا۔

باغباں گر خوں خورد ابرو بر خاک ریز
فیست، گل غیر از گل و شمشاد جز شمشاد نیست
باغباں خواہ خون پسینہ ایک کر دے اور ابر اپنی آبرومٹی میں ملا دے۔

یعنی دن رات برقرار ہے، دونوں کی متفقہ انتہائی کوشش بھی پھول کو شمشاد اور شمشاد کو پھول نہیں بنا سکتی۔

ہم بقدر صافی است آئینہ تمثال آشنا
فہم ذاتی گر نباشد، پیچ کس استاد نیست
آئینہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی صاف اشیاء کا عکس اس میں ظاہر ہوگا۔ آئینہ میں فطری قابلیت ہے کہ تمثال نما ہو، خواہ جی تاثرات کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس کی سطح ملکہ ہو، اے اس کی فطری قابلیت کا اظہار نہ ہو۔ مگر جب بھی یہ کدورت رفع ہوئی وہ تمثال نما خورد خورد ہوگا۔ اسی طرح جسے مجاہدہ اور ریاضت کہتے ہیں وہ عارضی کدورت کا آئینہ دل سے رفع کرنا ہے، مجاہدہ حاقہ اور ریاضت شاقہ آئینہ میں وہ قابلیت پیدا نہیں کر سکتی جو اس میں فطری جوہر ہے، اس لئے اگر فہم ذاتی نہ ہو تو کوئی شخص مستند مدبر اور اپنے فن کا استاد نہیں مانا جائے گا۔

موجہا یکسر بہ تیغ شوخی خود بسل اند
دل طیش فرماست اس جا حاجت ارشاد نیست
امواج دریا میں اضطراب ذاتی ہے اور شوخی میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ موج کی صورت اور شکل بھی تلوار سے ملتی جلتی ہے اور تلوار بھی آبدار ہوتی ہے۔ موجوں کی تلواریں ایک دوسرے کو گھائل لپیٹا کر رہی ہیں، اسی طرح جہاں دل ہے وہاں طیش ہے اس کے لئے کسی بیرونی تحریک یا ارشاد کی ضرورت نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فطری قابلیت مقدم ہے اس کے بعد مناسب اسباب جو اس قابلیت کو ظاہر کریں، اور ایک دانہ میں قابلیت تو ہے کہ وہ شجر بن جائے اور پھول اور پھل لئے لگے مگر اس کے لئے قابل زمین اور آبیاری کی ضرورت ہے جو خورد و نوش کا سامان مہیا کرے۔ اگر مناسب

اسباب مہیا نہ ہوں تو فطری قابلیت اور استعداد کا ظہور نہ ہوگا۔ پکسلے () کہتا ہے کہ ”انسان خود فطرت () کی ایک صنعت () ہے، اس لئے انسانی فن یا آرٹ خود فطرت کی صنعت ہے۔“ انسان غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ آرٹ کا موجد وہ خود ہے حالانکہ فی الحقیقت فطرت ہے، بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ ”خود را بتو خود نمودن ہنر اوست“ یعنی یہ فطرت ہی ہے جو تجھ میں کار فرما ہے اور تجھ میں اپنی صنعت کا مشاہدہ کر رہی ہے، اور یہ بھی اس کا ہنر ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ ”میں ہوں“ ایک قائم اور کئے بڑھ کر کہتا ہے کہ اگر تو خود شناس ہے تو فی الحقیقت تو ہی ہے، تیرا غیر نہیں ہے، یہ وہم ہے کہ تو نے موثر اپنا غیر سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے کہ تیری نظر کثرت پر ہے جو خارجی اسباب ہیں اور تو اسی عالم اویام میں سرگرداں ہے، حالانکہ اگر تو نہ ہو تو سب کچھ بیخ ہے اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیرونی کائنات بھی تیرے قلب میں موجود ہے۔ ”ظاہر ایں جا باطن است و باطن ایں جا ظاہر است“ لیکن تیرے قلب میں ایک قابلیت ہے جو بیرونی دنیا میں نہیں۔ اس لئے تیرے قلب کو خارجی کائنات پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ اسباب خارجی محدود ہیں اور تیرے قلب کی قوتوں کا عمل غیر محدود ہے اس لئے اگر تو بلندی فہم وغیرہ چاہتا ہے تو اسی قلب کی سیر کر۔ جتنا کسی کا فہم بلند ہوگا اتنا ہی اللہ کا جو اصل مقصد ہے قرب حاصل کرتا جائے گا۔ اور جتنا پست ہوگا اتنا ہی اس کا خدا پست ہوگا۔ اصل مقصد ہمیشہ ہمارے فہم سے بالا تر رہے گا۔ اگر ہم اس کی سطح پر پہنچ جائیں تو ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ اور یہ ناممکن ہے۔ یہ سلسلہ تجد و امثال اور ارتقاء ہمیشہ جاری رہے گا۔ اگر یہ نہ ہو تو نظام عالم بھی قائم نہ رہے گا۔ اور موت و حیات کا تصور بھی محو ہو جائے گا۔

”خودی“ پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ منشاء حق یہ ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ مثنوی عرفان میں ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ کے تحت اس نے یہی بحث کی ہے، لیکن خودی کے اعلیٰ مقام پر انسان پہنچ نہیں سکتا جب تک پہلے شمشیر ”لا الہ“ سے تمام ماسویٰ کو فنا نہ کرے یعنی ”وحدت“ کا صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کثرت خارجہ کے تصورات کا اس کے دل پر ہجوم نہ ہو۔ اس لئے اسے سب سے پہلے ”از خود تہی“ ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

درد سر جہان در خوردانش است و بس

نیست بکسب عافیت غیر جنوں مفید ما

عقل اور عشق ایسا موضوع ہے جس پر حکماء نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے بحث کی ہے لیکن اس حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی محرک عقل نہیں جذبات ہیں۔ اگرچہ بیدل عقل و عشق کے اصطلاحی فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں کا دائرہ عمل و اثر بھی واضح کرتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ عشق ”عقل منجیہ“ کا دوسرا نام ہے۔

نیست تدبیر دواع در دسر کار کمی

بے تمیزاں عقل کامل راجنوں نامید اند

یعنی عالم اسباب خارجی میں سرگردانی عقل دور اندیش کی وجہ سے ہے، اور اس درد سے نجات کی صورت جنوں پیدا کرتا ہے۔ حقیقت میں تلاش مقصد میں جو کشش درکار ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہی ”درد سر“ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مقصد سے ہمیں دل بستگی نہ ہو۔ جب اس سے کامل اُلفت ہوگی تو یہ ذوق و شوق میں

بیدل

بدل جائے گا۔ یہی احساس ہے جس کی شدت اصطلاح میں ”جنون“ سے موسوم ہے۔ یہی وہ لوہے جو دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے، اور اسی دھن میں انسان اس مقصد کے سوا دنیا و مافیہا بلکہ اپنے آپ سے غافل ہوتا ہے صرف مقصد ہی مرکز توجہ ہوتا ہے اس میں انہماک اور استغراق کا نام جنوں ہے اٹھتے بیٹھتے پہلوؤں پر اسی کا ذکر اور اسی میں فکر، اسی کو جنوں کہتے ہیں۔ کفار مکہ آں حضرتؐ پر بھی یہی پھبتی جماتے کہ اس کو جنون ہے۔

”وادیٰ ایمن“ میں حضرت موسیٰؑ سے سوال ہوا کہ اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا؟ جواب دیا کہ ”عصا“ اس سے میرے ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ راعی رعایا کو اسی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ میری زندگی کا سہارا ہے، فرمایا کہ ہاتھ سے پھینک دے۔ جب پھینک دیا تو دیکھا کہ یہ سانپ ہے، بھاگنے لگے تو ارشاد ہوا کہ مت ڈر، اسے پکڑے یہ اپنی اصل سیرت میں تیرے ہاتھ میں کام کرے گا۔ یہ آیات ”تشابہات“ قرآن میں صحف موسیٰؑ کی ہیں، تاویل جو قرآنی محکمات میں کی گئی ہے یہ ہے کہ عصا ویرضیا دو ”برہان“ تشبیہی و تنزیہی تھے جو موسیٰؑ کو عطا ہوئے۔ عقل کا عمل ”تشبیہ“ میں ہے۔ یدِ بیضا نورِ حق ہے۔ یہ تنزیہ ہے۔ آفتاب کو آفتاب کے نور سے دیکھنا ہے تشبیہ میں اشیاء کی معرفت مماثلت اور مشابہت سے دریافت کرنا ہے۔ یہ عصائے کور ہے۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید

راستی رفت کہ مہنون عصایم کردند

کورماور زاد کو تشبیہ سے خواہ کتنا سمجھانے کی کوشش کرو کہ آفتاب

ایسا اور ایسا ہے وہ ہرگز دیدہ بینا کی طرح آفتاب کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔

استدلال عقلیہ کی نسبت علامہ محمود شبستری گنشن راز میں کہتے ہیں کہ

رہ دور و دراز است ایں رہا کن چو موسیٰ اندریں ترک عصا کن

عارف رومی کا ارشاد ہے کہ ”ایں عصا چہ بود قیاسات و دلیل“۔ اور یہ کہ ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ آفتاب کی روشنی باز غ ہے اس لئے از عصا و وز عصا کش فارغ است“

حقیقت یہ ہے کہ ”عقل“ ایک آلہ کار ہے۔ اگر ”نفس امارہ بالسوء“ کے ہاتھ میں ہو تو خطرناک سانپ ہے، توراۃ (کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ شیطان نے آدم و حوا کو سانپ کی شکل میں فریب دیا ”جو مخلوقات میں سب سے زیادہ عقلمند ہے“ اور اگرید بیضا قبضہ تصرف میں ہو تو سبحان اللہ، اس سے وہ کام نکلتے ہیں جن کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے ہم

مشاہد کر رہے ہیں کہ اہل ہوا و ہوس اس سے کیا کام لیتے ہیں، اور علماء و علماء اس کی خوبیوں کو کس طرح جلوہ دیتے ہیں۔ غالباً خواجہ حافظ نے بیدل کی نسبت ہی ارشاد فرمایا ہے کہ:-

بیسے در ہمہ احوال خدا با او باد

اونمیدیش و از دور خدا را می کرد

ویدش خرم و خنداں قدح یاد بدست

داندراں آئینہ صدگونہ تماشا می کرد

گفتم این جاں جہاں ہیں بتو کے داد حکیم

گفت آں روز کہ ایں گنبدینا می کرد

آں ہمہ شعبہ با عقل کہ می کرد آں جا

سامری پیش عصا وید بیضا می کرد

یہ تمام اختراعات و ایجادات بعبادتی دنیا میں ظاہر ہو رہی ہیں اہل علم و فضل عقل ہی سے کر رہے ہیں، اور اہل ہوا و ہوس ان سے وہ کام لے رہے ہیں جو محض شیطنیت ہے۔ بیدل عقل کی نفی نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ

مبدا

باہر کمال اند کے آشفگی خوش است
 ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباحث
 اس شعر پر علامہ اقبال مرحوم نے تفسیر کی ہے جو تبرکاً درج ذیل
 کی جاتی ہے، یہ اس شعر کی شرح بھی ہے۔
 تعلیم پر فلسفہ مغربی ہے یہ

ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
 پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا

ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
 ”محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی

اس دور میں ہے شیشہ عقاید کا پاش پاش
 مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنوں غلام
 ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
 کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا ہے مرشد کامل نے راز فاش
 باہر کمال اند کے آشفگی خوش است

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباحث

علامہ اقبال مرحوم کے اشعار کا یہ مطلب ہے، فلسفہ مغرب (یورپ اور
 امریکہ) ایسی ہستی کا منکر ہے جو محسوس نہ ہو، اس لئے وہ ہستی جسے مذاہب
 واجب الوجود تسلیم کرتے ہیں اور جو راز قیاس و گمان و وہم ہے مغربی
 فلسفیوں کے نزدیک محض توہم ہے، ایک بت ہے جو اہل مذاہب نے
 تراشا ہے اور اس کی ناویدہ پوچھا کرتے ہیں، حقیقت میں یہ موجود نہیں،
 اگر ہے تو ان لوگوں کے وہم میں ہے۔ علوم جدیدہ کی بنیاد محسوسات پر
 ہے۔ اہل مذاہب کے وہ عقاید جو مابعد الطبیعت پر مبنی ہیں وہ اب علوم جدیدہ

نے غلط قرار دئے ہیں، مگر فلسفہ زندگی کا نظریہ کچھ اور ہے اور یہ راز ہستی مجھے مرشد کامل بیدل نے بتایا ہے کہ محض عقل سے ہستی کی تحقیق نہیں سہل کی جاسکتی۔ اسے سلجھانے والا وہ ہے جسے اصطلاح میں عشق یا ”جنون“ کہتے ہیں جو عقل کی ضد ہے۔ بیدل تو عشق کو عقل کا مل کہتا ہے، یہ عقل خام ہے جو قیاسات وغیرہ ہیں۔

بیدل کو اس سے انکار نہیں کہ جو کچھ مادہ پرست فلسفی کہتے ہیں وہ ان کی اپنی حد نظر ہے جسے وہ تحقیق سے موسوم کرتے ہیں، ”مثنوی عرفان“ میں وہ کہتا ہے کہ مادہ پرست آخر کسی ہستی کے قائل تو ہیں خواہ یہ مادہ ہی ہو، مگر وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ محسوسات ہی سچ ہیں۔

بیدل یہ کہتا ہے کہ کائنات کو جس نظر سے دیکھو گے تمہیں وہی کچھ محسوس ہوگی، اگر یہ کہو گے کہ مادہ کے سوا اور کچھ نہیں جیسا پیر فلسفہ مغربی کہہ رہا ہے تو یہ ان کا اپنا قصور ہے، اس میں تھوڑی سی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کا انکار کرتے ہیں جو انھیں حواس ظاہری سے محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی موجودگی کا علم نہیں، عدم علم عدم نہیں ہے۔ امکانات اکثر پوشیدہ ہیں وہ اسی وقت محسوس اور معقول کہے جاسکتے ہیں جب منکشف ہوں ایک شخص کو ان کی موجودگی کا علم نہیں تو یہ کوئی وقیع دلیل اس دعویٰ کی نہیں کہ یہ فی الحقیقت موجود ہی نہیں۔ ایک شے جو محسوس ہو ضرور نہیں کہ خارج میں موجود ہو، ہمارے توہمات کا عکس بھی ہو سکتی ہے۔ تمام ذہنی امور خارج میں موجود نہیں ہوتے، اس لئے کسی شے کی صداقت کا معیار ہمارے پاس عقل ہے۔ محسوسات اگر معقول نہیں تو وہ توہمات ہیں۔ بقول امام غزالی محسوسات کی غلطی عقل ہی واضح کرتی ہے، مگر وہ خود بھی غلطی سے پاک نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو ذہنی ارتقاء ہی نہ ہوتا۔ جیسے بہائم کی حالت ہے انسان کی بھی ہوتی وہ غلطی نہیں کرتے مگر ترقی بھی نہیں کرتے۔

بیدل

کسی شے کی موجودگی کا احساس یا انکشاف کئی طریق سے ہوتا ہے، حسیات اور عقلیات کا منکر تو پیرفلسفہ مغربی بھی نہیں، لیکن یہ کافی نہیں۔ ہمارا دل کبھی کسی زمانہ میں اس سے مطمئن نہ تھا اور نہ ہوگا، ہر ایک زمانہ میں علماء کو ایک ایسے وجود کی جستجو رہی ہے جسے واجب الوجود یا حقیقۃ الحقائق کہتے ہیں، اور اس پریشان کن "کثرت" میں "وحدت" کی تلاش کرتے رہے ہیں، اور یہ مسلم ہے جسے "علم" کہتے ہیں وہ کثرت کو وحدت میں مشاہدہ کرنا ہے، جزو کو کل میں دیکھنا ہے، فروع کی اصل دریافت کرنا ہے، یہ حواس اور بقول علامہ اقبال "عقل خام سے ممکن نہیں، بقول بیدل "عقل کامل" سے ہستی کی گہنی سلجھ سکتی ہے جسے وہ "جنوں" سے تعبیر کرتا ہے۔

غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہئے، ارشاد قرآن ہے کہ جب اہل ذکر و فکر کائنات میں نظر کرتے ہیں تو اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "ربنا ما خلقت هذا باطلا"، اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کائنات باطل، عبث، بے نتیجہ پیدا نہیں کی، بیدل کہتا ہے کہ

گر عین و گراقتباس دریافتہ در انجمن حواس دریافتہ
بر دامن جسم پاک تحقیر مدونہ حق را بہیں لباس دریافتہ

حسیات ہوں یا عقلیات یا وجدانیات اسی کسوت مادی میں ان کا انکشاف ہو رہا ہے، اس لئے بیدل کو مادہ پرست کہو یا کچھ اور اس کا سب سے اتفاق ہے بشرطیکہ وہ اس انجمن حواس صحیحہ سے باہر نہ جائیں۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں محض صورتیں ہیں جن کو علامہ اقبال "پیکر" سے تعبیر کرتا ہے، ان پر جو حقائق منکشف ہوتے ہیں وہ عقلاً ہوتے ہیں لیکن یہ نظام حیات و عقلیات اجزاء فردہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اگر اسے "حق" نہ تسلیم کیا جائے اور تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک

اس کا مشاہدہ نہ ہو، اور یہ چشم عقل کامل یا ”جنون“ ہی سے ممکن ہے، مگر اس مقام پر استدلال عقلیہ بیکار ہے جیسا کہ انکشاف حقائق اشیاء میں حواس ظاہری معطل ہیں۔

بات یہ ہے کہ مادی دنیا میں عقل خوب کام کی چیز ہے لیکن اس سے کام خوش اسلوبی سے لینا اہل دل کا کام ہے، لیکن ایسے امور بھی ہیں جن کو ”ما بعد الطبیعیہ“ کہتے ہیں۔ وہاں عقل ناکارہ ہے۔ وہاں یقین اور ایمان اور وجدان کام آتے ہیں یعنی ”تشبیہات“ میں عقل اور تنزیہات میں عشق کار فرما ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو استدلال عقلیہ سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی، جب دیکھا کہ اس سے کام نہ چلا تو فرمایا:۔۔

هَلْ لَكَ اِلٰى اَنْ تَزْكٰى وَ اِهْدِ يٰك اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى

(۳:۳۰)

کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تیرا تزکیہ نفس ہو اور میں تجھے تیرے پروردگار کی طرف راستہ بتاؤں اور تو اس سے ڈرے۔

فرعون نے انکار کیا اور ہدایت سے محروم رہا۔ بیدل یقین کی نسبت لکھتا ہے کہ خواہ ”ہوس“ ہی ہو مگر کسب یقین سے عشق کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

دل مائل تحقیق نگر دید و گرنہ

از کسب یقین عشق تو اں کرد ہوس را

یعنی تحقیق یقین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں استدلال

عقلیہ ہی سے کام لیا جاتا ہے چشم بینا نہ ہو تو عصا ہی سہی، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ ”یقین خفتہ در ہر پردہ ظن“ تمام احوال اور ظنیات کی تہ میں یقین ہی موجود ہے جو اصل حقیقت ہے۔ ”ڈیکارٹ“ نے جب ہر ایک شے کو

بیدل

جو خارج میں ہے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تو دیکھنے والے پر شبہ نہ
کر سکا جو صاحب یقین ہے۔

از نقش تو دار و خلل آئینہ تحقیق
ہر جا اثر و ہم دگماں رفت یقین ماند

آئینہ تو بذاتہ بے صورت اور بیرنگ ہے۔ جب ہم اس میں نظر کریں گے
تو ہمارا نقش اس میں ظاہر ہو گا۔ اسی طرح آئینہ تحقیق میں ہم اپنے اوہام و
ظہنیات کا اثر یا نقش دیکھتے ہیں اگر یہ نقش محو ہو تو آئینہ تحقیق جیسا کہ
ہے ویسا ہی ہے۔ ہم کسی شے کو چشم یقین کے ساتھ نہیں دیکھتے اپنے ہی
توہمات و قیاسات و ظہنیات کا مشاہدہ کرتے ہیں یقین اس شے کو
اس کی اصلی صورت پر مشاہدہ کرنا ہے۔

تغافل زن بہ ہستی میقل فطرت ہست بس

صفائی آئینہ گرد عا باشد مبیں خود را

ہچو عکسے کہ بر دسادگی از آئینہ ما

ہر کہ در طبع تو جا کرد تو رفتی او ماند

یہ تو حقیقت ہے کہ آئینہ جو سادہ ہے جب کسی شے کا عکس قبول کریگا تو
اس کی سادگی نہ رہے گی۔ آئینہ نہیں بلکہ وہی عکس نظر آئے گا۔ اسی طرح
آئینہ دل پر اگر نقش غیر ہو گا۔ تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ”تورفتی و او ماند“ تیری
”فردیت“ تیری ”خودی“ مفقود ہو گئی۔ بیدل پہلے شعر میں اس سے بھی
بلند فکر کا اظہار کرتا ہے کہ تو بھی آئینہ فطرت میں اپنے آپ کو نہ دیکھ، تو
ہستی سے اتنا غافل ہو جا کہ تیرا نقش بھی اس آئینہ فطرت میں نظر نہ آئے۔
فطرت جو اصل شے ہے باقی رہ جائے گی۔

نفسیات کے اس مسئلہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ کسی غلط تصور
کو اگر ہم حقیقت ثابتہ یقین کریں تو اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے، وہ

بھی اسے ”حق“ ہی یقین کریں گے۔ اس موضوع پر فاضل ”لیبان“ نے روح اجتماع کے تحت محققانہ بحث کی ہے۔ اگر ہم ”سراب“ کو عالم آب یقین کریں تو ضرور اس کے پیچھے دوڑیں گے اور دوسرے بھی ہمارا اتباع کریں گے۔ یہ مفہوم ہے بیدل کے شعر محول بالا کا کہ ”از کسب یقین عشق توں کرد ہوس را“ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ :-

متاب از عشق رو گر چہ مجاز نیست
کہ ایں بہر حقیقت کار ساز نیست (جامی)

اس شعر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عشق کی نوعیت تو ایک ہی ہے۔ البتہ معشوق مجازی و حقیقی ہو سکتا ہے، اور کسی وقت مجاز سے حقیقت کی طرف بھی متوجہ ہو سکتا ہے بہر حال عشق کی موجودگی مقدم ہے۔ جب احساس طلب ہی نہ ہو تو طالب اور مطلوب بھی نہ ہوں گے۔

علامہ اقبال مرحوم بیدل کا فلسفہ خودی اور بخودی مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے عملی فائدہ اٹھانا چاہا اور حالاتِ حاضرہ پر اس کا اطلاق کیا۔ ہمارے زمانہ میں برطانوی امپیریلزم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو غلامانہ ذہنیت مسلط ہو چکی تھی۔ علامہ نے پہلے تو ہندوستانیوں کو وطن کا واسطہ دلایا اور وطن کا راگ الاپتے ہوئے کہا کہ ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“ لیکن جب دو قوموں کا نظریہ ذہن میں صاف صاف میسر نہ ہو سکا تو اس نے بھی واقعات نے سمجھنے پر مجبور کیا کہ کفر و ایمان میں ربط ناممکن ہے تو وطن کو خیر باد کہا۔ اس وقت اسلام کی ہمہ گیری اور عالمگیری کا صحیح تصور بھی مشاہدہ ہو رہا تھا کہ اسلام وطن اور قومیت سے بالاتر ہے جو نسلی امتیازات اور اختلاف الوان و لسان کی پیداوار نہیں ہے اس لئے کہنا پڑا کہ :-

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

بیدل

علامہ اقبال اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، محدود وطن سے نکل کر وسیع تر وطن کرہ ارض کو وطن قرار دیا، مگر وطن کا تصور ذہن سے محو نہ ہوا۔ وہ اب "ملت" کے شیدائی تھے، شعور خودی ملت ہی سے وابستہ تھا کہ یہ دیگر مل میں جذب نہ ہوا اور شعور بخودی یہ تھا کہ ہر ایک فرد ملت ملت سے وابستہ رہ کر ہی اور ملت میں اپنی انفرادی خودی کو محو کر کے اپنا شعور ملت یا خودی برقرار رکھ سکتا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

بیدل کا نظریہ خودی و بخودی اس سے اعلیٰ وارفع ہے۔ علامہ اقبال پر ماحول کا اثر پڑا۔ لیکن بیدل کا ماحول ایک اسلامی حکومت تھی۔ بیدل مذہب و ملت سے بھی آزاد ہے۔

در مشرب زت از قید مذاہب بگریز
عافیت نیست درآں بزم کہ سازش جنگ است

مے کشتی کریم و آسودیم از تشویش و ہم
گرد چندین مذہب از یک جرعه مشرب نیست

موج ایں دریا سگلف پرور گرداب نیست
طینت آزاد بیرون تاز و ہم مذہب۔۔ است

حسد تاکے، تعصب چند، اگر درد دے داری
نیاز ز اہدان بے خبر کن درد دینی را
ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ مشرب آزاد گان یہ ہے کہ مذاہب

کی قید سے آزاد ہیں۔ مذاہب کیا ہیں؟ جنگ و جدل کا ساز و سامان۔
علامہ اقبال نے کیا اچھا کہا ہے کہ

سچ کہدوں لے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدہ کے بُت ہو گئے پُرنے
آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

خدا پرستی اور بشری شخصیت پرستی میں فرق یہ ہے کہ خدا پرستوں میں
کبھی جنگ و جدل نہیں ہوتا۔ آنحضرتؐ کی صحیح حدیث ہے کہ آپ نے
فرمایا کہ میں تم کو ایک بات بتاؤں کہ تم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار
نہ رہو، وہ ہے یادِ خدا، جب ہم یہ سمجھ لیں گے۔ ہم سب کا خدا ایک ہے
اور ہم سب اس کے بندے ہیں اور اللہ فساد اور مفسدین کو پسند نہیں
فرماتا اور یہ کہ حسب ارشاد قرآن اللہ کی طرف رجوع کریں تو ہمارے
سب اختلافات مٹ جائیں گے۔ یہ اصل مذہب، اصل دین، اصل
ملت ہے۔ شخصیت پرستی بُت پرستی ہے جب ان کو ”ارباباً من دون اللہ“
بنایا جائے تو ان خداؤں کی کثرت ایک دوسرے سے دست و گریبان
رہے گی، اور تاریخ مذاہب میں یہ امر واقعہ ثابت شدہ ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

(حافظ)

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مذاہب سب کم و بیش انسانی اختراع ہیں لیکن اسلام دین اللہ
ہے، ”لہ اسلام من فی السموات والارض“ یہ کائنات کا دین
الغفرت ہے۔ کائنات میں عالم انسانیت بھی شامل ہے۔

مشرّب آزادگان اس قید مذاہب سے باہر نکلتا ہے دین اللہ

میں کوئی الجھن نہیں، بھول بھلیاں نہیں، یہ وہ دریا ہے جس میں بھنور

بیدل

نہیں کہ خطر دہو، اہل دیں "لا خوف علیہم ولا هم یحزنون"، طینت آزاد بیروں تاز و ہم مذہب است مذاہب اوہام کا گرداب ہیں۔ اس کے چکر میں جو آیا بمشکل اس سے باہر نکل سکتا ہے، مذاہب کے نام پر اہل مذاہب میں تعصب اور حسد اور کینہ، ایک دوسرے کا انکار اور اختلاف اور تفرقہ اور جنگ و جدل غرض ہر ایک بیہودگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ بر خود غلط یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فتنہ و فساد جو مذہب کے نام پر برپا کر رہے ہیں درد دینی کا تقاضہ ہے۔ اور کارِ ثواب ہے۔ یہ سب کچھ شخصیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ میرا مذہب عشق ہے۔ بغیر عشق نہ انیم، پیچ آئینی گزیدہ ایم چوپروانہ سوختن مذہب اور یہ کہ :-

از تعصب جا ہلاں دین ہدی را دشمن اند

... عاقبت در جنگ این کوراں عصا خواہ شکست

جہاں مذاہب میں وہاں دینی (حکومت ہے اور

ارباب حکومت پادری، پنڈت اور ملا ہیں اور یہی دراصل دنیوی (حکومت ہے، بہر حال ایک بیکار جماعت برسر اقتدار

حاکم اور عوام محکوم، آزادی فکر ختم، اس کے ساتھ ذہنی ارتقا مفقود، نتیجہ ظاہر ہے۔ اپنی خود ساختہ حکومت کے قیام کے لئے جنگ و جدل۔

اسلام نے ہر ایک حکومت خواہ دینی ہو یا دنیوی جس کے نام پر چالاک آدمی اپنا آگوسیدھا کرتے ہیں مٹا دی۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کا بندہ غیر اللہ کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ غیر اللہ کا بندہ مشرک ہے اور مشرک کا تقاضہ فتنہ و فساد، ملک خدا اور بندگان خدا میں پیدا کرنا ہے۔

غرض اسلام مشرب آزادگان ہے وطن اور قومیت اور مذہب

اور ہر ایک قید رسوم مذموم جو اہل غرض کی اختراع ہے اور مایہ تشویش ریش اور رجبہ و دستار اور سجدہ و زنا جو مذہبی تقدس کے آثار میں بیدل کے نزدیک مردود ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بیدل نے شہنشاہ دین پناہ اور نگ زیب عالمگیر کا عہد ریش | شروع سے آخر تک پایا "اکبر" جس کو عالمگیر "جدا کفر" کہتا تھا تراش ریش پسند فرماتا تھا، عالمگیر نے اسے بھی ایک اہم شرعی مسئلہ قیاس کیا جس کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اس لئے داڑھی بڑھانے کا امر فرمایا، بیدل کہتا ہے کہ

دی بادشہ تراش ریش خوش بو امروز شہے دگر در منع کشود
دردیدہ اعتبار از حکم دو شاہ جز پشیم نبود کہ کاہید و فرود
ایک غزل ریش پر ہے۔

اس قدر ریش چہ معنی دارد غیر تشویش چہ معنی دارد
اتنی لمبی داڑھی کی غرض غیر تشویش اور کیا ہو سکتی ہے
آدمی خرس چہ ظلم است آخر مرد حق میش چہ معنی دارد
اتنے لمبے بال خرس اور گو سپند ہی کے ہوتے ہیں، آدمی کے چہرہ پر زیب نہیں دیتے مرد حق بکری بن جائے تو نہ معلوم اس کا کیا فائدہ ہے۔
یک نخود کلہ و دہ من دستار اس کم و بیش چہ معنی دارد
خوبصورتی موزونی کا نام ہے، چتا بھرتو سر ہوا اور اس پر پورا کپڑے کا تھان پگڑی ہو تو توازن قائم نہیں رہتا اور یہ کمی بیشی موزونیت کے خلاف ہے۔

بیدل اس جاہمہ ریش است فشت ملت و کیش چہ معنی دارد
مقطع میں بادشاہ پر چوٹ کر گیا ہے کہ ملت و کیش تو صرف ریش و فشت میں محو ہو کر رہ گیا۔

بیدل

چند اشعار بغرض تفنن اور ملاحظہ ہوں :-

بیدل از افسوں گریٹ خرس و بز آدم نشود

چنگ بر ریش مزن از ہوس شانہ برآ

اگر یہ چھ اور بکرے کو جادو کے زور سے آدمی بنانا مقصود ہو تو ناممکن ہے۔ ہر وقت داڑھی پر ہاتھ پھیرنا اور شانہ کرنا تاکہ اس میں موزونی اور صفائی پیدا ہو جو آدمیت کا تقاضہ ہے، بے فائدہ ہے جب اصل شے ہی انسانیت سے بعید ہے۔

از چہ پروا از بزرگی نفرو شد زاید

ریش بر تاقہ کم نیست بز اخفش را

اخفش مشہور نحوی عربی زبان کا ہے۔ اس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ اسے اپنے سامنے باندھ کر صرف دھوکے درس میں مشغول رہتا، اور کسی پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرتا ہوا پوچھتا کہ کیا یہ بحث صحیح ہے؟ بکری عادتاً سر ہلاتی۔ اگر مسئلہ مزید غور کے بعد غلط ثابت ہوتا تو بکری کی خیر نہ تھی، خوب پلٹتا۔ اس شعر میں تلخیص یہی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا کہ اخفش تو خیر جو کچھ ہے سو ہے اس کی بکری بھی کسی نحوی سے بزرگی میں کم نہیں، بیدل زاید پر چوٹ کرتا ہے کہ زاید کی بزرگی میں کیا کلام ہو سکتا ہے ریش و فش بز اخفش سے کم نہیں۔

زاید ز عیش رنداں پر غافلست بیدل

فردوس در ہمیں جاست گر ریش و فش نہ باشد

اس شعر میں بھی تلخیص ہے کہ بہشت میں سب عالم شباب میں ہونگے اور کسی کی داڑھی نہ ہوگی۔ اگر زاید سمجھے تو فردوس یہی دنیا ہے۔

بہشت ایں جا بہار ایں جانشاط ایں جانگاراں جا

توکز خود غافل صرف عدم کن دور بینی را

اور اس راز کو داڑھی منڈے رند ہی خوب سمجھتے ہیں جس سے زائد
مطلق بے خبر ہے۔

جز خارق معکوس مداں ریش و فش شیخ
آدم خرمی کرد و دم و یال بر آورد
اسے شیخ کی کرامت ہی سمجھنی چاہئے اگرچہ یہ اُلٹی کرامت ہے کہ
آدم تنزل کر کے گدھا بن گیا اور دم اور یال ریش و فش سے پیدا ہوئے۔
بیدل سرایں رشتہ بہ تحقیق نہ پیوست
در سبھ و زنا رہا نے دل و دیں داشت

سبحہ و زنا

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیدل میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں
کہ ایک دنیا سبحہ و زنا کی دلدادہ ہے اور اسی کو دین سمجھتی ہے۔ تحقیق کو
اس سے کیا نسبت ہے۔ یا سبحہ و زنا کے گرفتار تحقیق یا تقاضہ دل و دین
کو نہیں سمجھ سکتے۔ انھوں نے سبحہ و زنا سے رشتہ جوڑا ہوا ہے اور حق
سے توڑ رکھا ہے۔

تاب و تب سبحہ بہل، رشتہ زنا رگسل

قطرہ نی جوش زن و بر خط پیمانہ بر آ

سبحہ کے لئے ”تاب و تب“ نہایت موزوں الفاظ ہیں۔ اور قطرہ سے
سے تشبیہ بھی لا جواب ہے۔ یعنی مشرب آزادگان تو یہ ہے کہ یادہ آزادی
جوش پر ہوا اور پیمانہ فکر لب تک لبریز ہو ”خط پیمانہ“ اور زنا میں مشابہت
لطیف ہے خط پیمانہ بھی پیمانہ کے گرد لپٹا ہوا ہوتا ہے جیسے زنا جو رسم اور
مذہب پرست ہیں وہ سبحہ و زنا کی قید میں گرفتار ہیں تو یہ زنجیریں
توڑ پھوڑ کر رکھ دے اور نشہ آزادی میں سرشار رہ۔

چوں سبحہ دریں معبد عبرت چہ جنوں است
ذکر حق و برہم زدن و سر شکنیا

بیدل

پیدا است شغل زاہد وقت دگر چہ باشد
سر با بیک دگر کو فت ہر گہ کہ یاد حق کرد

زمین ایک مسجد ایسی ہی ہے جیسے سموات جہاں ہر ایک شے ذات
باری کے حضور سجدہ کر رہی ہے۔ اس معبد میں تو عبادت الہی میں مشغول
رہنا چاہئے۔ لیکن ان زاہدوں اور تپسویوں کے سر پر کیا وحشت سوار
ہے کہ تسبیح اور مالا کے دانوں کی طرح خدا کی یاد کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے
کو بحث و مباحثہ میں نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے اور ایک دوسرے
کا سر پھوڑ رہا ہے۔

از بسکہ تنگ بود گذر گاہ اتفاق

چوں سچہ خلق جز پریک دگر نرفت
بیدل نے سچہ و زنا پر بہت شعر لکھے ہیں بغرض تفریق یہ بھی
ملاحظہ ہوں۔

سختی دل نامہ را سنگ راہ آزاد گیت

رشتہ تا صاحب گرہ باشد رہش ہموار نیست
جمعیت دل است مدارائی کفر ہم
چوں سچہ کوچہ داد بزنا دین ما

گر ہمہ کفر است نتوان سر ز ہمواری کشید
سچہ را دیدم طواف حلقہ زنا داشت

نقطہ دل گرد خود گشت و خط پر کار شد

گردش این سچہ تا ہموار شد زنا ر شد
ان اشعار میں جو تخیل کا ر فرما ہے وہ غالب کے اس شعر میں بھی ہے۔

زنارہیں، سبجہ صد دانہ توڑ ڈال
چلتا ہے راہرورہ ہموار دیکھ کر

صراط مستقیم یا راہ ہموار ہی منزل تک جاتی ہے۔ بیدل نے رشتہ
سبجہ کو کوچہ اور سیدھے راستہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ یہ
کفر ہی ہے مگر ”ہمواری“ بہر حال پسندیدہ ہے۔ سبجہ کے دانے بھی حلقہ زنار
کے گرد طواف کرتے ہیں، اور اگر دانہ سبجہ (منکا) کو دل تصور کیا جائے
تو وہ بھی اپنے ہی گرد طواف کر رہا ہے، اور خط پر کار کی طرح جس نقطہ سے
شروع ہوا اسی پر آکر ختم ہوتا ہے۔ اس کی گردش جب تک ہموار ہے زنار
کی صورت ہے، مطلب یہ ہے کہ جادہ تحقیق پر انسان خواہ کتنی تگ و دو
کرے اس کا مقصود اپنی ہی ”خودی“ ہوتی ہے۔

”ایں آئینہ سخت خود پرستی دارد“

دروادی عشق اگر دیدن باشد بر جادہ غیر خط کشیدن باشد
ما و سفرے کہ، بچو خط پر کار ہر جا برسی بخود رسیدن باشد

رسم و عادت

زندگی در بند و قید رسم و عادت مردن است

دست دست تست بشکن این طلسم ننگ را

اہل مذاہب ہمیشہ اپنے آبا و اجداد کی روش پر چلتے ہیں اور یہ رسم و
رواج کی پابندی ہے۔ اصطلاح میں اس کو رانہ تقلید کو ”تعامل“ کہتے ہیں۔
یعنی جو عمل صدیوں سے بزرگ کرتے چلے آئے اسی پر کار بند رہتے ہیں،
یہ رجعت پسند وہی پرانی لکیر پیٹتے چلے آتے ہیں جو کسی وقت کسی بزرگ
نے خارجی حالات کے مناسب اختیار کی تھی، اس کی مذمت قرآن حکیم
نے فرمائی ہے۔ ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور ترقی یافتہ زمانہ کا

بیدل

ساتھ نہیں دے سکتے یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کا جو کچھ تقاضہ ہے یہ بے حس اس سے بالکل غافل ہوتے ہیں، تو میں اسی جمود اور بے حسی کی وجہ سے ٹٹتی رہیں۔ اور ہلاک ہو گئیں۔ بیدل کہتا ہے کہ اس رسم و عادت کی قید و بند میں تو میں زندہ نہیں رہ سکتیں، اللہ نے مجھے دست و بازو دیئے ہوئے ہیں ان انشااں اور سلاسل کو جو تیرے گلے کا ہار ہو رہے ہیں توڑ پھوڑ کر آزاد ہو جا، یہ ”طلسم ننگ و نام“ ہے، لوگ اس سے اتنے مسحور ہیں کہ کوئی جرأت نہیں کرتا کہ اسے توڑے، بدنامی سے ڈرتے ہیں اور بدنام کرنے والے جاہل رسم پرست رشتہ موؤت بھی توڑ دیتے ہیں مگر رسم و عادت کے خلاف کوئی بات سُننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

گرفتار رسوم اندیشہ آرام کم دارد

عقاید آنچہ دارد خدمت دیرو حرم دارد

جو لوگ رسموں کے سختی سے پابند ہیں وہ تو ہمیشہ شبہ گھڑی شبہ لگن مہورت دریافت کرتے رہتے ہیں، دیر کی یا ترا اور حرم کا حج خواہ استطاعت نہ بھی ہو ضرور کرتے ہیں۔ دل میں پکڑ دھکڑ رہتی ہے کہ یہ رسم ادا نہیں ہوئی اور وہ کمی رہ گئی۔ غرض اپنی آسائش کے آپ دشمن ہیں۔ اپنی خدمت کرتے تو آرام و آسائش کے طالب ہوتے دیرو حرم کی خدمت میں نگے ہوئے ہیں اس لئے آرام حرام کر رکھا ہے۔ گرفتار رسوم آزادی کے چھپے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔

بیدل تو جنوں کُن وزیں ورطہ بدر زن

عالم ہمہ زندانی تقلید و رسوم است

آزادی پر بیدل نے دادِ تحقیق دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا فکر محال ہے اگر انسان کے دل و دماغ پر عقاید اور رسم و عادت تسلط ہوں ان سے کنارہ کش ہو کر ہی آزادی ممکن ہے، اور حکومت خواہ اس کی

صورت کچھ بھی ہو سدا راہ آزادی ہے۔ ضمیر کی آواز بلند کرنا جرم ہے۔ صداقت اور حقانیت کا انکشاف ناممکن ہے اگر آزادی نہ ہو۔ انبیاء نے ہر ممکن تکلیف کفار کے ہاتھوں سے برداشت کی، ابتلا میں ثابت قدم رہے اور لوگوں پر حقانیت واضح کی، جو یائے حق مرد دلیر شیر دل ہوتا ہے۔

”شیر مرداں را نباید بر طریق میش رفت“

بیدل کہتا ہے کہ

گر عروج آہنگی از زندانگ گردوں برآ
مے سراپا نشہ شد تا دامن مینا گذاشت

لفظ ”مینا“ میں کیا لطافت پیدا کی ہے۔ آسمان مینا رنگ ہے اور شراب بھی مینا (صراحی) میں ہوتی ہے، شراب مینا سے باہر آکر ہی نشہ بنتی ہے۔ اسی طرح اگر تو عروج کی خواہش کرتا ہے تو گردوں سے بالا تر پرواز کر، نشہ بھی دماغ کو عروج کی طرف لے جاتا ہے۔

زندگی زیں انجمن یک گام آزادی خواست

ہر کرا دیدیم زیں جا بعد مردن رفت است

جیسے آزادی کہتے ہیں اور جس کا تصور بیدل کے ذہن میں ہے وہ خود کہتا ہے کہ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔ زندگی خود ایک قید ہے۔

مخوڑنجیر نفس بودن دلیل ہوش نیست

ہر کہ می بینی بقید زندگی دیوانہ است

اور اس قید میں جب تک ہے ایک قدم آزادی کی طرف اٹھ نہیں

سکتا۔ البتہ جس کسی کو میں نے دیکھا مرکز ہی زندگی سے آزاد ہوا۔ اگرچہ کامل آزادی اس دنیوی زندگی میں ممکن نہیں مگر اتنا تو ہو کہ رسم و رواج کے اغلال و سلاسل کا یوجہ جہاں تک ممکن ہو ہلکا ہو۔

بیدل

بیدل کا نظریہ مذاہب یہ ہے کہ ہر ایک ملت اصل کی فرع ہے لیکن اہل ملت اصل کو جو غیر مری ہے اور محسوس نہیں ہوتی بھول جاتے ہیں اور فروع کو جو محسوس ہوتی ہے پیش نظر رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

شیشہ و سنگ آتش و آبد دور از کو ہمار

عالیے یا ہم، جدا از اصل، دشمن می شود

پتھر میں آگ ہے اور شیشہ میں آب اور آگ اور پانی کا آپس میں بیر ہے۔ پتھر اور شیشہ کی ایک ہی اصل پہاڑ ہے لیکن اصل سے جدا ہو کر دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ تو شاعرانہ تخیل ہے اور لطیف ہے، امر واقعہ بھی یہی ہے کہ عالم انسانی کی اصل انسانیت ہے اور سب مرد و زن "نفس واحدہ" میں جو اصل ہے متحد ہیں، لیکن یہ کثرت جو عالم انسانی میں مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ اختلاف الوان و لسان نفس واحدہ کی فرع ہی ہیں اور باہم دست و گریباں ہیں۔ اگر انسانیت کا صحیح تصور ان کے ذہن میں ہوتا تو اصل سے ذہنی پیوستگی آشتی پرے آتی۔ اصل سے جدا ہو کر فروع ہو کر ایک دوسرے کو اپنا "غیر" تصور کر رہے ہیں، حالانکہ اگر اصل پر نظر ہو تو ایک دوسرے کا "عین" ہے۔

از اصل دور ماند جہاںے بذوق فرع ماہم یک آبگینہ بخارا زدیم پا

نومید اصل رفت جہاںے بذوق فرع تا وضع قطره داشت ز دریا گہر رفت
جب تک گہر کی وضع قطره آب کی تھی دریا سے پیوستہ رہا جو اس کی
اصل ہے۔ لیکن "ذوق فرع" میں اصل سے جدا ہو گیا۔ آب تو اس میں
اب بھی ہے مگر دریا تر اور یہ خشک۔

اخلاقیات

”خلق“ اور ”خلق“ دونوں ایک ہی لفظ ہیں حرکات کی تبدیلی سے مفہوم میں یہ فرق ہے کہ ”خلق“ ظاہری صورت کی بنا و طے ہے جو محسوس ہوتی ہے اور ”خلق“ ذہنی ہئیت ہے، اور ”عادت“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی سے کسی شخص کی ذہنی حالت کا پتہ ملتا ہے، اخلاق پر بیدل نے بہت کچھ لکھا ہے، اسی کی ذیل میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جن سے اخلاق کی درستی ہوتی ہے، مثلاً پند و نصائح، اوصاف حمیدہ اور خصائل ذمیمہ، نیک و بد کا بیان، بیدل کا نظریہ خلق یہ ہے کہ خلق معرفت سے افضل ہے اور کریم عارف سے اکمل ہے، خلق و کرم جو ہر ذاتی ہے اور علم کسی، حق تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی ستائش خلق عظیم کی ہے (انک لعلی خلق عظیم) صفت عارف و عالم ایسی بات نہ تھی کہ قابل ذکر ہو۔

بیدل ایسی نصیحت مذموم سمجھتا ہے جو فضیلت ہو اور جو ناصح کا خود عمل نہ ہو۔ بقول عارف رومی :-
ہر کسے ناصح برائے دیگران ناصح خود یا فتم کم درجہاں
حافظ بھی کہتا ہے کہ

بیدل

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانش مند شہر ایں باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

اور یہ کہ وعظ بے عملان واجب است نشیدن۔ "بیدل چہار عنصر
میں لکھتا ہے کہ دنیا میں ہر ایک شخص اپنے اپنے حال میں مست ہے تو
خود نادان ہے کہ دانا نا صبح مشفق بن کر لوگوں کے اوقات میں خلل انداز
ہوتا ہے، ہر ایک سر میں کسی نہ کسی امر کی دھن ہے، شکفت آمیز باتیں
بنانا کیا ضرور ہے، تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نبیر تو، اگر تیرے دم میں کچھ
اثر ہے تو اپنے آپ پر عرف ارشاد کرتا کہ لوگ تجھے ہرزہ گو نہ سمجھیں، اور
اگر تیرا ناخن رسا ہے تو اپنی ہی گرہ کھول، دوسروں کے دل کو زخمی کیوں کرتا
ہے۔ بہر حال پسند و نصیحت "فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید" لیکن
بر دل کس نخوری از دم سرد وعظ بے جا ہمہ جا مرد و داست
سب سے بہتر عملی نمونہ "اسوۂ حسنہ" ہے، زبانی وعظ ہمیشہ
یے اثر ہی ہوتا ہے۔

پند نا صبح پر منعفن کرد وقت مے کشاں
از کجا آورد ایں خر نغمہ جانکاه را

بیدل کہتا ہے کہ

من وما ہر چہ دارد در غبتے و نفراتے دارد
جہاں وعظ است لیکن گوش مجاہد نصیحت را

لوگوں میں نفسانیت کی وجہ سے خود غرضی، خود ستائی، خود نمائی
مشاہدہ ہوتی ہے، اور دو حال سے خالی کوئی دل نہیں اور یہ رغبت اور
نفرت ہے، اگر لوگوں کے حالات مشاہدہ کئے جائیں تو یہ بجائے خود

دفعہ و عطا و پسند و نصیحت ہے مگر گوش ہوش کہاں، سنتا کون ہے یہی رغبت اور نفرت ہر ایک جگہ کار فرما ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص طالب نصیحت ہو تو اسے جو کچھ دنیا میں واقع ہو رہا ہے لوگوں کے حالات میں دیدہ عبرت سے مشاہدہ کرنا چاہئے، لقمان سے کسی نے پوچھا کہ دانائی کا سبق کس استاد سے سیکھا، جواب دیا نادالوں سے، جو کچھ وہ کرتے ہیں میں نہیں کرتا۔

حقیقت میں پسند و نصیحت بھی تحت الشعور ”محاسبہ“ ہی ہوتا ہے، اور یہ ”فصیحت“ بن کر رہ جاتی ہے جب مخاطب کو تحت الشعور اس کا احساس ہو کہ ناصح مشفق اس کے اعمال کا جائزہ بلا اختیار و حکومت لے رہا ہے، اور اس طرح اپنا تفوق (جما رہا)

ہے۔ اس لئے وعظ کا موضوع عیب و ہنر ہی ہوتا ہے، اور عیب جو یا تو خود مدعی فضل و ہنر ہوتا ہے یا اپنے عیوب چھپانا چاہتا ہے۔
کسے کہ نیک و بد ہوشیار و مست پوشیدہ۔

خدا عیب وے از چشم ہر کہ ہست پوشیدہ
جو شخص کسی کے خواہ وہ ہوشیار ہو یا مست نیک و بد سے سروکار نہیں رکھتا امیہ۔ ہے کہ خدا اس کے عیب ہر ایک شخص کی آنکھ سے پوشیدہ رکھے گا۔

ریخ خفت مکش ز خلق باظہار کمال

نزدایں طایفہ بے عیب نبودن ہنر است
اظہار کمال کا مفہوم یہ ہے کہ نقائص پوشیدہ ہوں، اگر تو اپنے کمال کا اظہار کر رہا ہے تو لوگوں کے ذہن نشین یہ کرنا چاہتا ہے کہ تجھ میں کوئی نقص نہیں۔ حالانکہ اہل کمال کا نظریہ یہ ہے کہ بے عیب نہ ہونا ہی ہنر ہے، اس لئے اگر تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تو بے عیب ہے تو اہل کمال نہیں کہتے ہیں کہ ”عیب کرنے کو ہنر چاہئے“ ہو سکتا ہے کہ تو اپنے عیوب ہی

بیدل

کو بطور ہنر پیش کر رہا ہو، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ واجب ہے کہ انسان میں عیب ہو، اگر نہ ہو تو وہ انسان نہ ہوگا حیوان مطلق ہوگا۔ عیوب کا رفع کرنا ہی طلب کمال ہے، عیوب ہونگے تو کمال کا حصول ممکن ہے لیکن انسان کبھی کامل نہیں ہو سکتا ورنہ ارتقاء رک جائے گا۔

دعویٰ فضل و ہنر خوارسیت در انبائے دہر

آبرو خواہی گرایں جا اندگے ناداں بر آ

اگر کوئی شخص صاحب فضل و ہنر ہو اور اسے اس کا دعویٰ ہو تو وہ لاف زنی سمجھی جاتی ہے اور موجب خواری و رسوائی ہے، آبرو اسی میں ہے کہ دانا ہوتے اپنے آپ کو تھوڑا سا نادان ظاہر کرو۔

دانا نشود از ہنر خویش برومند

از میوہ خود بہرہ محال است شجر را

از دو تا گشتن ندارد چارہ نخل میوہ را

قامت ہر کس بزیربار می آید خم است

درخت اپنا پھل آپ نہیں کھاتا۔ دوسروں کو کھلاتا ہے اسی طرح

جو دانا ہیں وہ اپنے ہنر کا پھل دوسروں پر ازراں کرتے ہیں (مصارفہم ینفقون) اسی کو تواضع کہتے ہیں، بیدل نے لفظ "بار" میں لطف پیدا کیا ہے۔ بار کے معنی پھل بھی ہیں اور بوجھ بھی، بوجھ سے بھی قامت جھک جاتا ہے اور درخت میوہ دار بھی جھکتا ہے جو تواضع کی صورت ہے۔

اگر علم و فن داری نیاز طاق نسیاں کن

کہ رنگ آمیزیت نقاش می سازد خجالت را

اگر تو صاحب علم و فن ہے تو بھول جا کہ تو ایسا ویسا ڈبل پیسہ ہے،

یہ علم و فن طاق نسیاں پر صرف کر، اسی طاق کو ضرورت آرائش و زیبائش

کی ہے، اسی پر بیل بوٹے بنا اور ان میں رنگ بھر، علم و فن نقاشی اسی پر ختم کر، چونکہ

”دعویٰ فضل و ہنر خوارست در ابنائے دھر

آبرو خواہی گریں جا اند کے ناداں بر آ“

دعویٰ علم و فن خواری و خجالت ہے۔ اس لئے دانائی یہ ہے کہ لوگوں میں خوار و خجل نہ ہو اسی خواری و خجالت کو نقاش اور طاق نسیاں کا گلہ ستہ و فن بنا، غالب نے بہت دیر کے بعد ہوش سنبھالی۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بر عیب خلق خوردہ نگیرند محرماں

اے بے خبر من و تو خدا نیست بندہ است

جونیک و بد کی حقیقت سے واقف ہیں اور مجرم کمال ہیں وہ لوگوں کے عیب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور جو دیکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ میں اور تو خدا تو نہیں جس کی ذات ہر ایک عیب سے پاک ہے، بندہ ہیں اور خطا و تیاں صہ انسانی اور بندگی ہے

یا تغافل از عالم یا ز خود نظر بستن

زیں دو پردہ بیرون نیست ساز عیب پوشیہا

عیب پوشی کا ساز یہی تغافل ہے یا چشم پوشی ہے ان دو پردوں سے باہر ساز و سامان عیب پوشی نہیں۔

تغافل از بد و نیک اعتبار اہل حیا است کہ سرخ روئی چشم آورد غنود نہا

اہل حیا کا اعتبار یا عزت و وقار تغافل میں ہے چشم پوشی میں ہے۔

جب نمیند کا غلبہ ہو تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور خود بخود بند ہوتی ہیں۔

اس شعر میں ”سرخ روئی“ ایک امر واقعہ بھی ہے اور مفہوم اعتبار اور عزت

بیدل

دوقار بھی ہے۔

عاقبت بینی نظر پوشیدن است از عیب خلق
آنچه در انجام خواہی بستن از آغاز بند
عاقبت بینی، دوراندیشی و انائی کے ہم معنی ہے۔ انجام کار ہر ایک
شخص کی آنکھیں بند ہو جائیں گی، مناسب ہے کہ آغاز ہی سے چشم پوشی
سے کام لے اور لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔

مرہ بر بند و فارغ شود مکر و ہات این محفل
تغافل عالے دار و کہ عیب این جا ہنر گردد
جب آنکھیں کھلی ہوں تو عیب و ہنر اور ہموار و پست سب یکجہ
نظر آئے گا۔

چشم پوشیدیم یکساں شد بلند و پست دہر
عالے را شوخی نظارہ ناہموار داشت
محض دنیا کے مکر و ہات سے چشم پوشی کی جائے تو ان سے فراغت
بھی حاصل ہو جائے گی، تغافل یا چشم پوشی ایک ہنر ہے بلکہ ہر ایک قسم
کے مکر و ہات، کو جو عیب ہی ہیں ہنر بنا دیتا ہے۔

خود نمائی بھی ایک عیب ہے اس موضوع پر بیدل نے بہت کچھ
کہا ہے۔ ”خودی“ کا مذموم پہلو خود بینی و خود رائی و خود ستائی و خود نمائی
ہے، لوگ اس حقیقت سے بہت کم واقف ہیں کہ حسن و خوبی کا تقاضہ ہے
اور فطری تقاضہ ہے کہ ”خود نما“ ہو اور عیوب و مکر و ہات جتنے پوشیدہ
رہیں اتنا ہی اچھا ہے۔ فطرت کا منشاء ہے کہ حسن و خوبی کا اظہار ہو، لیکن
اس کا احساس عیب کی موجودگی کا بھی طالب ہے۔ بے مصلحت مہیست
ظہور شیطان، لیکن حسن و خوبی خود بخود جاذب نظر ہوتی ہے اس کی
ستائش کرنے والے اہل نظر ہوتے ہیں وہ خود ستائی نہیں کرتی۔ خود ستائی

لاف زنی کے ہم معنی ہے جو معیوب ہے۔

گر محرمی علم نفرازی بحرف پوچ

اس پنبہ پر چمپیت کہ بردار بستن است

اگر تو محرم حقیقت حسن و خوبی ہے تو اپنے نام کو ہرزہ گوئی یا دعوے

خود ستائی سے مت اچھال۔ ”حرف پوچ“ بیہودہ گوئی ایسے حرف سے اپنا

جھنڈا بلند نہ کر جو پوچ اور فضول ہو، حرف پوچ روئی کی طرح ہے جس کا

پھر یہ اس لائق ہے کہ دار یعنی صلیب پر آویزاں کیا جائے۔ اس شعر میں

اشارہ حسین منصور حلاج کی طرف ہے، شعر کی لطافت الفاظ علم اور پنبہ

اور پرچم اور دار میں ہے۔ منصور کا پیشہ حلاجی تھا یعنی دھنیا تھا۔ مانا کہ اس کا

دعوے ”انا الحق“ صحیح تھا جب کائنات کی نسبت اہل ذکر و فکر کا فتویٰ

ہے کہ دینا ما خلقت هذا باطلا تو جو کچھ اللہ نے پیدا کیا حق ہے،

منصور کو کیا امتیازی خصوصیت حاصل ہے؟ یہی تا کہ وہ اس راز سے

محرم تھا اور عوام نہیں ہیں۔ لیکن اس کا دعوے حرف پوچ ہی تھا، اور اسی

لائق تھا کہ اسے صلیب دی گئی، وہ اپنے لئے ایک خصوصیت پیدا کر رہا

تھا جو غلط دعوے ہے۔

خود نمائی حرف پوچ خواہی بودن بردار آئینہ زیریں پیش سکندر زردہ ست

مشہور ہے کہ آئینہ سکندر کی ایجاد ہے۔ اس میں عکس یا تماشال خود نمائی

ہے، سکندر نے بھی یہ دروازہ کھٹکھٹایا، نہ سکندر رہا اور نہ اس کی تماشال۔

اوج دولت سفلہ طبعان را دوروزی بیش نیست

خاک اگر امروز بر چرخ است فردا زیر پا ست

خاک پست اور پستی کے ہم معنی ہے۔ اگر طوفان باد یا انقلاب کی وجہ

سے عایبہا سافلہا ہوں اور خاک اڑ اڑ کر بلند ہو تو کب تک، فطری پستی

اسے پھر پستی کی طرف سے آئے گی۔ آج اگر خاک دھول لوگوں کی آنکھوں میں

بیدل

پر پڑتی ہے اور لوگ اسے سراور آنکھوں پر بٹھاتے ہیں تو کل پاؤں کے نیچے
پامال ہوگی۔

جو تمکین عالی فطرت از دوں ہمتاں بیدل
ثبات رنگ انجم نیست گلہائے زمینی را
جو تمکین یا استقلال مزاج عالی فطرت لوگوں میں ہوتا ہے وہ پست
فطرت، پست ہمت لوگوں میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گا زمین پست ہے
اور آسمان بلند زمین سے جو پھول پیدا ہوتے ہیں ان میں وہ ثبات نہیں
جو تاروں کو حاصل ہے۔

حرص خلقے را دریں محفل بجموری گداخت
غیر چشم سیر جام، پیچ کس سرشار نیست
آنکھ کو جام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سیر چشم ہی سرشار ہے لیکن اس
بزم ہستی میں لوگ حرص کے نشہ میں چور ہیں، سیر چشم اہل قناعت ہیں،
قناعت کا نشہ حرص کی مخموری سے بہتر ہے۔

مبعد حرص، آستان سجدہ بے عزت نیست

عالیے ایں جا باب روتیم کردہ است
حرص کی مسجد بے عزتی کے سجدہ کا آستانہ ہے۔ ایک دُتیا جو اس کی
پُجاری ہے آبرو سے تیمم کر رہی ہے، پانی سے وضو کیا جاتا ہے اور پانی
دستیاب نہ ہو تو مٹی سے تیمم کرتے ہیں۔ ”آب رو“ کو حرص خاک میں ملا دیتی ہے۔
از مائدہ بے نمک حرص میر سید

چیزیکہ بجز غصہ تو ان خورد محال است

بے نمک کھانا پھیکا بے مزہ ہوتا ہے، دسترخوان حرص پر کچھ اور تو
مزید اچیز کھانے کو نہیں ملتی البتہ غصہ ہے جتنا چاہو کھاؤ۔
حرص مشکل کردہ فہم قناعت سپرد آب آئینہ پلے داشت سکندر نگذشت

”رہ فہم قناعت“ وہ راستہ یا طریق جس پر چل کر قناعت کی سمجھ بوجھ پیدا ہو کہ ”حرص“ کا راستہ ترک کر کے قناعت اختیار کرنی چاہئے۔ لیکن حرص اس راستہ پر آنے نہیں دیتی اگر یہ ممکن ہوتا تو سکندر بھی یہی راستہ اختیار کرتا۔ آب سے عبور پل کے ذریعہ کیا جاتا ہے، سکندر تو خود آئینہ کا موجد ہے اور آئینہ میں آب ہے اگر وہ اس آب آئینہ میں غور کرتا تو آئینہ اس کے لئے پل کا کام دیتا اور اسے فہم قناعت ہوتا، مگر وہ گزرنہ سکا، تمام کرہ ارض کی تسخیر ایک حرص ہی تھی، ہاتھ کیا آیا، خالی ہاتھ دنیا سے گیا۔ چوں سکندر دولت بکسے نیست مسلم پیدا است کہ ہر نقش انگلیں نقش بر آب است

بادشاہی در طلسم سیر چٹے بستہ اند
 کا سہ چشم گداگر پر شود جام جم است
 جمشید ایران کا بادشاہ تھا۔ اس کے پاس ایک جام تھا جس میں تمام ممالک کرہ ارض کے حالات مشاہدہ ہوتے تھے سیر چشمی یعنی قناعت میں بادشاہی کا طلسم باندھا گیا ہے گدا جو حرص ہی ہوتا ہے اگر اس کا کا سہ چشم اسی قناعت سے پر ہو تو وہ جام جم ہے یعنی بادشاہ وقت ہے۔
 اوج و حفیض قسزم امکان شگافیم

از آبرو مگو ہمہ جا این گہر گم است
 زمانہ کی بلندی و پستی میں جستجو کی، بحر امکاں کی سطح اور بحر میں غوطے لگائے مگر ”آبرو“ کی کیا پوچھتے ہو کسی جگہ اس کا نشان نہ پایا۔
 در شکست آرزو تعمیر چندیں آبرو ست

شبلم ایذا است اگر موج ہوا خواہد شکست
 ”ہوا“ کے معنی حرص و ہوس بھی ہیں اور عنصر بھی جس سے ہم زندگی کا سانس لیتے ہیں، اگر کرہ ہوا کی موج ٹوٹے تو شبلم پیدا ہوتی ہے،

بیدل

شبلم آب ہے، اس لئے اگر آرزو، خواہشاتِ نفس کو توڑا جائے تو آبرو کی تعمیر ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ خواہشاتِ احتیاج کی تسکین چاہتی ہیں، اور اس کے لئے ہمیں دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے اور یہ آبرو کھونا ہے۔
از بسکہ بہ تحصیل غنا حرص تو جاں کند

قبر است نگینے کہ بنام تو تو اں کند
مال و دولت کی طمع میں اتنی کاوش کہ جان کنی تک توبت آجائے
اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قبر کے پتھر پر تیرا نام کندہ کیا جائے اور بس، مفلس کی قبر پر تو کوئی کتبہ بھی نہیں ہوتا، مگر امراء کے سنگِ مزار پر ان کا نام کندہ ہوتا ہے جو اس واقعہ کی یادگار ہے کہ اس شخص نے تمام عمر جان کنی میں بسر کی دولت کمائی جو تعمیرِ مقبرہ کے کام آئی۔ ”جان کندن“ انتہائی کوشش کرنا ہے۔

رحم بر قاروں سرشتاں کن کہ از افسون حرص

ایں خراں زیر زمیں ہم بار دنیا می کشند
قارون حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، حکومت مصر کا منظور نظر تھا۔ بہت مالدار تھا مگر اتنا بخیل اور خسیس تھا کہ خدا کی راہ میں ایک کوڑی بھی خرچ نہ کرتا۔ حضرت موسیٰ نے اسے کہا کہ خدا نے تجھے اتنا دیا ہوا ہے اگر اس میں سے کچھ قوم کی مدد کے لئے خرچ کرے تو کارِ ثواب ہے، قوم محکوم اور مفلس مدد کی محتاج ہے۔ مگر قارون نے پرواہ نہ کی، آخر جب اس کے کاروبار میں تزلزل واقع ہوا اور حکومت کی نظروں سے گر گیا تو سب شان و شوکت جس کا اظہارِ فخر یہ کیا کرتا خاک میں مل گئی۔ روایت ہے کہ وہ لوہے کا تیزانہ زمین میں دھنس گیا۔ اس شعر میں تلمیح کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ قارون سرشتِ بخیل ہوتے ہیں ان کی حالت قابلِ رحم ہے کہ مرکز بھی یہ گدھے دنیا کا بوجھِ پشت پر لا رہے ہیں۔ اگر امراء کے مقبروں کو دیکھا جائے تو وہ بھی

دنوی جاہ و حشمت کی شہادت دیتے ہیں جو ان گدھوں کے سر پر کھڑے ہیں
ہلاک شد جم و خمیازہ ہائے جام بجا ست

مرگ نیز ندارد خمار جاہ شکست

جمشید تو مر گیا مگر جام چھپے چھوڑ گیا جو انگڑائیاں لے رہا ہے نشہ جب
اُتر جائے تو شرابی انگڑائیاں لیتے ہیں جسے خمار کہتے ہیں۔ جاہ و حشمت
جمشید سے بطور ضرب المثل منسوب ہے، اور نشہ دولت تو جمشید کے ساتھ
ہی جاتا رہا مگر خمار جاہ موت کے بعد بھی نہ ٹوٹا کیونکہ قبر میں خمیازہ بھگت
رہا ہے۔

• برغنا زد احتیاج خست انبائے دہر

تنگ دستی در عزیزاں ماند یک از ما گذشت

اہل دنیا کی خست اور بخل انتہائی احساس احتیاج کی وجہ سے ہے۔
وہ ہاتھ اس لئے بند رکھتے ہیں کہ دولت ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور وہ
محتاج ہو کر نہ رہ جائیں، اس لئے وہ تنگ دل، تنگ دست ہی رہے اور
تنگ دستی یعنی احتیاج اہل قناعت میں نہیں، آنا کہ غنی تر اند محتاج
تراند (سعدی)

بگذر ز غنا تا نشوی دشمن احباب اوّل سبق حاصل زر ترک سلام است
اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کم ظرف پست فطرت کو دولت ملے، تو
اپنے ابتدائی دوستوں سے ملنا بھی عار سمجھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زر جو
پہلا سبق سکھاتا ہے وہ ترک سلام ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بیگانہ آشنا ہوتا جاتا
ہے اور بسا اوقات اپنے روٹے سے دوستوں کو بھی دشمن بنا لیتا ہے۔

چہ خوش است اگر بود آنقدر ہوس بندی منقرت

کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گردشے نخورت سرت

• زیادہ بلندی پر چڑھو تو سر چکرانے لگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہے کہ بلندی

بیدل

کی ہوس اتنی حد تک ہو کہ جب تو دماں قدم رکھے تو تیرا سر نہ پھرے ہم نے
 بہت سر پھرے دیکھے ہیں۔ بہر حال یہ عارضی شے ہے، اس پر اتنا نا کم ہمتی
 ہے۔ بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ ”خلقتے بجاہ تکیہ زد و مازدیم پا“ لوگ تو
 جاہ و حشمت کا سہارا لیتے ہیں میں نے اسے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔
 دریں زمانہ زبس طبع دوں رواج گرفت

عنان کسب کمالات سوئی ناں گردید

صرف بیدل کے زمانہ میں ہی نہیں بلکہ ہمارے زمانے میں بھی یہ حالت
 ہے کہ پست فطرت اتنی عام ہے کہ کمال اسی میں سمجھ رہے ہیں کہ روٹی ہو اور
 بس۔ ہر ایک کسب کا مقصد اور غرض و نہایت صرف روٹی ہے۔ اور جتنی
 روٹیاں زیادہ ہوں اتنا ہی وہ کسب میں کامل ہو گا بلکہ کمالات کا کسب کرنا
 روٹی ہے۔ ہر ایک کی عنان توجہ اسی نان کی طرف ہے۔

جزہم چیدن کسے را با تصرف کار نیست

گندم انبار است ہر سو یک قحط آدمیت

اگرچہ گندم کی فراوانی ہے مگر قحط الرجال بھی ہے۔ آدمیت انسانیت
 تو مفقود ہے گاؤں و خرابہ کی فکر میں ہیں۔

از ترسم تا مروت و ز مدارا تا وفا

ہرچہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفتہ است

ترحم اور مروت اور مدارا اور وفا اعلیٰ اخلاقی امور ہیں، میں نے انکی
 تلاش کی تو دیکھا کہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔

نور دل خواہی غبار طبع منطلو ماں مباحث

وایت آئینہ جائے برد کا بجا آہ نیست

دل آئینہ کی مثال ہے، صاف اور کینہ و بغض و حسد سے پاک ہونا
 چاہئے۔ اس کی صفائی گرد و غبار مکر کرتا ہے اگر آئینہ پر آہ کریں تو اس کی

سطح مکدر ہو جائے گی۔ اس لئے اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا آئینہ دل نورانی رہے تو مظلوموں کے دل پر غبار نہ آنے دے۔ مناسب یہی ہے کہ آئینہ کو ایسی جگہ رکھا جائے کہ اس پر آہ کا اثر نہ ہو مظلوم کے دل پر کسی کی طرف سے غبار آجائے تو وہ آہ ہی بھرے گا۔

درکفِ اخلاق تست رشتہ تسخیرِ خلق

غافل از احسان مباحث ہیج کت بندہ نیست

تیرے اخلاق کے ہاتھ میں خلق کی تسخیر کا رشتہ ہے اور یہ ”احسان“ ہے، جس کسی پر احسان کرے گا اس کا دل مستخر کرے گا لیکن اتنا یاد رکھ کہ مخلوق تو خدا کی ہے، اور سب اللہ کے بندے ہیں تیرا بندہ نہیں جس پر تو احسان کر رہا ہے جو شخص کسی پر احسان کر کے جتا تا ہے اور جو اس نیت سے احسان کرتا ہے کہ بندہ خدا میرا حلقہ بگوش ہو جائے اور عموماً اہل دنیا ایسا ہی کرتے ہیں وہ احسان نہیں کرتے وہ سرمایہ دار لوگوں کے جان و مال کو خرید کرتے ہیں اور غرض روپیہ قرض دے کر اصل مع سود وصول کرنا ہوتا ہے۔

ز تازہ روئی اخلاق نگذری بیدل بہارتا اثر رنگ و بو ست می باشد
جب تک گلشن میں رنگینی ہے اور پھولوں کی مہک سے فضا بھری ہوئی تب تک بہار کی موجودگی محسوس ہوتی ہے، اس لئے اخلاق کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کہ زندگی کی تروتازگی ماسی سے ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ دستِ سوال دراز کرنا انتہائی ذلت ہے تو کبھی تاقیامت سوال نہ کرے۔

دل از شکایت افلاس بہ کہ جمع نمائی ۔

زباں بکام تو بس گر جہاں بکام تو نیست

بہتر یہی ہے کہ فقر و فاقہ قبول کرو اور افلاس کی شکایت اس لئے نہ

بیدل

کر دو کہ کوئی مخیر تم پر احسان کرے۔

از رفتن آبرو خیر گیر ہر جا اظہار مطلب آمد
زبان تیرے منہ میں ہے اس پر قابو تیرا ہے یا پاسکتا ہے، جہان اگر
تیرے کام نہیں آتا تو اس پر تیرا زور نہیں چل سکتا البتہ زبان تیری ہے
اسے آلودہ شکوہ و شکایت نہ کر۔ اس شعر میں یہ ”کام“ دو معنوں میں
استعمال ہوا ہے۔

غنا مسلم آں کس کہ در قلم و حاجت

غبار گرد و در راہ آشنا نہ نشیند

استغنا اس شخص کا قابل تسلیم ہے کہ باوجود احتیاج خواہ پس
جائے اور پس کر غبار بن جائے مگر کسی دوست کے راستہ میں نہ پڑے۔
گرد و غبار اُڑ کر آنکھوں میں پڑتا ہے، خاطر آلودہ ہوتا ہے، مطلب یہ
ہے کہ انسان کو اتنا بے نیاز ہونا چاہئے کہ کسی کا احسان قبول نہ کرے
خواہ احتیاج اسے خاک میں ملا دے دامن سوال کسی دوست کے آگے
بھی نہ پھیلائے۔ اسی کے ہم معنی دوسرا شعر ہے کہ

غبار غیرت آں مطلب کہ کاہ تمنا

رود بباد و بروئے کف دعا نہ نشیند

غیرت کا تقاضہ ہے کہ غیر سے مطلب برآرمی کی خواہش نہ کی جائے
دستور ہے کہ دعا کے بعد کھلے ہاتھ چہرہ پر ملتے ہیں۔ اور دعا کس
حاجت برآرمی کے لئے ہی مانگتے ہیں، کسی مطلب کے لئے ہی ہوتی ہے۔
اگر اس پر غبار عزت ہو تو منہ کو خاک آلودہ کرے گا۔ بہتر ہے کہ یہ غبار
ہوا میں تنکے کی طرح اُڑے مگر کف دعا کو آلودہ نہ کرے۔ مطلب تو
صرف اتنا ہے کہ تمنا کے تنکے ہوا میں اُڑیں مگر دست دعا پر آکر نہ
ٹھہریں اگرچہ یہ غیرت کا تقاضہ ہے مگر میں اس غیرت پر بھی خاک

ڈالتا ہوں کہ آخر یہ بھی ایک مطلب ہے میں طلب سے بھی بے نیاز ہوں۔
ہجوم شکوہ ہر کس زورِ دماغی باشد

نخیزد نالہ اذ نے تا بود مغز استخوانش را
جب تک بانسری کی ہڈی میں مغز ہے یعنی گودا ہے اور وہ اندر سے
خالی نہیں ہوتی اس سے نالہ جانشوز پیدا نہیں ہوتا اسی طرح مفلس جب
ہاتھ خالی ہوتا ہے تو مفلسی کا روتا روتا ہے، اگر کسی کے پاس مال ہو تو
شکوہ مفلسی نہیں کرتا۔

شود کم ظرف در نعمت ز شکر ایزدی غافل

کہ سیری مہر خاموشیت چوں ساغرِ دانش را
کاسہ بھرا ہوا ہو تو گویا اس کے منہ پر مہر خاموشی لگی ہوئی ہوتی ہے
اسی طرح کم ظرف جب سیر ہو تو اللہ کی نعمت کا شکر نہیں کرتا۔ ساغر بھی
کم ظرف ہے۔ ایک چھوٹی سی چیز خیم کے مقابلہ میں ہے۔
دونوں باتیں ہیں مفلس شکوہ سے زبان آلودہ کرتا ہے اور اپنی احتیاج
کا اظہار کر رہا ہے اور خیرات بھی قبول کرتا ہے اور کوئی کم ظرف ہے تو شکر
نعمت نہیں کرتا ممنون شکر گزار بندہ ہونا چاہئے۔

تا مگر دی پائمال منت امداد خلق

بے عرق گامے دو پیش از نجلت احسان برآ

مناسب یہ ہے تو لوگوں کی امداد کے بار احسان کے نیچے دب کر نہ رہ
جائے تو اس ذلت اور شرمندگی سے جو کسی کے احسان سے گوارا کرنی پڑتی
ہے باہر ہے۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ نجلت اور ذلت
سے آبرو جاتی رہتی ہے اگر تو کسی کا احسان قبول نہ کرے تو شرمندہ احسان
بھی نہ ہوگا۔

کم زیوسف غیبتی اے قدرِ داں عافیت چاہ و زنداں مغنم گیر از صفِ خواں برآ

بیدل

حضرت یوسف کو بھائیوں کے حسد کی وجہ سے چاہ اور زنداں میں جانا پڑا۔ اگر بھائی چاہ میں نہ ڈالتے تو آخر الامر زنداں میں بھی نہ جلتے اور جو واقعات وہاں رونما ہوئے پیش نہ آتے ان مصائب کا اصل سبب بھائی ہی تھے اس لئے اگر تو عافیت کا قدر داں ہے تو چاہ و زنداں کو غنیمت سمجھ آخر یہ ٹھکانہ ہی تو ہے مگر بھائیوں کے زمرہ میں شامل نہ ہو۔

زقطع اُلفت دلہا سودا سودہ نہ نشیند

شود خمیازہ مقراض افزوں در برید نہا

مقراض جب انگڑائی کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی جب اس کے دونوں پھل کھلے ہوتے ہیں تو کاٹ میں تیز ہوتی ہے خمیازہ مقراض نئی ترکیب ہے۔ اسی طرح حاسد تو دلوں کو جو بوجہ اُلفت جڑنے میں قطع کرتا رہتا ہے۔

تہمت اعمال زشت ننگ حقیقت مباد

آدمی ابلیس نیست یک حسد لغت است

آدمی کی فطرت تو پاک ہے۔ لیکن بد اعمالی حقیقت انسانی پر بد نما دھبہ ہے، آدمی شیطان تو نہیں مگر حسد کی وجہ سے مورد لعنت بن جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ شیطنیت حسد ہی ہے شیطان نے بوجہ حسد آدم پاک سرشت کا انکار کیا اس لئے اگر انسان بھی حاسد ہو تو گول سے شیطان نہیں کہیں گے مگر جس طرح شیطان ملعون ہوا یہ بھی لعنت کی زد میں آجائے گا۔ نہایت نرم اور لطیف پیرایہ میں حاسد آدمی کو شیطان ہی کہا گیا ہے۔

کجا روم کہ شوم امین از لب غماز۔ بعالم آدمیاں ہم فرشتہ اند مرا

کہتے ہیں کہ فرشتے (کرام کا تبیین) ہمارے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے اعمال اکثر بُرے ہوتے ہیں یہ تحریر یا ہمارا نامہ اعمال بروز حشر کھولا جائے گا گویا فرشتے غمازی کریں گے اس دنیا میں بھی لوگ غمازی کی وجہ سے

یہی کام میرے لئے فرشتوں کا کر رہے ہیں اب جائیں تو کہاں جائیں نہ دنیا میں غماز سے چھٹکارا نہ حشر میں نجات، دنیوی زندگی تعلقات ہی ہے اور انہی تعلقات میں ہر ایک انسان جکڑا ہوا ہے۔ اور ان کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔

سرمایہ نشاط تو رفع تعلق است از ترک برگ نے بمقام نوا رسید
لفظ ”مقام“ راگنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بالسرری کے
پتے علیحدہ ہوئے تو نغمات بھی الاپنے لگی۔ ظاہر ہے کہ نغمہ نشاط آور ہے۔
اس لئے رفع تعلق سے انسان نشاط کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

در خور رفع تعلق عیش خرم من کن چو شمع

خار پا چندر انکہ می آرد بروں گل می شود

”خار“ کے معنی کانٹا بھی ہے اور وہ دھاگہ یا بتی ہے جو شمع میں جلتی ہے
”گل“ کے معنی پھول اور گل شمع، ظاہر ہے کہ پھول سبامان عیش و نشاط ہیں
خار شمع یعنی بتی جلتی بھی باہر نکلے گی اتنے ہی گل شمع پیدا ہوں گے کانٹا اگر
پاؤں کے اندر ہے تو تکلیف دہ ہے کالا جائے تو راحت محسوس ہوگی۔
اس لئے خار تعلق جو خلش پیدا کرتا ہے عیش کے منافی ہے راحت اسی
میں ہے کہ یہ کانٹے جو ہمارے راستہ میں بچھے ہوئے ہیں پاؤں میں نہ چسبیں۔

اگر مروی در تخفیف اسباب تعلق زن

کز انگشت دگر انگشت نزدیک دارد

اگر تو مرد آدمی ہے تو اسباب تعلق کو کم کر، انگشت نری یعنی انگوٹھا کا
ایک بند یا جوڑ یا پور دوسری انگلیوں سے کم ہوتا ہے۔ لفظ ”نر“ سے
مردی اور مردانگی کا خیال پیدا کیا گیا ہے۔ تعلقات بندھن ہے اس
گرہ کو کھولتے جاؤ یہی ہمت مردانہ کا کام ہے۔ ”التوحید اسقاط
الاضافات“ کثرت جو امور اضافی ہیں ان کو محو کرتے جاؤ تو وحدت رہے۔

جائے گی۔

سبب قیدِ علایق زخرد پر سیدم گفت در چاہ ہمیں فطرت کو رم افگند
میں نے عقل سے پوچھا کہ توجو علایق کی قید میں جکڑی ہوئی ہے اس کا
سبب کیا ہے، جواب دیا یہی میری اندھی فطرت ہے جس نے مجھے کنوئیں
میں گرایا۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، عقل کی فطرت کا تقاضا ضہ ہے کہ وہ
علایق کی طالب ہے۔ اندھا نشیب و فراز دیکھ نہیں سکتا راستہ میں گرہا
آیا تو اس میں آرہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقل ہی ہے جس نے ہمیں علایق
کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، اور اندھے کنوئیں میں گرایا۔ عقل حریص
کثرت کی طالب ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش

آنچه ماور کار داریم اکثرے در کار نیست

حریص قانع نہیں ہوتا ورنہ جتنے بھی اسباب معاش ہیں ہم کام میں
تھوڑے ہی لارہے ہیں باقی بیکار پڑے ہیں یعنی اسباب معاش میں
سے تھوڑے ہی کام کے ہیں۔ لیکن عقل کثرت پسند انھیں جمع کر رہی ہے
اور دور اندیشی یہ ہے کہ ممکن ہے کہ بوقت ضرورت اسباب کی کمی ہو اس لئے
ذخیرہ رکھنا چاہئے تاکہ بوقت حاجت کام آئے۔

بیدل اسباب تعلق بود رنگ آگہی

آئینہ صیقل زدند آتہا کہ پشت پا زدند

لفظ ”آگہی“ بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے۔ غالب نے بھی
اکثر اشعار میں استعمال کیا ہے۔ معرفت اشیاء جو عقلاً حاصل ہوتی ہے
دراصل آئینہ پر رنگ ہے۔ جن لوگوں نے ان اسباب تعلق کو ٹھکرا دیا
وہی آئینہ دل کو صیقل کرتے ہیں جس سے رنگ کدورت دور ہوتا
ہے۔

آگہی طوفان غفلت ریخت بیدل بر جہاں

عالی بیدار بودا میں فتنہ ناخوابیدہ بود

ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی آگاہ ہوگا اتنا ہی باشعور ہوگا جو عین بیداری کا تقاضا ہے، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ آگاہی معرفت اشیاء اور کثرت اشیاء اسباب تعلق کا شعور ہے۔ چونکہ عقل اسی کی طالب ہے۔ اس لئے ہر ایک شخص زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور عالم انسانی میں فتنہ جاگ اٹھا، جب تک یہ فتنہ سویا ہوا تھا یہ سمجھو کہ ہم بیدار تھے، یہ فتنہ جاگا تو ہم سو گئے یعنی آنکھوں پر پردہ غفلت پڑ گیا، جب ہر ایک شخص اسباب معاش زیادہ سے زیادہ جمع کرے گا تو ظاہر ہے کہ جو زبردست ہیں وہ کمزور کو اس کے حق زندگی سے محروم کر دیں گے، زبردست وہی ہے جس کو ذہنی تفوق حاصل ہے اور یہ قوت عقلیہ ہے جس کے بل بوتے پر یہ فتنہ برپا ہے۔ وضع دنیا ہیچ بردیوانہ تاثیر نکر

بیشتر این برق عبرت خرمین فرزانہ سوخت

دنیا اور دنیا داری کا طور طریق دیوانہ پراثر انداز نہیں ہوتا، اکثر ”اہل الجنة بلہم“ سادہ لوح آدمی مزے میں رہتے ہیں یہ بجلی اگر گرتی ہے تو اکثر و بیشتر اہل عقل پر ہی گرتی ہے۔ کچھ عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ تا توانی گاہے گاہے بے تکلف زیستن

زیں تعلقہا کہ داری اندکے وارستن است

ذوق مرحوم کہتا ہے کہ:

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

آرام میں وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

جہاں تک ہو سکے کبھی کبھی بے تکلف زندگی بسر کرنی چاہئے تکلف

کے اسباب بھی تعلقات ہیں ان سے تمہارا کبھی علاحدہ ہونا چاہئے۔

بیدل

اچھلے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
ہر کس از بے تکلف زیستن آگاہ نیست

آدمی یوں خلل در عیش مردم می کند
سامانِ تیش تکلفات کا ساز ہی ہے، اور لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے
کہ ”آدمیت“ یہی ہے کہ یہ تکلفات زیادہ سے زیادہ ہوں، بے تکلف زندگی
بسر کرنا انسانیت کے مناسب خیال نہیں کیا جاتا، یہ نظریہ انسانیتِ غلط
ہے۔ یہ تکلفات خورد و نوش و پوشش میں ختم ہو جاتے ہیں ان سے بہرہ ور
تو بہائم بھی ہیں۔ انسان ان میں تکلفات پیدا ضرور کرتا ہے، لیکن خود شناسی
کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ بخود نمی رسد تا بخیرا نمی رسد۔

گاؤ خراز آگاہی انسان نگشتہ است بیک

آدمی گر اند کے غافل شود خسر می شود

شعور و آگاہی انسان کی امتیازی خوبی ہے۔ اگر محض خورد و نوش و
پوشش کے تکلفات پر صرف ہو تو آدمیت سے بعید تر ہے، اگر انسان
خود شناسی سے ذرا غافل ہو تو گدھا بن کر رہ جاتا ہے۔

آگاہی و افسردگی دل چہ خیال است

تا دانہ بخود چشم کشود است نہال است

دانہ جب آنکھ کھولتا ہے یعنی پھوٹتا ہے تو درخت بن جاتا ہے،
جب تک آنکھ بند ہے افسردہ دل خود شناس نہیں ہوتا، خود آگاہ اپنے
مقامِ انسانیت سے واقف ہوتا ہے۔

غبارِ غفلت و روشن دلی نگرود جمع

کجا ست دیدہ آئینہ را غنود نہا

روشن دل غافل نہیں ہوتا، آئینہ کبھی نہیں اونگھتا اور نہ سوتا ہے

اور ہمیشہ بیدار ہے۔ اس لئے غفلت کی کدورت اور روشن دلی کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

پیچ کس دربار گاہ آگاہی مردود نیست

صافی آئینہ با گبر و مسلمان آشناست

آئینہ کے سامنے جو بھی صورت نظر آئے ہو یہو نظر آئیگی۔ آئینہ کو اس سے غرض نہیں کہ کوئی نیک ہے یا بد، کوئی گبر یا مسلمان، آئینہ کا کام اتنا ہے کہ بتا دے کہ تم کیا ہو، اور صحیح صورت بلام و کاست پیش کر دے گا، آئینہ سب کا شناسا ہے اور کسی کو مردود قرار نہیں دیتا، خود شناسا کبھی مردود نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کی شرح حسب ذیل شعر ہے :-

شامل است اخلاق حق یا طور خوب و زشت خلق

شخص دین را بیدل از گبر و مسلمان چارہ نیست

دین حقیقت واحدہ ہے اور اصل تمام مذاہب کی ہے (وہدینہ السبیل اما شا کرا داما کفورا) مذاہب تمام فروع ہیں۔ فطرتاً ہر ایک کو دین کا احساس ہے کوئی کفر کرے یا شکر یہ اختیار اسے دیا گیا ہے (لا الہ الا فی الدین) لوگوں کے طور اچھے ہوں یا بُرے اس کا اثر دین پر نہیں پڑتا، لیکن دین ان کے احساسات و جذبات پر ضرور مؤثر ہوتا ہے۔

درا فتاد ن بروئے یک دگر دوراست از آگاہی

زمزگاں ہم اگر این اتفاق افتد خواب افتد

ایک دوسرے کا لڑنا، دست و گریباں ہونا آگاہی سے بعید ہے۔

”دو عاقل را نباشد کیس و پیکار“ آگاہی اور بیداری ہم معنی ہیں، بیداری میں مزگاں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں مان میں آویزش نہیں ہوتی، خواب یا غفلت آگاہی کی ضد ہے، اگر مزگاں ایک دوسرے پر گر تی ہیں تو خواب میں ویسا اتفاق ہوتا ہے۔

بیدل

تادل الم نہ چلیند از کینہ محترز باش گرتلخی از حلاوت گل کردہ میوہ داغیست
 پھل میٹھا اگر داغی ہو تو اس میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح دل
 اگر کینہ سے داغدار ہو تو اس میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔
 کلفت زدائی کینہ دلہا تو واضح است زین تیشہ می توں گرہ سنگ باز کرد
 کینہ سے دل پر گرہ پڑ جاتی ہے اور دل سخت اور کلفت زدہ ہو جاتا
 ہے، تو واضح سے یہ خرابی اسی طرح دور ہو سکتی ہے جس طرح کلہاڑا سے پتھر
 توڑا جاسکتا ہے۔

از چرخ نہ ہر ابلہ دنواں گلہ وارد جائی گلہ این است کہ انساں گلہ دارد
 اگر گردش ایام کی شکایت ہر ایک نادان اور احمق کرتا ہے تو کہہ سکتے
 ہیں کہ وہ تو بے وقوف ہیں اس لئے ان کی شکایت بے معنی ہے، لیکن جب
 انسان ہی شکوہ و شکایت کرے تو جملے شکایت ہے، یعنی انسانیت اور
 آگاہی اور علم و فضل ہم معنی الفاظ ہیں، ان کو تو کبھی کوئی شکایت گردش
 روزگار کی نہ ہونی چاہئے، جو ان کی زندگی کو تلخ بنا دے۔ لیکن جب یہ شکایت
 کریں تو پھر گلہ صحیح ہے۔ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان جو
 حقیقت آگاہ ہے اگر روزگار کا گلہ کرے تو انسانیت کی شان سے بعید ہے۔

لے پے خبر از کم خرداں شکوہ چہ لازم آدم نہ بود آنکہ ز میواں گلہ دارد
 آدمی اگر بہائم کی شکایت کرے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی ”پشو“ ہے۔ کم
 عقل بہائم ہی ہیں اگر ان سے کوئی حرکت ناشائستہ سرزد ہو جائے تو جملے
 شکوہ و شکایت نہیں آدمیت سے بعید ہے کہ ان کا گلہ کرے۔

بر بزرگان از طواف خاکساراں ننگ نیست

چرخ با آں سرکشی گرد نہ میں گردیدہ است
 اگر بزرگ خوردہ سے تعظیم کے ساتھ پیش آئے تو ان کی بزرگی کو بڑھ
 نہیں لگتا، آسمان باوجود رفعت و بلندی زمین کے گرد گردش کر رہا ہے۔ یعنی
 ”تو واضح نہ گردن فرازاں نکوست“

قطعات

اصناف شعر میں سے کوئی صنف ایسی نہیں جس کو بیدل نے نظر انداز کر دیا ہو۔ کوئی بحر نہیں جس سے وہ آشنا نہیں، زمین شعر کا گوشہ گوشہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے۔ ہم نے قصائد اور قطعاً و تاریخ اور ترجیعات و مخمس وغیرہ کو چھوڑ دیا ہے۔ چند قطعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ کم از کم ایک ہی موضوع تشذیب تکمیل نہ رہے۔

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست

چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست

بحر میں تموج اور اضطراب تلاش گوہر میں ہے۔ وہ نایاب ہے حالانکہ وہ بحر کی تہ میں صدف کے آغوش میں ہے، دوسرے مصرع میں آیہ ”اللہ نور السموات والارض“ کی طرف اشارہ ہے، یہ نور تمام کائنات کو روشن کر رہا ہے۔ مگر کائنات تو مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ نور بوجہ انتہائی لطافت نظر نہیں آتا، ایک تاریک مکان میں شمع روشن کی جائے تو مکان اور مکان کی ہر ایک شے نظر آئے گی۔ نور شمع پر جواشیاء پر پڑتا ہے نظر سب سے اول پڑتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور نہیں۔ اسی طرح کل کائنات اللہ کے نور سے روشن ہے مگر ہم اس نور کو نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات بذاتہ

روشن ہے، اس کو سطحی یا محسوس مشاہدہ کہتے ہیں، لیکن تفکر و تدبیر سے جو عقلاً ہوتا ہے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے جس کا مذکور ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں۔

دیرانہ غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست
دیر میں گبر آتش ہر وقت روشن رکھتے ہیں اور کہیں بجھنے نہیں دیتے وہ
اگنی کی پوجا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نار منظر نور یزداں ہے۔ ”صنم“ تو پتھر
کی مورتی ہے اور آگ بھی ایک مادی شے ایسی ہی ہے جیسا آب و باد و خاک
دیر اسی غصہ میں جل بھن رہا ہے کہ صنم نظر نہیں آتا، کعبہ کا غلاف سیہ ہے اور
کعبہ میں محراب نہیں جو سجدہ کی جگہ ہے، کعبہ اس بات کا ماتم کر رہا ہے کہ
محراب یعنی جہاں اور جس کی بندگی کے لئے یہ تعمیر ہوا یعنی رب کعبہ وہ
کہاں ہے، ظاہر ہے کہ دیر و کعبہ بھی سنگ و خشت کی عمارت ہے، جس کی
بندگی اور عبادت کے لئے مخصوص ہیں وہ تو وہاں نہیں اور اگر وہاں ہے
تو دیر و کعبہ کی کیا خصوصیت ہے ہر ایک زمان و مکان میں ہے، سوال تو
اس ذات کے بارہ میں ہے جو مرجع کل ہے۔

اے سمندر بہوس داغ فروش، آتش کو

ماہیاں تشنہ بمیزند دم آب کجاست

کہتے ہیں کہ آتش کدہ چونکہ ہزار ہا سال سے جل رہا ہے اس میں بھی
زندگی پیدا ہو جاتی ہے اس میں ایک جانور یا کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جس کو
”سمندر“ کہتے ہیں، سمندر ہندی میں بحر کو کہتے ہیں، آگ کی ضد پانی ہے،
اور یہ تو اہل علم جانتے ہی ہیں کہ پانی مایہ حیات ہے، بحر میں پھلیاں ہیں،
سمندر کے دل پر اس خواہش کا داغ ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ آگ کہاں
ہے حالانکہ آگ ہی سے اس کی زندگی ہے، پھلیوں کو پیاس اسی شے کی

ہے کہ سرچشمہ آب معلوم کریں حالانکہ پانی ہی میں ان کی زندگی ہے، ان سوالات کا جواب ذیل کے قطعہ میں دیا گیا ہے۔

بیدل آں گوہر نایاب سراغ بھیلے است کہ پرسیدن نیست
وہ گوہر وہ حقیقت جس کا سراغ ہی نایاب ہے ایسا محیط یا بحر ہے کہ
چند و چہ و چوں لاکھ سوال پوچھو اس کا پتہ نہ کسی کو ملا اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔
عکس افتادہ در آئینہ ہوش گل تو اں گفت ولے چیدن نیست
آئینہ شعور میں اتنا تو نظر آ رہا ہے کہ کچھ تو ہے۔

پیش بیناں بارگاہ الست پیش ازیں رہ نبرودہ اند کہ ”ہست“
(سعدی)

لیکن آئینہ تو صرف عکس ہی عکس ہے
فرض کرو کہ یہ ایک پھول کا عکس ہے اس پھول کو آپ توڑ نہیں
سکتے اصل پھول جو آئینہ اور آپ کی نظر سے باہر ہے دسترس سے بھی بالاتر
ہے عکس ہی سہی مگر یہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

عجز ادراک اگر فہمیدی معنی این است کہ فہمیدن نیست
جو امر ہمارے قیاس و گمان و دہم سے بالاتر ہو اور جہاں عقل و فکر کی
رسائی نہ ہو اس کا ادراک ہم کر نہیں سکتے، اس لئے جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ
یہ حقیقت ہمارے ادراک سے باہر ہے اور اس کے فہم سے ہم عاجز ہیں تو
وہ حقیقت بلا ریب معنی تو ہے مگر فہم سے بالاتر۔

سنخہ ہا در بغل و فہم محال جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست
کائنات کا ذرہ ذرہ پتہ پتہ دفتر امکانات ہیں اور ہمارے تمام علوم
کا ماخذ یہی کتاب کائنات ہے یہ سب کچھ ہے مگر یہ درس علم معرفت کون
دے رہا ہے، اس کا فہم نہیں و دو عالم میں ہر طرف اسی حسن ازلی کا جلوہ مشاہدہ
ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وجہ ذوالجلال والا کرام نظر نہیں آتا۔

بیدل

سواد نسخہ تحقیق بیدل وقتے دارد

دو عالم جلوہ باید خواندن و پیرنگ ہمیدن
سخن طرفہ شنیدن دارد کہ کم از معنی نشنیدن نیست
یہ عجیب بات بھی سننے کے لائق ہے کہ نہ سننا بھی معنی سے کم نہیں جو
فہم سے بالاتر ہے۔ اس حد تک تو بیدل لا اوریت کا ترانہ سنج ہے۔ اس کے
بعد کہتا ہے کہ:-

احوال دیگران زچہ بر خود فسرده

بیدل از خود بگو کہ تو ہم کم نبودہ

ہمارے تمام علوم معرفت غیر پر ختم ہو جاتے ہیں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے
ہیں کہ ہمارے گرو و پیش کیا ہے اور تمام طبقات کی خاک چھانتے ہیں۔
اپنی خودی، اپنے نفس سے ہم بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ حالانکہ
راز حیات خضر سے بے فائدہ نہ پوچھ
زندہ ہے اپنے دم سے میجا کہیں جسے

جو کچھ بھی ہماری ذات سے وابستہ ہے، اس کا شعور ہمیں ہے۔ اگر
ہم نہ ہوں تو عدم ہے اس لئے سب سے مقدم تو معرفت نفس خود کی ضرورت
ہے۔ جگ بیتی تو وہ ہے جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور ہمارے ہی تصورات
ہیں لیکن ”آپ بیتی“ ثابت شدہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔

گر ریشہ ز تخم تو آید بروئے کار بند نقاب خرمن امکاں کشودہ
ایک بیج میں ایک درخت کی حقیقت پوشیدہ ہے جب یہ بیج ریشہ
کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کے امکانات جو پہلے پوشیدہ تھے ظاہر
ہو جاتے ہیں حقیقت انسانی وہ ہے جسے اصطلاح میں لفظ ”من“ یا ”انا“
() کہتے ہیں اور ہر ایک شخص اپنی حقیقت سے جیسا واقف ہو سکتا
ہے اس کا غیر نہیں ہو سکتا۔ اور اس حقیقت کا نشود نما جو کچھ اس پر

قطعات

منکشف ہے وہ غیر پر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصل اصول تحقیق ہے اگر اس کا فہم ہو گیا عالم امکان پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور تمام امکانات کی حقیقت بھی منکشف ہو گی۔

برگ گلت ہزار چمن عرض رنگ و بو ست

آئینہ ”خودی“ وجہا نے نمود

تو ایک پھول ہے اور اس پھول کی ہر ایک پنکھڑی میں ہزار چمن کی رنگینی اور خوشبو سی ہوئی ہے۔ تیری ”خودی“ ایک آئینہ ہے جس میں ایک جہان منعکس ہو رہا ہے، یعنی تو خود ایک جہاں ہے، نہاں در ہر کف خاک کے جہاں نیست، جہاں تو تیرے قلب میں سمایا ہوا ہے، اس لئے تیری خودی ہی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے جس کا جلوہ دو عالم ہے۔

مرگاں تست بست و کشاد طلسم دہر

اے چشم آگہی بچہ غفلت غنودہ

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر ہم مرگاں اٹھا کر دیکھیں تو ایک جہاں کا نظارہ پیش نظر ہے اور اگر بند کر دیں تو سب کچھ بمنزلہ عدم ہے، یہ طلسم دہر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تیری پلکوں کے کھلنے اور بند ہونے پر موقوف ہے۔ تیری آنکھ بصر و بصیرت ہے کس غفلت میں سویا ہوا ہے۔

عالم تمام عرض پیام خود است و بس

اے شوق نالہ کن چہ از خود ستودہ

تمام عالم اپنی ہی خودی کا پیام دے رہا ہے اسے غیر کا عشق نہیں، نور ظلمت سے اور ظلمت نور کے حال سے بے خبر ہے، ہستی میں ہر ایک امکان ظہور کا طالب ہے۔ ہم اسے حسن و خوبی سے موسوم کریں یا بُرے ناموں سے یاد کریں، مدح کریں یا ذم یہ ہمارا اپنا تصور کسی شے کی نسبت ہے۔ وہ شے ہماری مدح و ذم سے بے نیاز ہے، اور اپنے حال میں مست ہے۔

بیدل

ہستی میں ہر ایک شے پیامِ حق لے کر آتی ہے، یعنی جو خوبیاں اس میں
 فطرتاً ودیعت ہیں اس کا اظہار کرتی ہے اور یہ یا پل نہیں، ہوائیں مبشرات
 ہیں، بارش کی خبر دیتی ہیں، مینہ برستا ہے تو مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے،
 آگ کا خاصہ جلانا ہے اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے اپنے ہی خواص اور
 حقائق کا اظہار کرتی ہے یعنی اپنی ہی ”خودی“ سے واقف بھی ہے اور اس کا
 مظاہرہ بھی کرتی ہے اسے غیر اور اس کے حسن و قبح سے کوئی غرض نہیں۔
 فہم اگر نبود شنیدن ہم غیبت گیر و بس

نغمہ با بسیار دارد تار موہوم نفس
 اگر کوئی شخص عقل سے کام لینا جانتا ہے اور جو کچھ اسے فہم حاصل
 ہے بیان کر سکتا ہے تو ایسے شخص کا کلام اس شخص کو گوشِ ہوش سے سنا
 چلے جائے جو خود فہم سے بے بہرہ ہے۔ اگر منہ سے بول نہیں سکتے تو خاموشی سے
 دوسروں کی سنو، اگر کان شنوا ہیں تو گو ایک شخص گنگ ہو اس شنوائی سے
 بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اگر سمع سے بے بہرہ ہو تو زبان اسے کچھ
 فائدہ نہ دیگی، وہ بول نہیں سکتا، اس لئے ثابت ہوا کہ سماعت حصول
 فہم کے لئے مقدم ہے، تارِ نفس موہوم ہے، ہر ایک سانس دم بھر میں
 فنا ہوتا رہتا ہے، اس تارِ نفس سے بے شمار نغمات نکلتے ہیں اور ان کا تعلق
 ”سمع“ سے ہے۔

از طلسم ما و من بیگانہ نتوان زیستن

شوقِ مفتِ زندگیہا عشقِ اگر نبود ہوس
 یہ جہاں من و تو بھی ایک طلسمی کارخانہ ہے، اس سے الگ ہو کر ہم
 زندہ نہیں رہ سکتے، اور ظاہر ہے کہ جو مر گیا وہ الگ ہو گیا، اگر ہوا و ہوس
 عشق کا درجہ حاصل نہ بھی کرے پھر بھی شوق سے تو خالی نہیں اور زندگی اور
 لطفِ زندگی اسی ہنگامہ آرائی میں ہے خواہ یہ ہوس ہو یا عشق۔

قطعات

ایکہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش

عمر با بید کہ دریابی زبان خویش را

سطور بالا میں ”نطق“ کا ذکر ہو چکا ہے۔ علم منطق صحیح خیالات کی ترکیب و ترتیب سے واقف ہونا ہے، خیالات ممکنات خارجہ کے ذہنی تصورات ہیں۔ ان تصورات ذہنی اور اشیاء خارجہ کی صورتوں میں عین مطابقت کا نام علم الاشیاء ہے، ان صورتوں میں حقائق اشیاء رونما ہوتے ہیں۔ یہ علم حقائق ہے، ان کا فہم بہت مشکل ہے، اور فہم کے بعد ایسے موزوں اور مناسب الفاظ میں اس کا اظہار کہ متکلم مخاطب کے دل میں اپنا مافی الضمیر فہم من وعن ڈال دے۔ علم ”بلاغت“ سے موسوم ہوتا ہے، ہمارا مافی الضمیر کیا ہے؟ وہی خارجی کائنات کا تصور، یا یوں کہو کہ یہ کائنات کے تصویری حروف ہیں۔ اور تمام کائنات چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویریں ہی تو ہیں یہ تصویری حروف اپنے معانی یا حقائق ہم پر واضح کر رہے ہیں، یہ تصویری حروف کائنات کی زبان ہے۔ یہ حروف کتاب کائنات کے ہیں اور یہی ہمارے آئینہ دل پر منعکس ہوتے ہیں ان کے معانی کی ترجمانی ہمارا قلب اپنی مادری زبان میں کرتا ہے۔ یہ ہے ”زبان خویش“ جس کی حقیقت وہی کائنات کے تصویری حروف اور معانی ہیں۔ اگر ہمیں اس حقیقت کا فہم ہے اور اس فہم کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں تو ہمیں علم حقائق حاصل ہے مگر عموماً اس میں ہمارے تو ہمت اور تمنائیں دخل دیتی ہیں اس حالت میں یہ ”ظنیات“ سے تعبیر ہوتا ہے اور ”حق“ سے دور تر ہے، بیدل کہتا ہے کہ حقائق کا فہم بلا آمیزش ظنیات بہت مشکل ہے۔ ”حق“ کا مشاہدہ یا کائنات کو اسی صورت میں دیکھنا جیسی کہ وہ ہے تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے ساتھ ہی ممکن ہے اور اس کے لئے ایک عمر چاہئے۔

روزگارے در قفائی و ہسم باید تا ختم

تا دیریں صحرا بدست آری عنان خویش را

بیدل

ہم عرصہ دراز تک توہمات اور ظنات کو حق سمجھ کر ان کا اتباع کرتے
ہیں۔ اس صحرائے تحقیق میں قرن ہا قرن گزر جاتے ہیں پھر کہیں جا کر ہماری
عنانِ توجہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہے۔ عالم انسانی کے ذہنی ارتقا و تاریخ
کی ورق گردانی کرو یہی کائنات ہے جس کی اشیاء ہمیں دیوتا اور دیویاں
نظر آتی ہیں اور ان کی مورتیوں کو ہم پوجتے رہے، یہی سورج اور چاند
دیوتا ہیں جو آج ہمارے گھر کے چراغ ہیں، یہی کائنات ہے جو کسی وقت
ہماری معبود تھی اب ہم صحیح فہم کے ساتھ مسخر کر رہے ہیں۔ اب یہ ہماری
بھاری بھاری ہے۔

در ہوائی بے نشانی تا نگر دی بے نشان

سخت دُشوار است پے بردن نشانِ خویش را

جب تک تو اپنے نفس کی خواہشات، توہمات، ظنات غرض سب
مکروہات سے خالی الذہن نہیں ہوتا جسے اصطلاح میں ”تقویٰ“ کہتے ہیں تو
اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا کائنات ہماری پیدا کردہ نہیں اس کے تصورات
ہمارے پیدا کردہ نہیں ان کا ایک شعور ہے، فہم ہے جسے ہم اپنا کہتے ہیں لیکن
ہم کچھ آپ بھی پیدا کرتے ہیں خواہ اچھا ہو یا بُرا۔

دے برہم زدن دارد قماش خوب و زشت

تاشناسی جنس موہوم دکان خویش را

ہماری دکانِ قلب کا سرمایہ اصلی تو یہی تصورات ہیں جن کا تذکرہ
ہموچکا، لیکن مصری، یونانی، رومی، ایرانی، ہندی ”مالی تھولوجی“ کا مطالعہ
کہ و آپ کو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا
روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا یہ سب جنس موہوم ہے اور باطل ہے حق کو ہماری
قوت واہمہ باطل بنا رہی ہے۔ شیخ پتلی نے جو اسباب اپنے تخیل میں جمع رکھے
تھے انھیں حق کی ایک ٹھوکر نے پاش پاش کر کے رکھ دیا، غرض جب تک

تقوے اختیار نہ کرو گے حقیقت کا فہم محال ہے۔ تیری ہستی کا سرمایہ بھی خوب زشت ہے جو موہوم ہے

ہوش اگر باشد کتاب و نسخہ در کار نیست
چشم واکردن زمین تا آسماں فہمیدن است
دور گردیہای وہم آنسوی خواہشت می برد
ورنہ ہر چیزے کہ می بینی ہماں فہمیدن است

”واہمہ“ ہمیں ہر ایک وادی میں سرگزداں لئے پھرتا ہے اور ہم کائنات کے باہر توہمات کے پروبال پر پرواز کرتے ہیں، ورنہ حقیقت یہی ہے جو ہمارے آنکھوں کے سامنے بلکہ اس سے بھی نزدیک تر ہے، ہمارے شعراء کا تخیل عموماً یہی واہمہ ہے۔ صحیفہ فطرت یہی ”کتاب“ کائنات ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھلی ہے۔ ذرہ ذرہ اس کی آیت ہے (ذلک الكتاب لاریب فیہ) اور اسی سے ہمارے تمام علوم ماخوذ ہیں۔ اس لئے اہل عقل و فکر اسی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور عقائد ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ”واہمہ“ ہے جو صحیح معنی میں شیطان ہے جو ہمیں دور تر رکھتا ہے اور ہم شبہات اور وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں، ورنہ جو کچھ کہ تو دیکھ رہا ہے اور دور جانے کی ضرورت نہیں، نزدیک تر دیکھ رہا ہے یہی کچھ سمجھنے کی بات ہے۔

مقامِ بیدل

بیدل کا جو کچھ مرتبہ ہے اس کے کلام سے اس کا پتہ مل سکتا ہے ہم نے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں، ان میں اس کا حکیمانہ تفکر زیادہ تر کار فرما ہے۔ ایک خشک مضمون میں اس کے شاعرانہ تخیل نے جو لطافت اور رنگینی پیدا کی ہے وہ خاص بات ہے جو اسی کا حصہ ہے ہم چاہتے تھے کہ ایسے اشعار کا بھی انتخاب کریں جس میں زیادہ تر شعریت پائی جائے، مگر وہ ہر ایک بات میں وہ بات پیدا کرتا ہے جو دل پر نقش ہو جاتی ہے جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ چند اشعار تلاش سے ہم نے منتخب کئے ہیں، شاید ان سے اس کی بلند می فکر کا کچھ اندازہ ہو سکے، بیدل نے اکثر دو غزل، سہ غزل بلکہ چہار غزل اور شش غزل بھی ایک ہی زمین میں کہی ہے، طویل بحر میں کہنا تو اس کا حصہ ہے۔

یارب چہ بلا بود کہ تر دستی ساقی

بر خرمن مخمور نشاند آتش تر را

شراب کو "آتش تر" کہا گیا ہے۔ آگ کا کام جلانا اور تری کا بجھانا ہے۔ "خرمن مخمور" میں "خرمن" کو ڈراگ کا ہے اور پانی کی تری اس خطرہ کو رفع بھی کرتی ہے مطلب یہ ہے کہ عالم اصداد ہے اور اصداد ایک دوسرے

کو فنا کرتی ہیں مگر ان میں عدل سے توازن ایسا قائم کیا گیا ہے کہ دونوں موجود بھی ہیں اور مخلوط بھی اور ایک دوسرے کے اثر کو زائل بھی کر رہی ہیں اور مدحیات بھی ہیں، ساقی اصطلاح میں ذات حق تعالیٰ ہے، (دسقم رہم شراباً طہورا)

زیر باد یہ رفتم کہ بسر چشمہ خورشید

چوں سایہ بشویم ز جہیں گرد سفر را
اس شعر میں چند خیالات کے اختلاط سے ایک مضمون باندھا گیا ہے، بیدل کے کلام کی طرز یہ خاص ہے ”یاد یہ“ یہ خاکدان کرۂ ارض ہے، سایہ بھی اسی پر پڑتا ہے، سایہ اسی شے کا ہوتا ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے، انسان کا جسم بھی خاکی ہے۔ غبار آلود چہرہ کو چشمہ کے پانی سے دھویا جاتا ہے، یہ تصورات ہیں، شعر میں آیہ کریمہ (کیف مد النمل الایہ) کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس باد یہ ہنستی میں کہیں سے مسافر آئے ہیں اور اس سے گزر رہے ہیں۔ اس باد یہ کی گرد و غبار سے ہم اثناء سفر میں ضرور آلودہ ہوئے اب چشمہ خورشید پر جا کر منہ ہاتھ دھوئیں گے۔ جس طرح سایہ خورشید کی روشنی میں فنا ہو جاتا ہے اسی طرح یہ گرد بھی دور ہو جائے گی یعنی جب ہم اصل آفتاب حقیقت کی طرف رجوع کریں گے تو اس جسم خاکی کی آلودگی دور ہو جائے گی اور روحانی لطافت باقی رہ جائیگی۔

یکتائے آفرید لب خود ستائی عشق در نقطہ دہن الفی داشت میم ما

لفظ ”ما“ میں دو حرف میم اور الف ہیں۔ سب سے بڑا وصف اور

تعریف کسی کی یہ ہے کہ وہ یکتا ہے، بے مثل ہے، اگر ویسا ہی کوئی اس کا مد مقابل ہو تو ظاہر ہے کہ وصف یکتائی قائم نہیں رہے گا۔ منہ کی صورت بھی ”نقطہ“ کی ہے۔ عشق خود ستا ہے اپنی حمد و حدت آپ کر رہا ہے کہ وحدت یکتا ہے جیسا الف، الف نقاط کا مجموعہ ہے، ”الف“ کے معنی عربی میں یکہ و

بیدل

تنہا شخص، الف تو وحدت بلا شرکت غیرے پر دلالت کرتا ہے، وحدت سے وحدت ہی کا ظہور ہو گا۔ ”میم“ بحولہ خط ”ما“ میں ہے الف سے پیوستہ ہے اور ایک ہی حرف ہے۔ عربی میں حرف ”میم“ کے معنی جوڑنے والی شے ”موم“ بھی یہی نقطہ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ خالق تو ذات یکتا ہے ہمت ہے مگر مخلوق بھی یکتا ہے اور مخلوق کی یکتائی ہی ستائش یکتائے ذات الہی ہے۔ اور یہی اس کی یکتائی پر دلالت کرتی ہے، ”دہن“ کو نقطہ سے تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ ریاضی میں یہ ایک موموم شے ہے جس کا نہ طول ہے نہ عرض، ”لب خود ستائی عشق“ نے نقطہ دیں میں الف وحدت کو ”ما“ کی میم سے ربط دیا ہے۔ مثنوی عرفان میں تعیہ اشعار میں بیدل یہی خیال در واضح کرتا ہے کہ نہ گنجد در احد غیر از احد، پیچ۔ ”احد“ کے دہن سے ایک حرف میم نکلا (احمد) تو وہ بھی ایک ہی ہے یعنی آنحضرتؐ کا نظیر بھی موجود نہیں، احد کا ظہور حرف دہن سے جو ”میم“ سے مل کر ہوا اور یہ احمد ہے (لولاک لما خلقت الا فلاک)۔

کشتہ آں چشم مخورم کہ حد سرمہ اش

تاسر کوئی تغافل می کشد دنبالہ را

میں تو اس مست آنکھ کا متوالا ہوں کہ اس میں سرمہ کا دنبالہ اتنا

کھپا ہوا ہے کہ کوئے تغافل کی حد سے مل گیا ہے

با نرگست چہ عرض تمنا دہد کسے دیدیم سرمہ کہ نگاہ شد صدائے ما

محاورہ میں ”سرمہ کھلانا“ سے مراد کسی کو چپکا کرنا ہے کہتے ہیں کہ سرمہ کا

اثر یہ ہے کہ اگر کوئی کھلے تو گلا بیٹھ جاتا ہے اور آواز نہیں نکلتی۔ سرمہ کا

تعلق آنکھ سے ہے۔ نرگس استعارہ میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ مطلب شعریہ ہے کہ

نیری آنکھوں کے سامنے اپنی خواہشات کا اظہار کوئی کیا کرے ہم نے ان

آنکھوں میں سرمہ دیکھا تو کچھ بول نہ سکے ہماری صدا نگاہ بن گئی، یعنی بول نہ

سکے دیکھتے رہے، اور سمجھ گئے کہ شرمہ کا ایما یہ ہے کہ دیکھو اور چپکے رہو، اللہ تعالیٰ بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ بھی جو گڑ چکا اور گزرنے والا ہے اس کے حضور عرض تمنا کی حاجت ہی کیا ہے، جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔

عدم گفتن کفایت می کند تا آدم و حوا

دگریاے ہرزہ درس و ہم طومار نسب مکشا
آدم و حوا کی اولاد تمام عالم انسانی ہے اور آدم و حوا کا نسب عدم سے شروع ہوتا ہے (لسم یکن شی من کورا)
ایں آدم و حوا شرف نسبت ہستیت

بیدل نتوان پیش عدم نام نسب برد

خلقے، امدادے، مدارے، نیازے، خدمتے

اے زمینی غافل آدم شوبابین مقدار ما
انسانیت کا تقاضہ ہے کہ خلق سے پیش آئے، جو محتاج ہیں ان کی امداد کرو، دلجوئی کرو، انکسار سے کام لو، اور بزرگوں کی خدمت کرو۔

سرشکم، دود آہم، شعلہ ام، داغ دلم بیدل
چو شمع از حاصل ہستی سراپایم ہمیں دارد
شمع آنسو، دھواں، شعلہ، داغ سب کچھ ہے، میرا سراپا شمع کی طرح ہستی سے یہی کچھ حاصل کر رہا ہے۔

داغ زیر پا و آتش بر سر در دیدہ اشک

شمع را در انجمن بودن چہ جائے خرمیست

اس انجمن ہستی میں ہم شمع کی مانند ہیں آنکھ میں آنسو، سر پر آگ، پاؤں آبلہ پا، اس حال میں ہمیں خوشی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

دل وفا، بیل نوا، واعظ فسوں، عاشق جنوں

برکتے در خور و ہمت پیشہ پیدامی کند

بیدل

ہر کسے را بہر کارے ساختند، ہر ایک شخص اپنی فطری استعداد
کے مطابق اور قابلیت کے مناسب عمل کرتا ہے (کل شی یعمل علی
شاکلتہ)

رنگ حال پہنچ کس بر پہنچ کس روشن نشد
شمع گل کردند یا راں یا ز محفل بردہ اند
کسی پر کسی کا حال روشن نہ ہوا کہ کس رنگ میں ہے معلوم ہوتا ہے
کہ اس محفل ہستی میں یا تو یاروں نے شمع ہی بجھا دی ہے یا محفل سے باہر
لے گئے ہیں۔ شمع ہوتی تو روشنی میں ہر ایک کا رنگ روپ بھی روشن
ہوتا۔

در سراغ عافیت بیہودہ می سوزی نفس
زیں بیاباں رفتگاں باخوش منزل بردہ اند
منزل تو عافیت ہے جب مسافر دوڑ دھوپ کے بعد منزل پر پہنچ
جاتا ہے تو آرام و آسائش سے بیٹھ جاتا ہے اس منزل عافیت کا سراغ
اس زندگی میں تو ملنے سے رہا۔

مدعا از ہستی مایس ہمیں آزار بود
ور نہ در کج عدم آسودگی بسیار بود
اس بیاباں ہستی میں تو بے فائدہ عافیت کی تلاش میں سعی کر رہا
ہے۔ جو بھی اس بیابان سے باہر نکلے وہ اس منزل کو اپنے ساتھ لے گئے
یعنی عافیت اور آسودگی قبر ہی میں نصیب ہوگی۔

کردم از ہر کہ دریں خانہ سراغ تحقیق

گفت از آمدنت پیش ہمیں جانش بود
اس خانہ ہستی میں جس کسی سے میں نے ”تحقیق“ کا پتہ پوچھا تو جواب
یہ ملا کہ تیرے آنے سے پہلے اسی جگہ تھی یعنی تیرے آنے سے پہلے تو یہاں تھی

تو آیا وہ گئی ”تحقیق“ کے معنی ہیں حق شناسی، بیدل کہتا ہے کہ میرے زمانہ میں رحلت فرما چکی تھی۔

از ترجم تا مروت و ز مدار تا داف
ہرچہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفتہ است

گاہ در چشم ترو گہ بر مژہ گاہ ہے بخاک
ہمچو اشک نا اُمیدی خانہ بردوشیم ما
انسان عالم یاس میں روتا ہے، میں بھی آنسو کی طرح کبھی دیدہ تر میں،
کبھی مڑگاں پر، کبھی خاک پر آ رہتا ہوں، اسی طرح خانہ بدوشی میں عمر
گزر گئی، آخر خاک میں مل گئے۔

بخاموشی تو اں شدایمن از اندامی کج بحثاں
نفس وز دیدنست اینجا فسوں نیش عقربہا
کہتے ہیں کہ اگر بچھو کاٹے تو دم بند کر لینا چاہئے، زہر اثر نہیں کرتا،
جس طرح ”بچھو“ ”کر دم“ ہے اسی طرح کج بحث بھی بچھو ہی ہوتے ہیں ان کے
ڈنگ سے بچنے کا علاج یہی ہے کہ خاموشی اختیار کرو۔
ہر کہ آمد مشیت خاک کے بر سر اور رنجند

تاکے آخر گردایں ماتم سرا خواہد شکست
جو بھی اس خاکدان میں آیا اس کے سر پر آخر مٹھی بھر مٹی ڈالی، نہ معلوم
اس ماتم سرا کا عمارت کب بیٹھے گا آدمی مڑتا ہے تو اس کو ٹیپیر خاک کرتے ہیں اور
ایک مٹھی بھر مٹی ہر ایک شخص کا رِ ثواب سمجھ کر ڈالتا جاتا ہے یہاں تک
کہ قبرین جاتی ہے خدا معلوم یہ دنیا ماتم سرا کب تک قائم رہے گی۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی منظر
کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گردشے خورت سرت

بیدل

ہر ایک شخص کے سر میں اقتدار اور علو کی ہوا سمائی ہوئی ہے اس میں کچھ قباحت نہیں کیونکہ ارتقاء پسندیدہ امر ہے مگر ایسی بلندی تک جانا کہ سر چکرائے مذموم ہے، عموماً پست فطرت سفلے جب کسی بلند مرتبہ پر پہنچتے ہیں تو ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہتا وہ لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور جتنی بلندی پر آپ جائیں اتنی ہی چھوٹی پستی پر ہر ایک شے نظر آئے گی۔

بگذر ز غناتانشوی دشمن احباب اوّل سبقی حاصل زر ترک سلام است

بیدل اکثر اشعار میں اضداد جمع کرتا ہے اور ان سے ایک بات پیدا کرتا ہے اس شعر میں احباب یعنی دوست اور دشمن اور حاصل اور ترک اضداد ہیں۔ عام دیکھنے میں آتا ہے کہ اہل زر اپنے دوستوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔

بیدل اکثر سنگلاخ زمین میں بھی اسی طرح بے تکلف چلتا ہے جس

طرح بحر طویل میں پتلاوری کرتا ہے۔

شوکت ملک و ملک تا اوج اقبال فلک

جملہ پامال است ہر گہ میفشانی پشت دست

از کفم بیدل نمیدانم چہ گل دامن کشید

کو ندامت کروم آخر ارغوانی پشت دست

پہلے شعر میں پشت دست جھاڑنا یعنی دست بردار ہو جانا اور

دوسرے شعر میں ندامت سے ہاتھ کاٹنا اسی طرح اس غزل میں اس نے ”پشت دست“ خوش اسلوبی سے نبھا لیا ہے۔ اسی طرح ”تیغ است ردیف ہے۔

غنیہ نیست کہ زخمی ز تبسم نخورد

با خبر باش کہ انداز شگفتن تیغ است

مصرع تازہ کہ از بحر خیالم موجبیت

دوست را آب حیات است دشمن تیغ است

مثل ما وقتا موج و جبابست ایں جا
 سرزقن نیست کسے را کہ بگردن تیغ است
 جباب کو سر سے اور موج کو تیغ سے کیا اچھی تشبیہ ہے۔ اور امر واقعہ بھی
 یہی ہے کہ امواج میں جباب اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کٹے ہوئے سر۔
 غالب مرحوم کا ایک شعر ہے کہ

تیغ تو ناز و بسرِ فشانِ عاشق موج ہی بالدا ز جباب شکستن
 یہ کہتا ہے محل نہ ہو گا کہ لفظ ”جباب“ کو بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا
 ہے۔ مثلاً ”موج ہی بالدا ز جباب شکستن“ کے تحت ہم چند اشعار پیش کر چکے ہیں۔ غالب
 مرحوم کی کلیات فارسی شروع سے آخر تک اس غرض سے دیکھ ڈالی، کہ
 مرحوم نے یہی لفظ کس مضمون میں باندھا ہے۔ تین شعر ملے ایک تو اوپر
 درج کیا گیا دو اور ہیں۔

وقت است کز روانی مے ساقیانِ بزم
 پیمانہ را جباب لب آب جو کنند
 تیسرا شعر بیدل کے اس شعر کے بعد پڑھے۔
 بہ بحر عشق ہر موج از جبابے سرخوش است اما
 سرے کو تا بعرض گردش آرد سا غر تیغش
 تیغش کی زمین کتنی سنگلاخ ہے۔

جباب از فرق عشاق است و موج از تیغِ خوبانش
 شہادت گاہ اربابِ وفادریا ست پنداری
 (غالب)

مثل ما وقتا موج و جبابست ایں جا
 سرزقن نیست کسے را کہ بدامن تیغ است
 (بیدل)

مقام بیدل

ممکن ہے کہ تلاش سے ایک دو شعر اور بھی مل جائیں مگر مجھے "تلاش سے یہی تین شعر ملے۔ بیدل کہتا ہے کہ

گر آرزو شکندی شود عمارت دل

شکست موج بود باعث بنائے جناب

غالب کہتا ہے کہ (موج بھی بالدار جناب شکست) بیدل نے دل کو جناب سے تشبیہ دی ہے اور موج میں اضطراب "ہوا" کا پیدا کردہ ہے اگر یہ ٹوٹے تو جناب کی صورت پیدا ہوتی ہے ہوا و ہوس محو ہوتو "عمارت دل" ہے۔

بیدل نے "جناب" کو جن اشعار میں باندھا ہے علاوہ مثنوی طور معرفت ان کی تعداد بہت ہے اور انہی سے ایک دیوان مرتب ہو سکتا ہے میں نے ایک صد اشعار جمع کئے تھے۔ اس مقام پر انھیں درج کرنا موجب طوالت ہے ایک غزل کی ردیف ہے "زیر پوست" دو شعر ملاحظہ ہوں۔

از لب خاموش نتوانم حریف عشق شد

چند دار دایں جناب پوچ عیاں زیر پوست

چوں جناب از پیکر حیرت سرشت مامیر

نقش مایے پردہ پنہاں ست عریاں زیر پوست

اس مضمون کا ایک شعر ہے کہ

کہ دار دے سرو سامانی وضع جناب من

برنگے گشتہ ام عریاں کہ گوئی پیرہن دارم

باس اور عریانی کا تخیل ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

نشہ جناب خیال غبار جسمانی جناب راتہ پیراہنست عریانی

جس طرح جناب پیراہن کے نیچے بھی عریاں نظر آ رہا ہے اسی طرح

ہمارا خیال یا دل ہے کہ غبار جسم خاکی کے پردہ میں بھی عریاں ہے جناب

اور عریانی اضمحلال ہیں گرد و غبار ہر ایک شے کی صورت پوشیدہ کرتا ہے
جسم خاکی بھی یہی گرد و غبار ہے اصل شے دل ہے۔

نہی گنجہ بعالم بسکہ از خود گشتہ ام فانی

جہاںم را لباس بحر تنگ آمد بعریانی

مکان وزماں کی قید میں ہر ایک شے معین اور محدود ہے، اگر یہ حدود

توڑ دے جائیں تو ہر ایک شے آزاد غیر محدود ہے، عالم تو انہی حدود اور

حجاب سے بنا ہے جس میں ہم بھی مقید ہیں اگر ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے

تو آزادی ہے۔ اسی تخیل کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔

زہ پیراہن بروں آئے شکوہ ہے نیست عریانی

جنوں کُن تا جہاںے را لباس بحر پوشانی

”جنوں“ میں کپڑے پھاڑتے ہیں، لباس زینت اور شکوہ کی شے

ہے اور عریانی اس کی ضد ہے مگر بیدل کہتا ہے کہ عریانی بے شکوہ نہیں لباس

نعیمات کو پھاڑ کر اپنی حقیقت کو عریاں کر دے اگر حجاب اپنے لباس تعین کو

پھاڑ دے تو ظاہر ہے کہ بحر کا لباس پہن لے گا یعنی خود بحر ہو جائے گا (علیٰ

کل شئی محیط)

زہ پیراہن بروں آ، تا یہ بینی دستگاہ خود

حباب آئینہ دریا ست از تشریف عریانی

دریں دریا کہ عریانی ست یکسر سازا مواجش

حباب ما بہ پیراہن رسید از چشم پوشیدن

حباب از پیرہن آئینہ داری می کند روشن

پوششش ساختہ تا ایں قدر دیدند عریانم

بیدل

جب ہم آئینہ کو عریاں دیکھنے کے لئے اسے دیکھیں تو ہماری صورت خود بخود اس میں منعکس ہوگی جو اس کی پوشش بن جائے گی۔ اور پوشش محدود شے پر ہوگی، یہی کیفیت رونما ہوتی ہے جب ہم اپنے آئینہ قلب میں نظر کرتے ہیں ہم غیر محدود ہونے والے بھی محدود دکھائی دیتے ہیں۔

ویدہ داری چہ می پرسی ز جیب و دامنم
چوں جناب از شرم عریانی عرق پیرا ہنم
”عرق پیرا ہن“ کیسی لطیف ترکیب ہے شرم کے بارے پانی پانی
”ہونا محاورا“ ہے جیب و دامن سے مراد سرمایہ داری ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا
ہے کہ سرمایہ ہستی میرے جیب و دامن میں کتنا ہے، تو دیکھ رہا ہے کہ شرم
”نیستی“ کی وجہ سے عرق پیرا ہن ہوں۔

ایک اور مشکل زمیں کی ردیف ”زنجیر پاست“ ہے۔

چوں جنابم انصت و ہم بقا زنجیر پاست

خانہ بردوش طبیعت را ہوا زنجیر پاست

آدمی گھربناتا ہے تو رہائش اور آسائش کے لئے جو باقی رہنے والی
ہو، ہوا میں قلعہ تعمیر کرنا امید ہو ہو م سے تعبیر ہوتا ہے جناب نے بھی ایک
خانہ کی صورت اسی ساز و سامان ہوا سے بنا رکھی ہے بام خانہ کے اوپر ہوا
ہی ہوتی ہے ”وہم“ کی بھی کچھ حقیقت نہیں ہوتی مطلب شعریہ ہے کہ ہم
بقا کے طالب ہیں اور انہی تقیدات و تعینات میں ہم بقا چاہتے ہیں یہ
خام خیال ہے لیکن وہم کا کرشمہ ہے کہ اسی کو پختہ کئے ہوئے ہیں کہ دنیا
میں نہیں تو عاقبت میں ضرور فرداً فرداً اسی تعین کے ساتھ دائمی زندگی
ملے گی یہ ہوا ہوس ہے، یہ وہم ہے، جناب نے تو آخر ٹوٹا اور پھوٹنا ہے،
اگر بقا کی طلب ہے تو محیط میں محویت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن
اس میں تیری انفرادی خودی محو ہو جائے گی۔

مقام بیدل

غریق بحر ز فکر جناب مستغنی است

رسیدہ ایم بجائے کہ بیدل آنجا نیست
ہستی و عدم میں جو ربط ہے وہ اسی فردیت میں مفہوم ہو سکتا ہے
اس لئے بیدل کا مشورہ ہے کہ ”زیں دو مصرع دور گذرانند کے پیوستہ
باش“

از ہوا برپا بست بیدل خانہ وہم جناب
در لباس ہستی ماجز نفس یک تاز نیست
زندگی میں سکون نہیں اس ذیوی زندگی میں جو ہم ایک دم ٹھہرے
ہوئے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ

یک نفس ساکن دامن جنابیم امروز
ورنہ چوں آب رواں است ہماں پیشہ ما
ز بسکہ می برم افسوس ازین محیط ندامت

جناب آبلہ دارد چو موج سودن دستم
کف افسوس ملت ملت ہاتھوں میں چھالے اس طرح پڑ گئے جس
طرح موجوں میں جناب، یہ پھپھو لے تو ہاتھ کے ہیں پاؤں کے چھالے
ملاحظہ ہوں۔

رہرو از رنج سفر چارہ ندارد بیدل موج دایم ز جناب آبلہ پا دارد
اس شعر میں جناب و موج کو مسافر اور جادہ سے تشبیہ دی ہے
منزل دل ہے۔

در طلب گاہ دل چو موج و جناب منزل و جادہ، ہر دو در سفر است
اس شعر میں جناب کو ”جرس“ کا رواں سے تشبیہ دی ہے اور قافلہ
کو موج سے۔ بے جنبش دل راہ بجائی نتوان برد
یکسر جرس قافلہ موج جناب است

بیدل

بیدل کے بعض اشعار میں ”مبالغہ“ ہے اور یہ ایک صنعت ہے مگر وہ مبالغہ میں بھی ”واقعیت“ ہی بیان کرتا ہے۔

بدل شکستہ ازیں چمن زدہ ایم بال گذشتنی

کہ شباب اگر ہمہ خوں شود نرسد بگرد رنگ ما

”شباب“ اور ”درنگ“ اخداد ہیں، جو شخص دل شکستہ ہو

اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ میں ٹوٹے ہوئے

دل کے ساتھ اس باغ دنیا سے گزر گیا۔ اور قیاس ہو سکتا ہے کہ میں کتنا

آہستہ آہستہ رُک رُک کر گذرا اس لئے بہت دیر سے گذرا مگر امر واقعہ یہ

ہے کہ ”درنگ“ اتنا تیز رفتار تھا کہ خود ”شباب“ اگر سرتاپا سعی ہو تو اس کی

گرد تک نہیں پہنچ سکتا عموماً دنیا سے جانے وقت دل شکستہ ہی ہوتے

ہیں اور کون مرنا چاہتا ہے مگر دنیوی زندگی کیلئے ایک عرصہ ہے جس کا

فاصلہ مڑگاں سے مڑگاں تک ہے آنکھیں کھلی ہیں تو زندہ ہے بند ہوئیں

تو مُردہ۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

سایہ ام را یتواں چوں زلف خویاں شانہ کرد

بسکہ طبع من بصد فکر پریشاں آشناست

نیستم آگہ چہ گل می چنیم از باغ جنوں

ایں قدر دانم کہ دستم با گریباں آشناست

بیدل ایں محفل نہاں در گریہ شمع است و بس

دارغ آں زخم کہ بالب ما ئی خداں آشناست

بیدل کی نازک خیالی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا

چاہتا ہے ایک کیفیت ہے جو ذہن میں اس کے اشعار کے الفاظ

پیدا کرتے ہیں، محبوب کی زلفیں بھی پریشان ہیں اور ان کو سنوارنے اور

ہموار کرنے کے لئے شانہ کی ضرورت ہے، اسی طرح میری طبع میں سینکڑوں

پریشان خیالات ہیں جو میرے وجود کا ایسے ہی جزو ہیں جیسا میرا سایہ، مگر سایہ میرے جسم سے جدا ہے اور یہ پریشانی ہے۔ خیالات کا اظہار حروف میں ہوتا ہے اور خیالات اور حروف میں ایسی ہی مماثلت ہے جیسی جسم اور سایہ میں اس لئے میرے سایہ کو بھی اسی طرح شانہ کی ضرورت ہے جیسے محبوب کی زلف پریشان کو۔

”گل چینی“ کے معنی فائدہ اٹھانا، گل کا گریبان بھی تار تار ہوتا ہے، اس کی پنکھڑیاں جدا جدا ہوتی ہیں اور جنون میں بھی کپڑے پھاڑتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغ جنوں کی سیر سے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں کیا حاصل کر رہا ہوں یہ ”تجامل عارفانہ“ ہے، اتنا جانتا ہوں کہ میں دست و گریباں ہوں یعنی یہی گل چینی کر رہا ہوں۔

مقطع میں نازک خیالی اور بلندی فکر و دنوں جمع ہیں ظاہر ہے کہ محفل کو روشن شمع کر رہی ہے۔ لفظ ”نہاں“ یعنی پوشیدہ روشنی کی ضد ہے۔ اضداد جمع کرنا بھی صنعت شعر ہے، شمع نہ روئے تو روشن بھی نہیں ہوتی، اس لئے محفل کی رونق کا راز شمع کے ایک گریہ میں مضمر ہے، مجھے تو اس زخم کے لبوں پر رشک آتا ہے جو خندہ سے واقف ہے۔ زخم کا ٹنڈ کھلا ہو تو وہ خندہ مماثلت ہے کہ ہنسی کے وقت لب کھل جاتے ہیں لفظوں میں زخم کا کھلنا بیان نہیں کیا لفظ ”خندہ“ سے یہ بات پیدا کی ہے، خندہ اور گریہ اضداد ہیں، لیکن خندہ تو بوجہ مسرت ہوتا ہے اور گریہ بوجہ غم، زخم کا خندہ مسرت کی وجہ سے کیسے ہو سکتا ہے مگر شعر میں یہی بات پیدا کی گئی ہے کہ دنیا تو غم و الم کی ماری شکوہ و شکایت و گریہ و زاری کرتی ہے اور جو اسباب گریہ و زاری کے موجب ہیں وہی عشاق کی فرحت و انبساط کا باعث ہیں کہ زخم خوردہ ہیں اور ہنستے ہیں، یہاں تک تو شعر کا مفہوم لفظی ہے، لیکن بیدل اس سے ایک کیفیت پیدا کرتا ہے، کہ شمع میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں، گریہ و زاری بھی

بیدل

ہے، وہ اہل بزم کے حال پر ہے اور اسی غم میں گھل رہی ہے۔ آگ میں جل رہی ہے اور داغدار بھی ہے، محفل کو روشن کر رہی ہے اس کا معاوضہ اسے داغ ہی ملتا ہے، لیکن وہ گلریز بھی ہے اور گل زخم خوردہ لب خنداں ہے۔ یہ مثال ان مصلحان بالخصوص انبیاء و رسل پر صادق آتی ہے جو ہر ایک ممکن مصیبت میں لوگوں کے پھلے کے لئے مبتلا ہوتے ہیں اور بخوشی خاطر برداشت کرتے ہیں، چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے کہ

مرگ صاحب دل جہانے را دلیل کلفت است

شمع چوں خاموش گردد داغ محفل می شود

صاحب دل ہی بزم ہستی کی رونق کا سبب ہیں جب یہ شمع خاموش ہو جاتی ہے تو محفل بھی تاریک ہے۔

نہست نقش پا بگلزار خرامت جلوہ گر

دفتر برگ گل از دست بہار افتادہ است

”نقش پا“ افتادہ ہوتا ہے، تیرے خرام میں چمن کی رنگینی ہے۔ تیرا نقش پا

کیا ہے ادراک گل کا ایک دفتر ہے جو بہار کے ہاتھ سے گر کر بکھر رہا ہے، یہ تو ہے لفظی مفہوم، ہم بیدل کے نظریہ ہستی پر بحث کر چکے ہیں کہ کثرت جو ہم کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں وحدت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہے، اور صورتیں نقوش ہیں۔ مگر یہ صورتیں کتنی حسین ہیں کتنی دلکش ہیں، یہ حسن یہ رنگینی جو ان میں مشاہدہ ہوتی ہے وہ عکس اسی حسن ازلی کا ہے جو بیرنگ ہے، ”نقش پا“ خاک پر نمایاں ہوتا ہے، اور یہ انسان خاکی ہے، یہ نقش اور اس کی چہن بندی انسان ہی ہے۔

دوستان ظلمے بحال نامرادم رفتہ است

داشتم چیزے و من بودم ”زیادہ رفتہ است“

کتنا تازک خیال ہے، کتنا لطیف شعر ہے، کتنا دقیق مضمون ہے، یارو میری حالت قابلِ رحم ہے کتنا ظلم مجھ نامراد پر ہوا ہے (ربنا ظلمنا انفسنا) میرے پاس ایک چیز تھی اب بھول گیا کہ وہ کیا تھی، کتنا تجاہل عارفانہ ہے جب یہ گراں قدر شے میرے پاس تھی میں ”باخود“ تھا، ”من بودم“ اب ایسا بخود ہوا ہوں کہ خودی کھو بیٹھا، یہ ”من“ یا ”انا“ ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

شکر اللہ خاں کے ہاں محفل شعر و ادب گرم تھی، ہم عصر شعرا میں ناصر علی بھی موجود تھا، بیدل نے ایک غزل پڑھی۔ مطلع ہے:

نشد آئینہ کیفیت ماطا ہر آرائی

نہاں ماندم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی
ناصر علی نے اعتراض کیا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ ظاہر ہے تو معنی بھی ظاہر ہیں۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں معنی کو آپ لفظ کے تابع سمجھ رہے ہیں۔ ”اں نیز لفظے بیش نیست، امار نجہ من چیست ہی معنی است بیچ لفظے در نمی آید، مثلاً صفت انسان کہ بایں ہمہ شرح و تفصیل کہ در کتب مندرج است بیچ لکشوف نگردیدہ“ ناصر علی چپکا ہو رہا، مطلب یہ ہے کہ ”من“ جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔

بیدل کے اشعار میں جو تخیلات کار فرما ہیں ان سے بہت خیالات اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اسی شعر سے یہ تخیل بھی اخذ کیا جاسکتا ہے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نیماں ہو گئیں

اسی غزل کے چند اشعار اور بھی ملاحظہ ہوں، ہر ایک فرد ہے۔

قفل و سواس است چشم من دریں عبرت سرا

ہچو مرثکاں عمر و رست و کشاد مرفقہ است

بیدل

بے نفس در ملک عبرت زندگانی می کنم
خاک برجا مانده است امروز بادم رفته است

بیر گل نذر جنون بے دماغی کرده ام
پیش پیش رنگ و بو با اعتماد رفته است

بر خیال خلد بیدل ز اہداں رانا زہنت

ایک ازیں غافل کریں ویرانہ آدم رفته است

قفل اور چشم میں تشبیہ اور مرثاں کے ساتھ بست و کشاد، گویا یہ کلید
ہے جو قفل چشم کو کبھی کھولتی اور کبھی بند کرتی ہے اسی بست و کشاد میں
اسی توڑ جوڑ میں دسوسوں میں عمر بسر ہو رہی ہے، جب دم ہوا ہو جائے تو
مٹی میں ہماری مٹی ہی باقی رہتی ہے اور جو بے نفس آدمی ہیں ان میں بھی
ہوا و ہوس نہیں ہوتی، کیا بیدماغی ہے کہ رنگ و بو کی طرح اعتماد بھی
اُٹھ گیا، جہاں آدمی نہ ہو ویرانہ ہے، جنت بھی غانہ بے آدمی ہے، زاہد و
کو آدمیت سے کچھ نسبت نہیں، ورنہ طالب جنت کیوں ہوتے۔
ایک غزل کا مطلع ہے۔

دی ترنگے از شکست سا غم گل کرد و ریخت

شش جہت کیفیت چشم ترم گل کرد و ریخت

اس غزل کی ردیف ”گل کرد و ریخت“ ہے اور قافیہ سا غم،

ترم ہے، اس غزل کا ایک شعر ہے کہ

شب چو شمع وعدہ دیدار در آتش نشاند

تا سحر آئینہ از خاک ترم گل کرد و ریخت

رات بھر وعدہ دیدار کی اُمید پر شمع کی طرح انگاروں پر لوٹتے رہے،

دیدار اور آئینہ میں مناسبت ہے، رات تو اس طرح گزری صبح ہوئی تو

شمع بھی جل کر خاکستر ہو چکی تھی، فقط گل نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے،

شمع صبح دم گل ہو جاتی ہے یعنی بجھ جاتی ہے، اور شمع صبح تک گلریزی کرتی رہی، میں شمع کے گل جھاڑتا رہا کہ روشن رہے۔

کوہکن در تلخ کامی جوئے شیر ایجاد کرد

برزبان تیشہ گوئی نام شیریں رفتہ است

شیریں و فرہاد کا قصہ مشہور ہے۔ فرہاد کی عمر تلخ کامی ہی میں گزری

مگر زبان تیشہ پر شیریں کا نام تھا کہ جوئے شیر بہادی ”جوئے شیر آوڑن“ محاورہ ہے یعنی ناممکن کام کے لئے سعی بے حاصل ہے، اگرچہ فرہاد کی کوشش بھی بے فائدہ ہی تھی مگر اس میں بھی ایک ذائقہ تھا وجہ یہ ہے کہ شیریں کا نام درمیان تھا۔

ذوق و قای وعدہ ات از دل نیرو د

قاصد ثمر نبود کہ گویم رسید و رفت

اس شعر میں لفظ ”رسید“ میں لطف پیدا کیا گیا ہے۔ ثمر کے ساتھ معنی پختگی ہے، پھل جب پکتا ہے تو گر جاتا ہے ”رسید و رفت“ ”قاصد“ کے ساتھ ”رسید و رفت“ یہ کہ آیا اور گیا مطلب شعر یہ ہے کہ قاصد نے جو وعدہ دیدار سنایا تو اس امید پر کہ ضرور وفا ہوگا کچھ ایسی لذتِ دل محسوس کر رہا ہے کہ یہ احساس دل سے نہیں جاتا اور نہیں جائے گا، یہ قاصد جو اس خاص مقصد کا حامل ہے پھل کی طرح نہیں کہ ”رسید و رفت“ یعنی یہ مقصد بالذات مستقل ہے، عارضی نہیں، بات بھی یہی ہے کہ اس وعدہ دیدار پر خواہ حشر میں ہوں زندگی ہے۔

گفتم رموز مطلب ہستی بیان کنم

تا برزباں رسید سخن لب گزید و رفت

میں نے چاہا کہ اسرارِ ہستی کے مطالب بیان کروں، ابھی یہ بات

یعنی میرا کہنا کہ ”رموزِ ہستی بیان کرتا ہوں“ یوں تک آئی تھی کہ کٹ

بیدل

گئی، اتنا کہنا ہی ادھورا رہ گیا، اصل سخن رموز ہستی تو دل کے دل ہی میں رہے، یعنی یہ کہنے سننے سے باہر ہیں۔

گر ہر حرف حق است آندم کہ گفتی باطل است
ہر چہ بیروں آداز لب خارج آہنگ دل است
عمر بست سُرِ غِ دلِ گم گشتہ ندارم

یار بیکجا ایں ورق از دفترِ من ریخت
ایک عمر گزر گئی اور مجھے دلِ گم گشتہ کا سُرِ غِ نہ ملا۔ خدا معلوم میرے دفترِ ہستی سے یہ ورق کہاں گرا۔

چگونہ عمر اقامت کند براہِ نفس

گرہ نمی خورد این رشته بسکہ کوتاہ است
نفس کو رشتہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس رشتہ سے زندگی وابستہ ہے۔ لیکن یہ رشتہ اتنا کوتاہ ہے کہ اس میں گرہ نہیں دی جاسکتی ”گرہ کو اقامت سے تعبیر کیا ہے، ویسے ہی تارِ نفس کو تہا ہے۔

نہ لفظ و انہم و نئے معنی اس قدر دائم

کہ گر سخن ز تو باشد جواب دشوار است

لفظ و معنی سے ہی متکلم کا مافی الضمیر واضح ہوتا ہے۔ لیکن چند دچہ
دچوں کا جواب نہیں اگر ”ذات“ باری کے متعلق ہو۔

نقشِ ہستی جزو غبارِ دقتِ نظارہ نیست

ذرہ را آئینہ گر ہست چشمِ روزن است

فضا میں ذرات نظر نہیں آتے مگر روزن میں سورج کی کرن پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی کیفیتِ نقشِ ہستی کی ہے کہ اس کا مشاہدہ مجزوی تنگ تر عدو ہی میں ممکن ہے مثلاً برق تمام فضا میں موجود ہے اس کا علم ہمیں نہ ہوتا اگر اس کو قمعہ کی تاروں میں نہ لاتے، ذرہ کو چشم

روزن ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ فہم ہستی کتنا دقیق ہے۔
 خموشی نالہ می گرد و میر سید کہ آں نا آشنا بیگانہ کیست
 یہ مت پوچھو کہ وہ نا آشنا کس کا آشنا نہیں ہے، یعنی سب کا آشنا
 ہے بادِ ہوا اس کے کہ آشنا ہے، کوئی اس سے واقف نہیں ہے، اگر
 پوچھو گے تو میں جو اس حقیقت سے واقف ہوں اور خموش ہوں بیانگ
 دہل کہوں گا کہ

معشوق من بہ شیوہ ہر کس برابر است
 باماء شراب خورد و بزابد، نماز کرد
 (حافظ)

شعورم رنگ گرداند از کہ پرسم
 ”از خود رفتن“ رہ کا شانہ کیست
 اس شعر میں بیدل نے اضداد سے ایک بات پیدا کی ہے، شعور اور
 لا شعور اضداد ہیں، شعور خودی کے ساتھ ہی ممکن ہے کسی راستہ کا علم شعور
 کے ساتھ ہی ہوتا ہے، لیکن جب راستہ کا نام ہی ”از خود رفتن“ یعنی
 بخود می یا بے شعوری ہو تو شعور کیا بتائے گا؟ میں نے اس راستہ کی
 نسبت شعور سے دریافت کیا تو اس کا رنگ فق ہو گیا، اس شعر میں
 بیدل نے خودی اور بخودی کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم کافی
 بحث بحوالہ بیدل کر چکے ہیں۔

گر بہ تحسین نکشاید لب یاراں بر جاست
 در نیستال قلم معنی ما شکر داشت
 مٹھاس سے لب چمٹ جاتے ہیں قلم کو بھی ”بے“ کہتے ہیں گستاکی
 پوری پوری قلم ہے اور اس سے شکر پیدا کی جاتی ہے قلم کا ہونے کی
 طرح خالی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل قلم حضرات اگر داد تحسین نہ دیں

بیدل

تو بجا ہے کیونکہ جن معانی کا اظہار میں کر رہا ہوں وہ تو شکر ہیں، اس کی
مٹھاس سے لب بند نہ ہوں تو کیا ہوں۔

ہر چہند کہ عنقا ز خیال تو بروں است

ہر رنگ کہ داری بہ نظر نقش پراوست

اگرچہ ذات باری تعلق تیرے خیال و قیاس و گمان و وہم سے
بالا تر ہے مگر جو بھی رنگ جو بھی صورت تو دیکھ رہا ہے اسی کے پر کا
نقش ہے۔

سواد نسخہ تحقیق بیدل دقت دارد

دو عالم جلوہ باید خواندن و بیرنگ فہمیدن

اسی ذات کے اسما و صفات کا پر تو دو عالم ہیں۔

بیدل غبار قافلہ اعتبار ما

بارے دگر نہ داشت ہمیں چشم بست و رفت

تمام کائنات عالم اعتبارات ہے کہ اس کی ہر ایک شے کسی نام سے
تعبیر ہوتی ہے، قافلہ جا رہا ہو تو غبار راہ سے اس کا سراغ ملتا ہے، کہ یہ گرد
قافلہ کی رفتار کی پیدا کی ہوئی ہے، قافلہ اسباب سے لدا ہوا ہوتا ہے،
بیدل علائق دنیوی سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا ہے کہ مجھ بے نوا کے پاس
آنکھوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہی اسباب باندھا اور چلتا ہوا، یعنی آنکھیں
بند ہوئیں تو دنیا سے گزر گئے، اس خاکداں کا غبار جسم خاکی یہیں رہ
گیا، ”چشم بست“ گویا یہی اسباب باندھا اور چل پڑے۔

وارث دیگر ندارد و دومان زندگی

ہر کہ حسرت بردازیں جا عبرتے با ما گذاشت

لوگ مرکز ”حسرت“ تو ساتھ لے جاتے ہیں، وراثت میں پیچھے

”عبرت“ چھوڑ جاتے ہیں وہ مجھے پہنچتی ہے، (فاعتبروا یا اولی الابصار)

عالمے بافتنہ می جوشد ز مرگ اغنیا،

خواب این ظالم سرشتاں بدتر از بیداری است
کوئی مالدار مر جائے تو ورثاء میں تنازع شروع ہو جاتا ہے، صاحب
تخت و تاج مرے تو قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے، ان کا مرنا ان کی
زندگی سے بدتر ہے، زندگی میں جس فتنہ و شر کا باعث رہے اس سے
بڑھ کر مرنے کے بعد ہوتے، زندگی میں فتنہ خوابیدہ مرنے کے بعد جاگ
اٹھتا ہے۔

بیدل نے فرمائشی غزل ”حنا“ کی تعریف میں کہی، چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

مشاطہ شوخی کہ بدست دل مابست
میخواست چمن طرح کند رنگ خوابست
آخر چمنے را بسر انگشت تو پیچید
وا کرد نقاب شفق و غنچہ نما بست
زین نور کہ از شمع سر انگشت تو گل کرد
تا شعلہ زند آتش یا قوت خوابست
آں رنگ کہ می داشت در یغ از ورق گل
از دور کف دست تو بوسید و بیا بست
آبست ز شبنم دل ہر برگ گل امروز
کایں رنگ چمن ساز و فاسخت بجا بست
تا چشم کشاید مرہ آغوش بہار است
رنگ سرناخن چقد ر عقدہ کشا بست
بیدل تو ہم از شوق چمن شو کہ بایں رنگ
شیرازہ دیوان تو امروز حنا بست

بیدل

نقاشِ ازل تا کر موکراں بست

تصویر میانِ تہاں موی میاں بست
از غیرت ناز است کہ آن حسن جہان تاب

وا کرد نقاب از رخ و بر چشم جہاں بست
آنچہ نتوان داد جز در دست محبوبانِ دل است

وا آنچہ نتوان ریخت جز در پائیِ خوابانِ پرست

وہ شے جو کسی کے ہاتھ میں سوائے محبوب نہیں دی جاسکتی دل ہے،
اور آبرو و خور و دُور کے پاؤں کے سوا کہیں اور نہیں گرائی جاسکتی۔

چقدر عالم بیدلِ خیال آئندہ ایم

ہر کہ بر ما نظرے کر و دل از ما برداشت

”دل از ما برداشت“ میں شعر کی لطافت ہے، جس کسی نے مجھ پر
نظر کی دل برداشتہ ہو گیا یا میرا دل لے گیا، اس لئے میں بیدل ہی
رہ گیا۔

ہر کجا گل کرد داغے بر دل دیوانہ سوخت

ایں چراغے بیکسی تا سوخت در ویرانہ سوخت

وضع دنیا، پیچ بر دیوانہ تاثیرے نکرد

بیشتر ایں برق عبرت خرمین فرزانہ سوخت

داغِ دل شد رہنمائی کوہِ دہاموں لالہ را

سر بھرا میزند ہر کس متاع خانہ سوخت

شب کہ شد زنا پر بغیض گردشِ جام آشنا

مقام بیدل

سبحہ جائی جڑ عہ مے برز میں رندانہ ریخت
 دستور زنداں ہے کہ شراب پینے سے پہلے تھوڑی سی زمین پر
 چھڑک دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ کہتا ہے کہ
 اگر شراب خوری جرعه فشاں بر خاک
 ازاں گناہ کہ نفع رسد بغیر چہ باک
 حضرت زاہد گردش جام سے فیض یاب ہوئے تو دستور کے موافق
 ایک دو گھونٹ زمین پر چھڑکتے مگر آپ نے سبحہ کو زمین پر پھینک دیا،
 یعنی زہد و ریاضت سے توبہ کی۔

ہر کہ آمد سیریا سے زیں گلستاں کر دورفت
 گر ہمہ گل بود خون خود بداماں کر دورفت
 محلے بر شعلہ، اشکے گوشہ، آہے راہبر۔
 شمع در شبگیر فرصت طرفہ ساماں کر دورفت

گوہر اشکے کہ پروردہم بچشم انتظار
 در تماشا می تو از دست نگہ غلطید و رفت
 چشم عبرت ہر کہ براوراق روز و شب کشود
 بچو بیدل معنی بے حاصلی فہمید و رفت

کس ز رفتے بعدم ہستی اگر جا میداشت
 خلقے از تنگی این خانہ بھرازدہ است
 خانہ ہستی کتنا تنگ ہے کہ لوگ صحرا کی طرف جا رہے ہیں،
 عدم ہی کشادہ مقام ہے۔

بیدل

ہر نگہ رنگ خرابات دگر میرزید
کس ندانست کہ اں چشم چہ صہباز دُاست

حق رفاقت یاراں بجا نیا و رد
بیا یک آبلہ دل بود عذر خواہ شکست

حق رفاقت تو تب ادا ہوتا کہ یاروں کا ساتھ دیا جاتا وہ تو تنہا چلے
گئے، پاؤں میں چھالے مانع رفتار ہیں، میرے بھی پاؤں میں ایک آبلہ
تھا جسے دل کہتے ہیں پھوٹ کر ٹوٹ گیا، اتنا ہی عذر میں پیش کر سکا کہ
چلنے سے معذور ہوں۔ دوستوں کی جُدائی پر دل کا شکستہ ہونا اور
دل کو آبلہ سے تشبیہ، مضمون آفرینی اسے کہتے ہیں۔

ہلاک شد جم و خمیازہ بائی جام بجاست

بمرگ نیز ندارد خار جاہ شکست

جم تو مر گیا مگر اس کا جام ابھی تک نشہ کی ٹوٹ کی وجہ سے انگڑائی
لے رہا ہے، اہل جاہ خواہ مر جائیں خار جاہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

گا ہے بکعبہ میروم و گہ بسوئے دیر

دیوانہ ام زہر طرم سنگ میزنند

دیوانہ کے سر کی تواضع سنگ و خشت ہی سے ہوتی ہے، کعبہ و
دیر بھی سنگ و خشت کی عمارت ہیں سنگ آستانہ پر ماتھا رکھو۔
رہے آباد سنگ و خشت سے بتخانہ و کعبہ

علاج شورش سراس سے بہتر ہو نہیں سکتا

آئینہ حضور دل تحفہ دیر و کعبہ نیست

آنچہ نثار نازتست در ہمہ جا کہ میبرد،

رنگ ہاگم کردہ ام در خامہ نقاش عجز
خارپائی گرکشی تصویر من پیدا شود
بو بہ دیگر ہم نمی خواہد گداز و ہسم وطن
مے بسا غرریز تا اکیر من پیدا شود

خواہد آخربے نفس گشتن بعریانی کشید
مدتے شد رشتہ از پیراہن مامی کشند
تار نفس سے ہی رشتہ زندگی وابستہ ہے، میرے لباس وجود سے
یہ تار ایک ایک کر کے نکال رہے ہیں آخر مجھے ننگا کر کے ہی چھوڑینگے،
جب یہ رشتہ ہی نہ رہا تو زندگی بھی ختم ہوگئی۔
آں طرف احتیاج انجمن کبریاست
چوں ز طلب در گذشت بندہ خدا می شود
بندگی اور احتیاج لازم و ملزوم ہیں، خدا بندہ نہیں ہے کہ غنی عن العالمین
ہے اور احتیاج سے پاک ہے، اگر بندہ بھی محتاج نہ ہو تو یہ بھی خدا ہو جائے،
مگر یہ ممکن نہیں۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین
ز میں فلک شود و آدمی خدا نشود
البتہ اخلاق الہی حاصل ہو سکتے ہیں۔
اگر تسخیر و لہا در خیالات گزرد بیدل
باحساں جہد کن کا بنجا خدائی بندہ می گردد
اگر دماغم دریں خمستان خمار شرم عدم نگیرد
ز چشمک ذرہ جام گیرم باں شکوہ کہ جسم نگیرد
اس شراب خانہ ہستی میں اگر ہمارے ذہن میں عدم کا خیال نہ ہو تو

بیدل

ہر ایک ذرہ کی چشمک سے وہ جامِ نون اور اس شان کے ساتھ کہ جم کو
بھی یہ بات نصیب نہ تھی، جم تو مر گیا اور عدم میں ہے، کتنا نازک خیال ہے
اور لفظوں کی بندش میں کیا لطف پیدا کیا ہے، نشہ ہستی ہرن ہو جاتا
ہے جب عدم کا خیال ذہن میں ہو۔

زحرص متعماں سعی گداہم کم مداں بیدل
کہ خاک از بہر خوردن بیش از آتش اشتہا دارد
صرف آگ ہی ہر ایک شے کو نہیں اس سے بڑ کر مٹی کھا رہی ہے،
اس لئے دولت مند تو حریص ہیں مگر گدا بھی کم نہیں، ایک لوگ اور دوسرا
خاک دونوں "خوردن" میں لگے ہوئے ہیں۔

برگل کہ دیدم آبلہ خوں چکیہ بود
یارب چہ خار در دل گلشن شکستہ اند
ہر ایک پھول ایک آبلہ ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے، خدا ہی
جانتا ہے کہ گلشن کے دل میں کیا کائنات تھا کہ ٹوٹ کر رہ گیا۔
صد برق در کمین نفس موج می زند
مردم نظر بشعلہ ایمین شکستہ اند
لوگ تو شعلہ طور کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں
حالانکہ ہر ایک دم میں سو بجلیاں کوند رہی ہیں، یعنی تیرے ہی سینہ
میں جلوہ سینا ہے۔

ہستی برائے پیچ کس آسودگی خواست
گر دوست این کند بتو دشمن چہ می کند
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو (غالب)

ہستی سے ہمیں محبت ہے مگر یہ محبت تو دشمنی مول لیتی ہے کیونکہ کوئی زندگی میں آسودہ نہیں، البتہ ”کنج عدم میں آسودگی بسیار بود“ اور عدم ہستی کا دشمن ہے۔

جہانے می کند جاں یک جز عبرت کہ می داند
کہ سقف خانہ فرہاد آخر بیستوں گردد
لفظ ”بیسٹون“ اصل ”بھستون“ ہے، عام بول چال میں ”بے ستون“ رہ گیا، اگر گھر کی چھت ستون پر نہ کھڑی ہو تو قائم نہیں رہ سکتی، ایک دنیا کوشش میں جان توڑ رہی ہے مگر دیدہٴ عبرت ہی دیکھ رہا ہے کہ فرہاد کی طرح کوہ بیستوں سے ندی لانا جوئے شیر لانا ہے۔ فرہاد کے گھر کی چھت آخر بیستون ہی تو ہے۔

جان پاکم فاسغ از تیمار ہسم کردہ اند
عیسیٰ بر چرخ بردم خرنمید انم چہ شد

دریں زمانہ تقدس کجا تنزہ کو
مسح رفتہ و نقش سم خرافتا داست

مرا بابلہ پا چہ مشکل افتاد است
کہ تا قدم زدہ ام پائی بردل افتاد است

بقدر سعی در ادا است را و مقصدا
و گرنہ در قدم عجز منزل افتاد است
تو در کنارے و ما بے خبر، علاجے نیست

بیدل

فروغ شمع تو بیروں محفل افتاد است
 اُمید گوہری دیگر ازیں محیط کراست
 ہمیں بس است کہ گرے بسا اہل افتاد است
 نہ نقش پا است کہ در وادی طلب پیدا است

ز کارواں جرس چند بیدل افتادہ است
 یہ تمام غزل مرصع ہے، مقطع کتنا لطیف ہے کہ وادی طلب میں نقش پا
 نہیں، ”کارواں جرس“ سے چند بینو اگرے پڑے ہیں یعنی کوئی بھی منزل
 تک نہ پہنچا، راستہ میں دم توڑ دیا۔ ”جرس“ کی آواز سے کارواں کا سرغ
 ملتا ہے اور نقش پا سے بھی رہرو کا پتہ چلتا ہے، جرس بے صدا ہو کر رہ گئی
 اور نقش پا بیدلوں کی داستان مایوسی سنار ہے ہیں۔

چسماں ز خلوت بروں خرامد نقاب نکشودہ نازینے ؛
 کہ شش جہت ہجوم موج گوہر ہجوم آغوش کرد تنگش
 نازک خیالی بیدل پر ختم ہے شعر کی لطافت میں دقیق نکات
 معرفت کا حل بھی ہے، یعنی ذات باری تعالیٰ تو ابھی تک الغیب
 ہے، ابھی وجہ ذوالجلال والا کرام زیر نقاب اسما و صفات ہے کہ شش
 جہت یعنی ابھی اسما و صفات نے اسے آغوش میں تنگ کیا ہوا ہے۔
 ”موج گوہر“ کیسی اچھی تشبیہ ہے گوہر بھی ہر طرف سے اسی امواج آب
 کے آغوش میں ہے۔

یار در آغوش و نام او نمیدانم کچیت

سادگی ختم است چوں آئینہ بر نیان ما

یہ شعر نہایت لطیف اور دقیق ہے، آئینہ سادہ لوح ہے اس کی
 آغوش میں حسین صورت ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کی تعریف کیا ہے؟

تعریف اسم اور صفت سے کی جاتی ہے، اور وہ ذات منزہ اسما و صفات ہے، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں، حقیقت بیزنگ ہے اور یہ حقیقت انسانی ہے لیکن ہم اس کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتے، بات یہ ہے کہ مجھے میرے نام ہی سے بُلاتے ہیں، میں اپنے آپ کو اس نام کے بغیر ہی جانتا ہوں، لیکن دوسرے نام ہی سے تیری جان پہچان ہوں گی۔ اسی طرح ذات کو اسما و صفات سے موسوم اور متصف معرفت کے لئے کر رکھا ہے، ذات اس سے بے نیاز ہے، ”باید بزباں خلق موسوم شدن“ اسما و صفات کو ہم نے طاق نسیاں پر رکھ دیا، ہم ذات پرست ہیں، اور وہ حقیقت مجرد ہے۔

بحر ہزج سالم میں جوابش را نقابش را کی زمین میں اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے، بیدل نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں، چاند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بتدبیر دگر زان جلوہ نواں کام دل بردن
غبار من مگر از پیش بردار و نقابش را
خرامش مصرع شوخ رمیدن درمیاں دارد
نخواہم رفت اگر از خود کہ می گوید جوابش را
ندارد نازیلی شیوہ بے پردہ گردیدن
مگر مجنوں ز جیب خود در و طرف نقابش را
دراں وادی کہ از خود رفتہ پری زند بیدل
شرع عرض خرام سنگ می داند شتابش را

بیل بنالہ صرف چمن را مفسر است
یارب زبان نگہت گل ترجمان کیست

مقام بیدل

نالہ بلبیل اور بوئے گل دونوں پریشان ہیں، ”حرفِ چمن“ کی
 شرح تو نالہ بلبیل ہے مگر بوئے گل کس کی ترجمانی کر رہی ہے حسن و عشق
 کس کی نمایندگی کر رہے ہیں۔

شیرازہ گل تھا بکھرا ہوا یہ ربط عبارت نگہت تھی
 یہ مصرع بہارِ ہستی کا موزوں نہ تھا، انشا ہونہ سکا
 کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں۔
 انداز وہ طرز بیدل کا اشعار میں پیدا ہونہ سکا

تمام شد

حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

سچائی، کسی قوم یا زمانے کی مخصوص ملکیت نہیں اور جدید دور میں جب ہم اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تو حکماء، فلاسفہ اور مصلحین کی کاوشوں کا مطالعہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں اسلام سے قبل کے کچھ حکماء اور مصلحین کا تقابلی مطالعہ اسی نقطہ نگاہ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات 400 - قیمت 6 روپے



سرگزشت غزالی

امام غزالی کی "المعتمد" کا اردو ترجمہ

مترجمہ محمد حنیف ندوی

امام غزالی نے اس میں اپنے فکری و نظری انقلاب کی نہایت دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انہوں نے جہ و عبا اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر کلیم و فقر کی روش اختیار کی ہے اور اپنے لیے تصوف کو بطور آخری نصب العین کے اختیار کیا ہے۔ فاضل مترجم نے اپنے مبسوط مقدمہ میں امام غزالی کی عظمت و اہمیت کو نکھار کر فکر و بصر کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

صفحات 200 - قیمت 3 روپے

ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

1479

